رشید حسن خاں

کچھ یادیں کچھ جائزے

مرتبین

ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف

جاوید رحمانی

رشید حسن خاں

کچھ یادیں کچھ جائزے

مرتبین

جاوید رحمانی

ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف

ناشر:

مکتبہ الحرا، محلّہ رحم گنج، دربھنگہ

© مرتبین:

○ جاوید رحمانی

401/2-AB, Budh Vihar, New Delhi-110067

09210293686

○ ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف

Raham Ganj, Darbhanga (Bihar)

09431253220

اشاعت	:	۲۰۰۸
قیمت	:	۲۲۵؍روپے
کمپوزنگ	:	نعمت کمپوزنگ ہاؤس، نئی دہلی
طباعت	:	ایچ ایس پریس، دریا گنج، نئی دہلی

RASHEED HASAN KHAN

Kuch Yaden, Kuch Jaeze

Jawaid Rahmani

Dr. Mohd. Aftab Ashraf

2007

Price : 225/-

ملنے کے پتے

○ مکتبہ الخیال، اسٹوڈنٹ پی سی او، قلعہ گھاٹ چوک، دربھنگہ-۴

○ مکتبہ الحرا، محلہ رحم گنج، دربھنگہ-۴

○ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴

○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

رشید حسن خاں

کچھ یادیں کچھ جائزے

انتساب

پروفیسر حنیف نقوی اور ڈاکٹر خلیق انجم
کے نام

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

اور
پروفیسر شمیم حنفی
کے نام
جن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

فہرست

ooo

مقدمہ

رشید حسن خاں کی تاریخِ پیدائش ۱۰رجنوری ۱۹۳۰ء بتائی جاتی ہے[۱] اور تعلیمی اسناد کے مطابق ۱۰رجنوری ۱۹۳۰ء ہی ہے لیکن رشید حسن خاں کا اپنا بیان ہے کہ ''صحیح سالِ ولادت ۱۹۲۵ء ہے، دسمبر کا مہینا تھا، تاریخ کا علم نہیں''۔[۲] ان کے والد کا نام امیر حسن خاں تھا جو پولیس کی ملازمت میں تھے۔ تحریک عدمِ تعاون کے زمانے میں ''مولویوں کے بہکانے میں آکر نوکری چھوڑنے پر تیار ہوگئے'' لیکن جب دفتر کے سپرنٹنڈنٹ نے بہت سمجھایا تو استعفیٰ نہیں دیا اور قبل از وقت رٹائرمنٹ لے لی۔ ان کے مزاج میں سختی بہت تھی، بقول رشید حسن خاں ''دل کے بہت صاف اور سخی تھے مگر نرمی کا اظہار بہت کم ہوتا تھا...... وہ کٹر دیوبند کے مخالف تھے''۔[۳]

اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ رفیع الدین ہاشمی نے لکھا ہے، وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> ''جب رشید حسن خاں نے قرآن پاک ختم کیا تو ان کے استاد نے اپنا باترجمہ ذاتی نسخہ بطورِ انعام انھیں دیا۔ یہ مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ

۱۔ اطہر فاروقی: رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ 'رشید حسن خاں: حیات اور ادبی خدمات' جولائی ۲۰۰۲ء دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ص ۹۔

۲۔ رفیع الدین ہاشمی: رشید حسن خاں تحقیق وتنقید کا مردِ میداں' ہماری زبان (رشید حسن خاں نمبر) یکم تا ۲۸رستمبر ۲۰۰۶ء دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ص ۳۶۔

۳۔ ایضاً

قرآن تھا۔ خوشی خوشی گھر آ کر بتایا کہ مولوی صاحب نے یہ قرآن شریف انعام میں دیا ہے۔ امیر حسن خاں نے جو کھول کر دیکھا تو بقول رشید حسن خاں ''چہرے کا رنگ بدل گیا، بلکہ بگڑ گیا۔ انتہائے غضب میں کہنے لگے کہ اس وہابڑے کا ترجمہ میرے گھر میں بھیجا گیا ہے' مگر کیا کرتے، قرآن شریف کی بے ادبی تو کر نہیں سکتے تھے وہ کچھ دیر بل کھاتے اور بڑبڑاتے رہے، پھر والدہ کو آواز دی: قینچی لاؤ۔ وہ لے آئیں۔ میری آنکھوں کے سامنے سارے حاشیے کاٹ کر چولہے میں جلا دیے اور اس پر بل کھاتے رہے کہ ترجمہ تو باقی رہ گیا، اس میں کچھ نہیں کر سکتے تھے'' [۱]

رشید حسن خاں کے والد چوں کہ انگریزی تعلیم کو برا سمجھتے تھے اس لیے رشید صاحب کو عربی مدرسہ بحرالعلوم میں داخل کرا دیا جہاں وہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۹ء زیرِ تعلیم رہے مگر درسِ نظامی کی تکمیل نہ کر سکے۔ گھر کے حالات اچھے نہیں تھے اس لیے ۱۹۳۹ء میں شاہجہاںپور کی آرڈیننس کلورنگ فیکٹری میں معمولی سی ملازمت کر لی۔ ۱۹۴۶ء میں اس فیکٹری سے نکالے گئے۔ تین چار سال اِدھر اُدھر کی چھوٹی چھوٹی ملازمتوں میں گزرے مثلاً ایک چکّی پر منشی رہے، پھر ایک زمین دار کے کارندے کی حیثیت سے کام کیا اور راشن کی ایک دکان پر منشی بھی رہے۔ اسی دوران 'مولوی' اور 'دبیر کامل' کے امتحانات پاس کیے اور ۱۹۴۹ء میں مدرسہ فیضِ عام میں مدرس ہو گئے۔ [۲]

رشید حسن خاں کو ''چوں کہ داڑھی نہیں تھی اور دوسری شعائر کے بھی پوری طرح پابند نہیں تھے، یوں عربی مدرسے کے طلبہ نے ان سے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد رشید صاحب کو چھوٹے چھوٹے بچّوں کو پڑھانے کے لیے دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔ اسی زمانے میں اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں فارسی، عربی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی اور ان کو وہاں ملازمت مل گئی'' [۳]

۱۔ رفیع الدین ہاشمی: رشید حسن خاں تحقیق و تنقید کا مردِ میداں' ہماری زبان (رشید حسن خاں نمبر) یکم تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۶ء دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ص ۳۶۔

۲۔ ایضاً

۳۔ اطہر فاروقی: رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ 'رشید حسن خاں: حیات اور ادبی خدمات' جولائی ۲۰۰۲ء دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ص ۱۰۔

۱۹۵۹ء میں رشید حسن خاں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے۔ یہاں ان کا تقرر ڈاکٹر قمر رئیس کی سفارش پر ہوا، جس کی تفصیل قمر رئیس کے مضمون 'رشید حسن خاں۔ رفیق اور دوست' میں ملاحظہ فرمائیں جو اس کتاب میں شامل ہے۔ رشید حسن خاں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ۱۹۵۹ء میں وابستہ ہوئے اور یہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۹۰ء میں شاہجہانپور واپس لوٹ گئے۔ رفعت سروش کا یہ بیان کہ ''ابتدا میں وہ دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں ملازم ہوئے'' صریحاً غلط ہے۔ تعجب ہے کہ اس کو رفیع الدین ہاشمی نے بھی اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔

رشید حسن خاں کے ابتدائی مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا بھی ہے:

> ''میرے لکھنے کا آغاز شاعری کی تنقید سے ہوا تھا...... مجھے اپنا ایک پرانا مضمون یاد آتا ہے جو غالباً ۱۹۵۰ء میں 'نگار' میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا 'شبلی کی فارسی شاعری'۔ اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں ایک مضمون احمد ندیم قاسمی کی قطعات نگاری پر میں نے لکھا تھا''۔[۱]

'شبلی کا فارسی تغزل' مئی ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ نیر مسعود نے اس مضمون کے بارے میں لکھا ہے:

> ''یہ اٹھان اچھی نہیں تھی۔ شعر میں تیز شکر، مسحور کن ربودگی، چڑھتا ہوا نشہ، بڑھتا ہوا جوش و ولولہ، بھرپور سرور اور سیال ارتعاش وغیرہ موہوم اوصاف تلاش کرنا 'سوز' کے ساتھ 'برشتگی' اور 'گداز' کے ساتھ 'گداختگی' کا استعمال ضروری سمجھنا، انشائیہ نگاری کے سوا کچھ نہیں تھا''۔[۲]

رشید حسن خاں تحقیق کے مردِ میداں تھے اور تدوین کے میدان میں تو دور دور تک کوئی ان کا ہمسر نظر نہیں آتا۔ یہ واقعہ ہے کہ تدوین کے جیسے معیاری نمونے رشید حسن خاں

۱۔ ممتاز احمد خاں: اردو تحقیق اور املا کے مسائل سے متعلق رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو، 'ہماری زبان' (رشید حسن خاں نمبر) یکم تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۶ء دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ص ۲۰۔

۲۔ نیر مسعود: رشید حسن خاں کی تنقیدی تحریریں 'رشید حسن خاں حیات اور ادبی کارنامے' ۲۰۰۲ء دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ص ص ۹۲، ۹۳۔

نے پیش کیے ہیں اردو میں کسی اور نے نہیں۔ رشید حسن خاں بہ حیثیت تنقید نگار بھی جانے جاتے ہیں حالاں کہ ان کی تنقید کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں، جس کا اظہار میں اپنے مضمون 'رشید حسن خاں اور اردو تنقید' میں کرچکا ہوں وہ مضمون اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ وہ اصل میں تحقیق اور تدوین کے مردِ میداں تھے۔ ہمارے محققوں کے اس کمیاب قبیلے کے وہ ایک فرد تھے جس کے پہلے نمائندے محمود شیرانی اور دوسرے قاضی عبدالودود تھے۔ رشید حسن خاں نے ہی محمود شیرانی کو اردو تحقیق کا معلمِ اول اور قاضی عبدالودود کو معلمِ ثانی لکھا بھی ہے۔ میری نظر میں ان بزرگوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مقبول عام تصور کو بھی عقیدوں کی طرح قبول نہیں کیا اور اسے تحقیق کی خراد پر چڑھایا اور جو نتیجہ نکلا اسے بے کم و کاست بیان کردیا۔ وہ سخنہاے گفتنی کو خوف فساد خلق کے تابع نہیں سمجھتے تھے۔ یہ جرأت بہت کمیاب ہے۔ اسی کی کوکھ سے حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں نے جنم لیا، ہمارا ادبی معاشرہ اس حد تک منافق اور جاہ طلب ہے کہ وہ جرأتِ رندانہ کی اہمیت کو یا تو سمجھتا نہیں یا دانستہ اس پر خاک ڈالتا رہا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے بعض بڑے محققین نے تحقیق کو مثبت اور منفی کے خانوں میں بانٹنا چاہا۔ اور یہ چلن اب بھی عام ہے۔ حالاں کہ عابد رضا بیدار نے اپنے مضمون 'دو ہم آہنگ محقق' میں اس اعتراض کا بہت اچھا جواب دے دیا تھا جس کا اعادہ تحصیل حاصل ہوگا۔ اسی مضمون سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس سے ہمارے ادبی معاشرے کی اس 'ذہنیت' پر روشنی پڑتی ہے جس نے اپنی ریاکاری پر ان اصطلاحوں کا پردہ ڈال رکھا ہے:

> "محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود جیسے قدآور محققوں کے باوجود، اردو میں تحقیق کا معیار بالعموم پست کیوں ہے، اور کیا یہ معیار بلند ہونے کے کچھ امکانات ہیں، یہ سوال اٹھتا رہا ہے۔ اور کچھ مدت قبل جب سہیل عظیم آبادی نے ایک انٹرویو میں قاضی صاحب سے کچھ اس قسم کا سوال کیا تھا تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ مختلف شعبہ ہاے زندگی میں ہمارا اخلاقی معیار بلند ہوگا، تو تحقیق کا معیار بھی بلند ہوجائے گا۔ بات صاف ہے، ادبی تحقیق کی اخلاقیات اور بنیادی اخلاقیات میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ تو جس سماج میں بنیادی اخلاقیات میں پستی موجود ہو، جس سماج میں منافقت، ریاکاری اور بزدلی کو بلاتردد اپنالیا جاتا ہو،

جہاں ضمیر کی آواز کے بجائے ہمیشہ طاقت، شہرت اور سستی ہر دلعزیزی کی آواز پر آواز دینے والوں کا جمِ غفیر ہو، جہاں کوئی قدر آخری قدر نہ رہ گئی ہو اور ہر قلم، ہر زبان کی قیمت لگ سکتی ہو، جہاں بے ضمیری کامیابی کی تنہا سیڑھی بن چکی ہو، اور خوشامد محنت سے بچنے کا آسان ترین وسیلہ —— وہاں تحقیق، جو کردار کا بلند ترین نقطہ ہے، حق یا سچ کی تلاش، اور سچ مل جائے تو اس کا بے روک اظہار، اس سماج میں یہ توقع ایسی خوش فہمی ہے جس کی سرحدیں معصومیت سے ملنے لگتی ہیں''۔[۱]

اس تلخ حقیقت کے باوجود تحقیق زندہ ہے اور پوری آب و تاب کے ساتھ سچ کی تلاش اور اس کے اظہار میں مصروف ہے۔ یہ سچ ہے کہ تحقیق کے نام پر ہماری درسگاہوں میں جو کچھ جمع کیا جا رہا ہے اس کی بے وقعتی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، لیکن معدودے چند لوگ اب بھی اعلا تحقیقی نمونے پیش کر رہے ہیں اور اعلا ادب خواہ تنقیدی ہو، تحقیقی یا تخلیقی، بہر حال کمیاب ہوتا ہے۔ عابد رضا بیدار کو قاضی عبدالودود کے بعد اردو تحقیق کے میدان میں سناٹے کا احساس ہوا تھا لیکن قاضی عبدالودود کے بعد رشید حسن خاں، حنیف نقوی، نذیر احمد اور مشفق خواجہ نے اپنی گراں قدر نگارشات سے اردو تحقیق کے وقار کو قائم رکھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمام ناگفتہ بہ صورتِ حال کے باوجود آئندہ بھی کوئی قیس اور کوئی فرہاد ضرور اٹھے گا۔

رشید حسن خاں کو اردو املا سے خاص شغف تھا۔ ہمارے زمانے میں جن لوگوں نے املا کے مسائل پر مسلسل لکھا ہے ان میں رشید حسن خاں کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی کتابیں 'اردو املا'، 'زبان اور قواعد' اور 'اردو کیسے لکھیں' وغیرہ اردو املا کی معیار بندی میں بے حد اہم رول ادا کرتی رہی ہیں۔ اردو املا کے مسئلے سے اس دلچسپی کا سبب ایک عام واقعہ بنا جو رشید حسن خاں کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

''۵۳-۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ میں درجہ میں کھڑا ہوا پڑھا رہا تھا۔ اس زمانے میں، میں ایک ہائر سکنڈری اسکول میں استاد تھا۔ ایک بچے کی کاپی میرے پاس اصلاح کے لیے آئی، میں نے اس میں دو لفظوں پر خط

---

[۱] عابد رضا بیدار، 'دو ہم آہنگ محقق': غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر) جنوری ۱۹۸۷ء دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ص ۱۱۲، ۱۱۳۔

کھینچ دیا اور دو غلطیوں کے دو نمبر کاٹ لیے۔ جب وہ لڑکا کاپی لے کر واپس چلا گیا تو پھر تھوڑی دیر میں آیا میرے پاس اور اس نے کہا: 'سر آپ نے میرا نمبر کیوں کاٹ لیا' میں نے کہا کہ تم نے دو لفظوں کا املا غلط لکھا ہے۔ 'بھروسا' کے آخر میں تم نے 'ہ' (بھروسہ) لکھا ہے، اس کے آخر میں الف ہونا چاہیے۔ اور 'گزرنا' تم نے 'ذ' (گذرنا) سے لکھا ہے، اس میں 'ز' ہونا چاہیے۔ وہ نہایت خموشی کے ساتھ اپنی ڈیسک پر گیا اور وہاں سے اپنی کتاب اٹھالایا جو نصاب میں شامل تھی۔ اس نے کہا 'دیکھیے سر! اس میں یہ الفاظ اسی طرح لکھے ہوئے ہیں جس طرح میں نے لکھے ہیں'۔ مجھے اس وقت جو شرمندگی ہوئی اس کا نقش آج تک میرے دل پر ہے ...... تب سے املا کا تصور میرے ذہن میں آیا اور مجھے خیال آیا کہ اس میں معیار بندی ہونا چاہیے''۔[۱]

اور اردو املا کی معیار بندی میں رشید حسن خاں عمر بھر مصروف رہے، پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ۔ اور اس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ ''خاں صاحب جس اردو املا کے وکیل ہیں اس کی رو سے ہمارا املا درست نہیں''۔[۲]

اردو املا کے مسائل پر رشید حسن خاں سے پہلے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، نیاز فتح پوری، مولوی عبدالحق اور مولانا احسن مارہروی وغیرہ نے لکھا اور ان کے زمانے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر ابو محمد سحر نے لکھا۔ لیکن ان میں رشید حسن خاں کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اس مسئلے پر بالکل غیر جذباتی اور معروضی انداز میں اور مسلسل لکھا۔

رشید حسن خاں کے ابتدائی مضامین میں اس مضمون کو خاص شہرت حاصل ہوئی جو فیضؔ کی شاعری پر تھا۔ اس میں فیضؔ کی شاعری پر بہت سے اعتراضات ہیں اور میں نے اپنے ایک مضمون میں دکھایا ہے کہ بیشتر اعتراضات غلط ہیں۔ اس مضمون کا مطالعہ فاروقی صاحب کے مضمون 'غلطی عیب نہیں' کو ذہن میں رکھ کر کیا جائے تو بہت دلچسپ نتائج برآمد ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ رشید حسن خاں بقول شمیم حنفی اُن محققوں میں نہیں تھے جو

---

۱ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو، 'ہماری زبان' (رشید حسن خاں نمبر) یکم تا ۲۸ رستمبر ۲۰۰۶ء دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ص ۲۰۔

۲ شمیم حنفی، خاں صاحب: رشید حسن خاں۔

''کتبے تو صحیح پڑھ لیتے تھے، شعر غلط پڑھتے تھے'' لیکن شعر کی تنقید کا حق ادا کرنا بھی رشید حسن خاں کے بس کی بات نہیں۔ محمد علی جوہر کی شاعری پر شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور رشید حسن خاں تینوں نے لکھا ہے۔ ان تینوں مضامین کا تجزیہ کریں تو صاف پتا چلتا ہے کہ شعر کی تنقید کا میدان رشید حسن خاں کا نہیں۔

رشید حسن خاں کا دوسرا مشہور ترین مضمون وہ تھا جو علی گڑھ تاریخ ادب اردو پر لکھا گیا۔ اس مضمون کے بارے میں انتظار حسین نے لکھا ہے:

> ''علی گڑھ یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کا منصوبہ بنا۔ جب پہلی جلد شائع ہوئی تو رشید حسن خاں نے اس پر تبصرہ کرڈالا اور اپنے زورِ تحقیق سے اس میں اتنی غلطیاں دریافت کیں کہ وہ پورا کام ہی اہلِ علم کی نظروں سے گر گیا۔ یونیورسٹی نے وہ جلد واپس لے لی۔ بس پھر وہ منصوبہ ہی لپیٹ دیا گیا''۔

عام طور پر ایسا ہی سمجھا جاتا ہے کہ یونیورسٹی نے وہ جلد رشید حسن خاں کے مضمون کی وجہ سے واپس لے لی۔ جب کہ وہ منصوبہ یونیورسٹی کی سیاست کی نذر ہوا اور اس کے لیے بہانہ رشید حسن خاں کا تبصرہ بنا۔ اس زمانے میں علیم صاحب یونیورسٹی کے پبلی کیشنز ڈائرکٹر تھے جو آل احمد سرور سے ناخوش تھے اور اسی لیے رشید حسن خاں کے مضمون کی بنیاد پر وہ منصوبہ ہی لپیٹ دیا گیا۔ لیکن رشید صاحب کے مداحوں نے اور خود رشید صاحب نے بھی اکثر یہ تاثر دیا کہ یہ معرکہ ان کے مضمون نے سر کیا۔ اس سلسلے کی ایک اور بے حد اہم حقیقت پردۂ خفا میں ہے، وہ یہ کہ رشید صاحب نے اس تاریخ پر اتنا سخت مضمون اس لیے نہیں لکھا کہ وہ تاریخ واقعی اتنی ہی ناکارہ تھی بلکہ اس لیے کہ وہ اس سلسلے میں اپنی تقرری کے خواہاں تھے جب کہ آل احمد سرور نے نذیر احمد کو لکھنؤ سے بلایا اور یہ ذمہ داری ان کو سونپی۔ لیکن وہ اس کام کو سنبھالتے اس سے پہلے ان کا تقرر شعبۂ فارسی میں ہوگیا۔ اور پھر یہ ذمہ داری مجنوں گورکھپوری کو سونپی گئی۔ گویا کہ رشید حسن خاں کا وہ مضمون ایک طرح کی انتقامی کارروائی ہے خالص علمی فریضہ نہیں۔ اور بالعموم ان دونوں حقیقتوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں کی شخصیت اتنی معمولی نہیں کہ ان معمولی نقائص کی تاب نہ لا سکے، مگر اردو کا عام ادبی معاشرہ کچھ ایسا ہے کہ اپنے ممدوح کے نقائص پر پردہ ڈالنا ضروری سمجھتا ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ تحقیق اور تنقید کی دنیا میں 'معروضیت' کو کچھ ایسی اہمیت دے دی گئی ہے کہ ہم محقق اور

نقاد کو ہر قیمت پر معروضی ثابت کرنا چاہتے ہیں، چناں چہ ان عیوب پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں معروضیت کی حقیقت ایک فریب سے زیادہ نہیں اور تنقید اور تحقیق میں معروضیت کا عدم و وجود برابر ہے۔ تنقید دراصل اپنے تعصّبات اور ذہنی تحفظات کے لیے علمی جواز فراہم کرنے کا عمل ہے۔ اسی طرح محقق بھی تعصّبات اور ذہنی تحفظات سے یک قلم پاک نہیں ہوتا۔ البتہ اس کی کامیابی اور ناکامی کا مدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے تعصّبات و ذہنی تحفظات کا جواز کس حد تک فراہم کر پاتا ہے۔ اس منصوبے کی تعمیر میں ہی ایک صورت خرابی کی مضمر تھی۔ گیان چند جین نے لکھا بھی ہے:

''رشید (احمد صدیقی) صاحب کی صدارت شعبہ ہی کے زمانے میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے تاریخ ادب اردو کا منصوبہ ملا۔ رشید صاحب سبک دوش ہوکر یہ میراث سرور صاحب کو تفویض کر گئے۔ رشید صاحب نے مجنوں گورکھپوری کو اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنا کر بلالیا۔ سبحان اللہ کیا انتخاب تھا، علی گڑھ کے شعبۂ اردو کی بزرگی مسلّم، لیکن کہاں تاریخِ ادب اردو اور کہاں رشید صاحب، سرور صاحب اور مجنوں صاحب یہ لوگ ادیب ہیں، مورخ ادب نہیں۔ ثمرہ یہ ہوا کہ اس تاریخ کا ناقص اور پر از اغلاط رہ جانا سرور صاحب کے دامن پر سب سے بڑا دھبّہ بن کے رہ گیا''۔[۱]

نورالحسن نقوی نے اپنے ایک مضمون میں اصل صورتِ حال پر تبصرہ کیا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''سرور صاحب کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت نے بہت لوگوں کو خفا کیا۔ اس کا زیادہ غم نہیں۔ زیادہ غم یہ ہے کہ اس کے سبب کئی اہم کام سلیقے کے ساتھ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکے۔ ان میں سے ایک کام علی گڑھ تاریخ ادب اردو کا ہے ...... مستند علما و محققین سے اس کے لیے مضامین لکھوائے گئے تھے۔ ناممکن نہیں کہ ان میں بھی بعض غلطیاں راہ پا گئی ہوں مگر اس کی زیادہ ذمہ داری مضمون نگاروں پر ہوتی لیکن ستم یہ ہوا کہ طباعت کی بے شمار غلطیاں رہ گئیں۔ کئی جگہ اشعار کو نثر کی طرح لکھ دیا گیا۔ تاریخِ ادب کی

---

[۱] گیان چند جین، سرور صاحب میری نظر میں: پرکھ اور پہچان ۱۹۹۰ء دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص ۲۳۸۔

تیاری میں سرور صاحب کی مدد کے لیے ڈاکٹر نذیر احمد کا انتخاب ہوا تھا۔ وہ اس کام کو بڑی ذمہ داری سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے مگر ان کا تقرر شعبۂ فارسی میں ہوگیا اور مجنوں گورکھپوری اس کام پر مامور ہوئے۔ انھوں نے پروف ریڈنگ کا کام اپنے شاگردوں کو سونپ دیا۔ وہ بھی زحمت کیوں اٹھاتے۔ جیسے صفحات ملے ویسے ہی لوٹا دیے۔ مجنوں صاحب ان صفحات کو انگلی لگانے کے گنہگار نہیں۔ کاش صرف ایک صفحہ مجنوں صاحب یا سرور صاحب کی نظر سے گزر جاتا تاکہ طباعت سے پہلے اصل صورتِ حال واضح ہو جاتی، مگر ہونی کو کون ٹال سکا ہے۔ شعبۂ اردو کے دامن پر ایک داغ لگنا تھا لگ گیا۔ آخری ذمہ داری تو سربراہ کی ہی ہوتی ہے ...... حیرت اس بات پر ہے کہ مجنوں صاحب کو کبھی اس غفلت پر پشیمان نہ دیکھا''[1]

میرا خیال یہ ہے کہ وہ تاریخ بصورتِ موجودہ بھی ایسی بری نہ تھی کہ اس پورے منصوبے پر خاک ڈال دی جائے لیکن علیم صاحب چوں کہ آل احمد سرور سے ناخوش تھے اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی سرور صاحب سے خوش نہ تھے اور یونیورسٹی کی سیاست میں کسی وائس چانسلر کا کسی پروفیسر سے ناخوش ہونا معمولی حادثہ نہیں ہوتا۔ انھوں نے رشید حسن خاں کے مضمون کو غنیمت جانا اور فوراً نہ صرف یہ کہ ساری کاپیاں بازار سے اٹھوالیں بلکہ اس منصوبے کو بھی رد کر دیا۔ خاں صاحب کے اسی طرح کے دو مضامین اور ہیں جو بہت مشہور ہوئے، ایک 'دیوانِ غالب' صدی اڈیشن (مرتبہ مالک رام) پر اور دوسرا 'اردو شاعری کا انتخاب' (مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور) پر۔

خاں صاحب نے انتخاب ناسخ پر جو مقدمہ لکھا وہ معرکے کا تھا۔ خاں صاحب نے ۱۲۰ صفحے کے اس مقدمے کے بارے میں ایک انٹرویو میں کہا بھی ہے:

''میرا ایک کام جو مجھے بہت زیادہ عزیز ہے وہ ہے انتخابِ ناسخ کا مقدمہ''۔[2]

---

[1] نورالحسن نقوی، روشنی کا سفر: آل احمد سرور شخصیت اور فن (مرتبہ امتیاز احمد) ۱۹۹۷ء علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص ۳۷۔

[2] ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو: 'ہماری زبان' (رشید حسن خاں نمبر) یکم تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۶ء دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ص ۲۰۔

اس مقدمے میں خاں صاحب نے پہلی بار یہ ثابت کیا کہ متروکات کی جو فہرست ناسخ سے منسوب ہے وہ ناسخ کی نہیں، ان کے شاگرد رشک کی ہے۔ گویا کہ اصلاحِ زبان کا کارنامہ ناسخ نے نہیں رشک نے انجام دیا اور ناسخ کی وفات کے پندرہ بیس سال بعد ناسخ کے کلیات میں رشک نے ان مقامات پر تحریف بھی کی، جہاں ان الفاظ کا استعمال تھا جن کو رشک نے متروک ٹھہرایا۔ اس مقدمے سے کھلا کہ ناسخ اپنے شاگرد کے لکھے پر ناحق پکڑے گئے تھے۔ اور یہ بھی کھلا کہ ہماری ادبی تاریخیں کس قدر احتیاط سے لکھی گئی ہیں!

خاں صاحب کے اس نوع کے مضامین میں کچھ اصول تحقیق کے بارے میں، غیر معتبر حوالے، مولوی سیّد احمد دہلوی اور ہندوستانی فارسی میں تلفظ اور املا کے بعض مسائل وغیرہ بے حد اہم ہیں۔ اور ان کا مطالعہ ہر اس شخص کو کرنا چاہیے جو تحقیق یا تدوین کا بارِ گراں اٹھانا چاہتا ہے۔

رشید حسن خاں شہرت کی بلندی پر تو اپنے ابتدائی مضامین سے ہی پہنچ چکے تھے، لیکن انھوں نے اس شہرت کو کافی نہیں سمجھا اور ان کا امتیاز یہ ہے کہ اپنی اس قابلِ رشک شہرت کے بعد بھی اسی انہماک سے کام کیا۔ اور اردو کے کلاسیکی متون کی غیر معمولی احتیاط کے ساتھ تدوین کا مثالی نمونہ پیش کیا۔ رشید حسن خاں نے ادبی دنگل میں زور آزمائی کے لیے فرضی ناموں کا بھی سہارا لیا، مثلاً وہ مالک رام کو پسند نہیں کرتے تھے اور ایک پوری کتاب مالک رام کے خلاف فرضی نام سے شائع کردی، لیکن بہت جلد پتا چل گیا کہ 'اردو تحقیق اور مالک رام' کے مرتّب اعظمی صاحب کے پردے میں رشید حسن خاں ہیں۔ لیکن رشید حسن خاں کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ان معرکہ آرائیوں کو ہی سب کچھ نہیں سمجھا بلکہ ان کے علاوہ تدوین کے کئی مثالی نمونے بھی پیش کیے۔ یہ متون غلطیوں سے یک قلم پاک نہیں ہیں لیکن اردو میں تدوین کے بہر حال سب سے اچھے نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے کا ان کا پہلا کام جو منظرِ عام پر آیا وہ 'فسانۂ عجائب' ہے۔ 'فسانۂ عجائب' اردو نثر کی ایک بے حد اہم اور بے حد مشکل کتاب ہے۔ نیرّ مسعود نے لکھا بھی ہے:

> ''یہ خبر خاصی دلچسپی کے ساتھ سنی گئی تھی کہ اب رشید حسن خاں خود ایک کلاسیکی متن اور وہ بھی 'فسانۂ عجائب' سا خطرناک متن مرتّب کر رہے ہیں۔ یہ تجسس پیدا ہونا فطری تھا کہ رشید حسن خاں متن کی تحقیقی تدوین کے جس معیار کا دوسروں سے مطالبہ کرتے ہیں اسے خود کہاں تک قائم

رکھ پاتے ہیں۔ اس ایڈیشن کی اشاعت کے بعد یہ بات بلاتامل کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے اپنی تنقیدی اور احتسابی تحریروں میں تدوین متن کے جس مثالی نمونے کا تصور پیش کیا تھا، عملاً اس سے بھی کچھ بہتر نمونہ پیش کردیا ہے''۔

اس متن کو رشید حسن خاں نے اعراب اور رموزِ اوقاف کے التزام سے پانی کردیا ہے اور اب اس کا مطالعہ نسبتاً آسان معلوم ہوتا ہے۔ اس متن پر جو مقدمے، ضمیمے اور فرہنگ خاں صاحب نے دی ہے ''جن کا مجموعی حجم 'فسانۂ عجائب' کے متن سے زیادہ ہے'' اس کے لیے کتنی محنت کی گئی ہے اس کا اندازہ آسان نہیں۔ اسی لیے نیّر مسعود نے اس کو متن کی ترتیب سے بڑا کارنامہ بتایا ہے۔ اس کتاب پر رشید حسن خاں نے سات ضمیمے اور ایک فرہنگ کا اضافہ کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ضمیمہ بذاتِ خود ایک کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ رشید حسن خاں کی مرتبہ 'فسانۂ عجائب' پر کاظم علی خاں نے نیّر مسعود کا ایک انٹرویو لکھنؤ ٹیلی ویژن کے لیے ریکارڈ کیا تھا، اس انٹرویو کی اہمیت یہ ہے کہ نیّر مسعود بھی 'رجب علی بیگ سرور' پر کام کرچکے ہیں۔ ہم نے اس انٹرویو کو بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ 'فسانۂ عجائب' کا یہ متن بصورتِ موجودہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے، اس میں شبہ نہیں۔

اس کام کو جس سلیقے سے کیا گیا اس کی داد نہ دینا ادبی بدذوقی سے کم نہیں لیکن یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ رشید حسن خاں سے پہلے گیان چند جین نے 'فسانۂ عجائب' کے نسخوں کا ایک بے حد عمدہ جائزہ پیش کیا تھا جو ان کی کتاب 'کھوج' میں شامل بھی ہے۔ رشید حسن خاں کی 'فسانۂ عجائب' کے مطالعے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے گیان چند جین کے اس مضمون سے استفادہ نہیں کیا۔

خاں صاحب نے 'فسانۂ عجائب' کے بعد 'باغ و بہار' کو منتخب کیا اور اسی احتیاط و اعتماد اور بالغ نظری کا ثبوت دیا۔ 'باغ و بہار' مرتبہ رشید حسن خاں کے بارے میں گیان چند جین نے لکھا ہے:

> ''اس میں انھوں نے زور دیا ہے کہ متن کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کیا جائے۔ میرامّن نے دلّی کی بول چال کا روزمرہ لکھا ہے جس میں بارہا نامانوس روپ آگئے ہیں۔ پیشتر کے مرتبین نے انھیں سہوِ کتابت سمجھ کر بدل دیا لیکن رشید حسن خاں نے میرامّن کے ہاتھ کی لکھی

’گنجِ خوبی‘ دیکھی ہے۔ ہندی مینول کے مطبوعہ اوراق، بقیہ حصے پر مشتمل مخطوطہ، گلکرسٹ کا نظامِ اوقاف، ان سب کی مدد سے وہ میر امّن کے سویدائے دل میں اتر گئے ہیں، ہر لفظ اور ہر محاورے کو اسی طرح لکھا ہے جو میر امّن کا منشا رہا ہوگا“۔

خاں صاحب نے یہ انکشاف بھی کیا کہ گلکرسٹ نے میر امّن سے چار درویش کی تالیف کی فرمائش ان کے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہونے سے پہلے کر دی تھی اور میر امّن نے اصلاً اس کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کتاب میں بھی ایک مبسوط مقدمہ ہے پھر ’باغ و بہار‘ کا متن اور پھر تین ضمیمے، اس کے بعد فرہنگ۔

مقدمہ ۱۳۶ صفحات کو محیط ہے، اس میں میر امّن کی محتاط سوانح بھی شامل ہے۔ رشید حسن خاں نے حیاتِ میر امّن کی ان کڑیوں کو جو غیر مستند ہیں، اپنے بیان کے دائرے سے باہر رکھا ہے۔ ’باغ و بہار‘ کا متن پوری احتیاط کے ساتھ تیار کیا گیا ہے۔ پہلے ضمیمے میں تشریحات، اختلافِ نسخ، انتسابِ اشعار، افراد، مقامات اور عمارتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ کام ظاہر ہے آسان نہیں اور اس کا پوری طرح حق رشید حسن خاں ہی ادا کر سکتے تھے۔ دوسرے ضمیمے میں تلفظ اور املا کی بحث کو رکھا گیا ہے، یہ بھی رشید حسن خاں کا خاص میدان ہے اور اسی لیے یہ بحث اتنی جامع ہے کہ اس پر اضافہ مشکل سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ تیسرا ضمیمہ بعنوان ’الفاظ اور طریقِ استعمال‘ ہے۔ اس طرح ’باغ و بہار‘ کا یہ اڈیشن نہ صرف اس متن بلکہ پوری اردو نثر کے مطالعے میں انتہائی اہم اضافہ ہے۔

شعری متون کے کئی انتخابات خاں صاحب ستّر کی دہائی میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے شائع کر چکے تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے لیے ’گلزارِ نسیم‘ کو مدون کیا اور اپنے مخصوص انداز میں شائع کیا۔ اس پر خاں صاحب نے ڈیڑھ سو صفحوں کا مقدمہ لکھا جب کہ مثنوی کا متن ۸۶ صفحوں پر مشتمل ہے، گویا کہ سود اصل سے زیادہ ہے۔ خاں صاحب نے اپنے مقدمے میں اس مثنوی کی ادبی اہمیت، قصے سے وابستہ روایات اور اس کی چھان پھٹک، تمثیلی پیرایۂ اظہار کا جائزہ اور پھر نسیم کی ادبی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ اس میں شرر اور چکبست کے معرکے پر بھی بڑے محتاط انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے جس کی داد کالی داس گپتا رضا نے بھی دی ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اس اڈیشن کے ضمیمہ و تشریحات میں رشید حسن خاں نے (ص ۷ ۲۳

تا ۵۲۰) جس شرح و بسط کے ساتھ زبان اور بیان کے نکات پر بحث کی ہے، اس سے لغات، لفظیات اور صناعت کے بہت سے باریک پہلو ابھرتے ہیں۔ موجودہ دور کہ جب تعلیم کے اعلا مراکز، خاص طور پر یونیورسٹیوں میں لسانی، فنی اور ذوقی تربیت کا رجحان معدوم ہوتا جارہا ہے، رشید حسن خاں کی یہ دیدہ ریزی اردو کے طلبہ (اور ان سے زیادہ اساتذہ) کے لیے ایک مدرسۃ الاصلاح کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں بھی بنیادی متن پر اعراب کی نشان زدگی، تلفظ و املا کی تفصیلات اور فرہنگ پر مبنی ضمیمے (ص ۵۲۱ تا ۶۰۰) کی شمولیت نے اس ایڈیشن کو ایک مکمل، قائم بالذات اور نہایت کارآمد نسخے کی حیثیت دے دی ہے''۔

اسی کے ساتھ بعض بیانات کی پروفیسر شمیم حنفی نے گرفت بھی کی ہے کہ ''ان میں جو مفروضے قائم کیے گئے ہیں ان پر ادب کے جمالیاتی، تہذیبی، عمرانیاتی اور نفسیاتی تناظر میں تفصیلی بحث کے بغیر انھیں کلیوں اور قوانین کی طرح قبول کرلینا نہ توممکن ہے نہ مناسب''۔ شمیم حنفی صاحب کی یہ رائے بالکل درست ہے مگر خاں صاحب ان باتوں پر کان دھرنے کے عادی نہیں ہیں اور غالباً ان کے اسی رویّے کی طرف شمیم حنفی صاحب نے اپنے ایک پرانے مضمون میں اشارہ کیا تھا کہ ''خاں صاحب ان لوگوں میں ہیں جو اپنی غلط کاری پر بھی 'بزن' کہنے سے نہ چوکیں گے''۔

'گلزارِ نسیم' دبستانِ لکھنؤ کی سب سے نمائندہ مثنوی تسلیم کی گئی ہے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد خاں صاحب نے 'مثنویاتِ شوق' کی تدوین کی طرف توجہ کی۔ اسی لیے گیان چند جین نے 'مثنویاتِ شوق' کو خاں صاحب کا چوتھا صحیفہ کہا ہے۔ گیان چند جین اور فضیل جعفری دونوں نے 'مثنویاتِ شوق' مرتّبہ رشید حسن خاں پر اپنے مضمون میں خلیق انجم کے پیش لفظ کے بارے میں لکھا اور درست لکھا ہے۔ اصل میں متنی تنقید کی اصطلاح خلیق انجم کی کمزوری ہے اور رشید حسن خاں کے کارناموں کا پردہ وہ اس پر ڈالنا چاہتے ہیں، یہ رشید حسن خاں بھی سمجھتے رہے ہوں گے مگر مصلحتاً گوارا کرتے رہے۔ رشید حسن خاں انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی تھے مگر اس رکنیت کا حق کبھی ادا نہ کرسکے۔ خلیق انجم کی ہر قسم کی بدعنوانی سے چشم پوشی میں ہی عافیت سمجھی۔ ان میں مالک رام کی طرح اختلاف کی جرأت نہ تھی اسی لیے جب تک مالک رام انجمن کی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے

انجمن اردو کی ایک تحریک کے طور پر کام کرتی رہی لیکن ان کے بعد رشید حسن خاں کی موجودگی کے باوجود انجمن خلیق انجم کی اقربا پروری کا ذریعہ بن کے رہ گئی اور رشید حسن خاں نے کبھی مداخلت نہیں کی۔ ایک نری جاہل خاتون (شمیم جہاں) کو خلیق انجم نے پہلی کیشن انچارج بنایا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ کسی کتاب کا نام تک صحیح طور پر پڑھنا شمیم جہاں کے بس کی بات نہیں، رشید حسن خاں نے خاموشی اختیار کرلی۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ یہ بھی جانتے رہے ہوں گے کہ شمیم جہاں کی حیثیت خلیق انجم کے لیے ایک کھلونے کی ہے۔ یہ کھلونا بیکار ہوگیا تو دوسرا کھلونا بھی خلیق انجم انجمن کے خرچ پر خرید لائے، اور رشید حسن خاں کو تب بھی اپنی ذمہ داری کا احساس نہ ہوا۔ انھیں فکر انجمن ترقی اردو (ہند) کی نہیں تھی فکر تھی تو اپنی رکنیت کے بحال رکھنے کی۔

'مثنویاتِ شوق' پر بھی رشید حسن خاں نے ۱۶۸ صفحوں کا مقدمہ لکھا، جس میں حالاتِ زندگی، مثنویات کی تعداد، زمانۂ تصنیف، منعِ اشاعت، مطبوعہ نسخے، مثنویاتِ شوق کے مآخذ اور زبان و بیان جیسے اہم مسائل سے بحث کی۔ مثنویاتِ شوق کی تعداد سے بحث کرتے ہوئے رشید حسن خاں بتاتے ہیں کہ خنجرِ عشق، سوزِ عشق اور قہرِ عشق کو بھی کچھ مطبعے والوں نے شوق کی مثنویاں بتایا ہے اور لذتِ عشق کا شمار تو کئی ذمہ دار حضرات نے شوق کی مثنویوں میں کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے ثابت کیا کہ شوق کی صرف تین مثنویاں ہیں (۱) فریبِ عشق (۲) بہارِ عشق اور (۳) زہرِ عشق۔ اس مقدمے کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں خاں صاحب نے شوقؔ کی مثنویوں پر پابندی کے مسئلے سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے کی تمام روایتوں کا جائزہ لینے کے بعد خاں صاحب اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

> ''اُس قصے پر مبنی کتاب کا قانون فحاشی کے تحت ممنوع الاشاعت قرار دیا جانا کسی ثبوت کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ ایسی کوئی قابلِ قبول روایت اور ایسا کوئی ثبوت ہمارے سامنے موجود نہیں... میرا خیال یہ ہے کہ ممنوع الاشاعت ہونے کی روایت کی بنیاد بہت کچھ 'شہرت' پر رہی ہے... میں اس پر پھر زور دینا چاہتا ہوں کہ شہرت، واقعیت کی مرادف نہیں۔ شہرت غلط بھی ہوسکتی ہے اور صحیح بھی'' (ص ص ۸۷-۸۵)۔

اس مقدمے کا وہ حصہ جو بعنوان 'تمہید' شاملِ کتاب ہے، 'مثنویاتِ شوق لکھنوی معاشرت کے آئینے میں' کے عنوان سے 'ایوانِ اردو' اپریل ۱۹۹۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس پر

نیّر مسعود نے سخت ردِ عمل کا اظہار کیا اور ایک کھلا خط رشید حسن خاں کے نام (’ایوانِ اردو‘ جولائی ۱۹۹۸ء) لکھا۔ نیّر مسعود کے بیشتر معروضات درست ہیں، اگر چہ ان کے اظہار میں شدید جذباتیت در آئی ہے۔ نیّر مسعود کا خط رشید حسن خاں کو اشاعت سے پہلے حاصل ہو گیا تھا اور انھوں نے نیّر مسعود کو لکھا:

’’دیکھیے بھائی! میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں تھا، ہو بھی نہیں سکتا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے دل کو تکلیف پہنچی۔ مجھے اگر اس کا ذرا بھی احتمال ہوتا تو یہ تحریر ہی وجود میں نہ آتی۔ میں اپنے مخلصین کے دل کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ اب مزید غیر مناسب باتیں ہوں اور بحث بڑھے، یہ کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔ میں نے دہلی [انجمن ترقی اردو (ہند) کو] ابھی خط لکھا ہے۔ میں جون میں وہاں جاؤں گا اور اس حصے کو از سرِ نو لکھوں گا، تاکہ شکایت کا کوئی پہلو نہ رہے اور احتیاط کے تقاضوں کی پاسداری بھی ہو جائے۔ آپ کے خط سے یہ بڑا فائدہ ہوا اور اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ بروقت بات سامنے آگئی اور بآسانی اسے بنایا جا سکتا ہے ...... آپ اپنے احباب سے اس خط کے حوالے سے یہ سب باتیں کہہ سکتے ہیں؛ البتہ یہ خط صرف آپ کے لیے ہے۔ اب آپ اس پر غور کر لیجیے کہ جب اس تحریر کو از سرِ نو لکھا ہی جانا ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ خواہ مخواہ بات بڑھے اور یار لوگ لطف لیں ...... اس بنا پر کیا مناسب نہ ہوگا کہ اب وہ خط نہ چھپے۔ اس کا لہجہ بھی خاصا غیر مناسب ہے‘‘۔[۱]

رشید حسن خاں کے اس خط میں کئی باتیں قابلِ گرفت ہیں، خصوصاً ایک محقق کا یہ کہنا کہ میں اپنے مخلصین کے دل کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا ہوں۔ لیکن ابھی میں اس قصے کو چھوڑتا ہوں۔ نیّر مسعود نے ’ایوانِ اردو‘ کو فوراً خط لکھا کہ خاں صاحب کے خلاف ان کے خط کو شائع نہ کریں مگر بقول مخمور سعیدی:

---

[۱] محررہ ۲؍مئی ۱۹۹۸ء، بنام نیّر مسعود، ص ۲۳۵، اردو ادب، جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء۔

''جب آپ (نیّر مسعود) کے دو خط (تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد) یکے بعد دیگرے اس کی اشاعت روک دینے کے بارے میں موصول ہوئے، اس وقت تک جولائی کا شمارہ چھپ کر تیار ہو چکا تھا اور یہ ممکن نہ تھا کہ آپ کا خط اس میں سے حذف کر دیا جائے'' [1]

نیّر مسعود نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا، یہ الگ بات کہ اس سے رشید حسن خاں کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا مگر رشید حسن خاں نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور 'مثنویاتِ شوق' میں وہ حصہ بعینہٖ شائع ہو گیا۔ حالاں کہ اس میں لکھنوی معاشرت کا انتہائی غیر ذمہ دارانہ اور سطحی تجزیہ کیا گیا تھا۔ کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

۱- ''یہیں [بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء] سے عیش طلبی کی اس روایت کا آغاز ہوتا ہے جس نے بعد کے حکمرانوں کے زمانے میں خاص کر نصیرالدین حیدر کے زمانے میں بہت فروغ پایا اور مزید ترقی پا کر واجد علی شاہ کے عہد میں کسی کو کسی اور کام کا رکھا ہی نہیں تھا''۔ (مثنویاتِ شوق، مرتبہ رشید حسن خاں، ص ص ۱۳، ۱۴)

۲- ''حیدری بیگم نے واجد علی شاہ سے جب یہ کہا تھا:

کہا: حمل ثابت علی خاں کا ہے — خطا کی، خطا کام انساں کا ہے
نہیں میں فقط ایک تقصیر وار — کہ اس دام میں اور بھی ہیں شکار
[تذکرۂ شوق، ص ۳۰۶]

تو ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا تھا جس سے بہت سے لوگ باخبر تھے۔ اسی طرح جب نوّاب مرزا شوق 'فریبِ عشق' میں یہ کہتے ہیں:

رنڈیاں گو کہ ساری آفت ہیں — بیگمیں اور بھی قیامت ہیں
کھلتا ہر اک پر ان کا حال نہیں — کون ان میں ہے جو چھنال نہیں
ڈھونڈتی پھرتی خود حسیں ہیں یہ — ہم سے دونی تماش بیں ہیں یہ

تو معاشرے کی ایک ایسی تلخ حقیقت کو بیان کیا تھا جس سے لوگ بے خبر نہیں تھے، لیکن اس کو بیان کرنے کی جرأت اور اعتراض کی گنجائشیں گویا ختم ہو چکی تھیں [آج کے طالب علم کے لیے یہ وضاحت ضروری ہے کہ شوق کے پہلے شعر میں 'رنڈیاں'

---

[1] ایوانِ اردو، اگست ۱۹۹۸ء ص ۵۷۔

عامِ خواتین کے معنی میں آیا ہے۔ اس زمانے میں یہ لفظ اس معنی میں بہ طورِ عموم مستعمل تھا]۔''
(مثنویاتِ شوق، مرتّبہ رشید حسن خاں ص ۰۳)

اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں 'مثنویاتِ شوق' میں موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنوی معاشرت کا تصور رشید حسن خاں کے ذہن میں بڑا رومانی قسم کا تھا۔ اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں دوسروں پر تو اعتراض کرتے نہیں تھکتے تھے لیکن اپنے اوپر ہونے والے اعتراضات کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے وہ نیّر مسعود کو تو مسلسل (کم از کم تین خطوں میں) یہ یقین دلاتے رہے کہ اس حصے کو از سرِ نو لکھوں گا۔ چناں چہ آپ اپنے خط کی اشاعت رکوادیں۔ اور دوسری طرف اس کتاب کو اسی شکل میں پریس جانے دیا۔ رشید حسن خاں کا جو خط میں نے نقل کیا اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے:

''میں اپنے مخلصین کے دل کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا ہوں''۔

جب کہ رشید حسن خاں اپنی تحریروں میں اس قبیل کی احتیاط پسندی کو مصلحت اندیشی اور تحقیق کی دشمن بتاتے رہے ہیں۔ رشید حسن خاں کے اس قبیل کے بیانات کی روشنی میں عام طور پر یہ کہا گیا:

''ادبی مسائل میں کسی بھی مرحلے پر مفاہمت نہ کرنا اور مصلحتِ وقت کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا رشید حسن خاں کی شخصیت کے روشن اجزا ہیں''۔[۱]

میں اس بیان سے کلی طور پر اتفاق نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ کردار کے جس دُہرے پن کے سب سے زیادہ شاکی اردو میں رشید حسن خاں رہے ہیں، وہ دُہراپن خود رشید حسن خاں میں کم نہ تھا، جس کی نمایاں مثال خان صاحب کا خلیق انجم، اسلم پرویز اور بعض دوسرے احباب کی تمام کوتاہیوں سے چشم پوشی ہے۔ رشید حسن خاں کی سفارش پر غالب انسٹی ٹیوٹ نے 'غالبؔ کے خطوط' کی تمام جلدیں شائع کیں۔ میں اس پر تبصرہ لکھ رہا ہوں جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ خلیق انجم نے 'غالب کے خطوط' کو کتنی بے توجہی کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے اور اس کو غالب انسٹی ٹیوٹ کیسے فخریہ انداز میں پیش کرتی رہی ہے۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں موجود ہیں جن میں اس احتیاط کو نشان زد کیا جاسکتا ہے جس کا ذکر نیّر مسعود کے نام خاں

---

[۱] رشید حسن خاں: حیات اور ادبی خدمات، مرتّبہ ڈاکٹر اطہر فاروقی، ص ٦۔

صاحب کے خط کے اس جملے میں ہے جو اوپر نقل کیا گیا۔

ابھی جو میں نے کہا کہ کردار کا دُہرا پن خود رشید حسن خاں میں کم نہ تھا۔ اس کی دلیل چاہیے تو رشید حسن خاں کے خطوط بنام نیر مسعود محررہ ۲ رمئی ۱۹۹۸ء اور ۱۲ رمئی ۱۹۹۸ء کا مطالعہ کیجیے (اردو ادب، جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء) اور پھر رشید حسن خاں کا یہ خط دیکھیے جو شمس بدایونی کے نام لکھا گیا ہے:

''متعدد لوگوں نے مجھ سے میر صاحب (مراد پروفیسر نیر مسعود) کے لب و لہجے کی شکایت کی۔ انھوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ میرا کچھ نہیں بگڑا۔ علمی مسائل تبرّائی زبان میں زیرِ گفتگو نہیں آسکتے۔ آپ محمد شاہ رنگیلے کی خرابیوں کو بیان کیجیے کوئی دہلی والا بُرا نہیں مانے گا۔ یہ نہیں سمجھے گا کہ دہلی کی تہذیب کو بُرا کہا جارہا ہے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کے کسی مسخرے حکمراں (نصیرالدین حیدر یا واجد علی شاہ) کی واقعی خرابیوں پر کچھ کہیے، سمجھا جائے گا کہ پورے لکھنؤ، لکھنوی تہذیب اور شیعہ کمیونٹی پر حملہ کیا گیا ہے۔ یہ وہی اقلیت کی نفسیات ہے جس میں لسانی یا مذہبی اقلیتیں اکثر مبتلا رہتی ہیں: بہرطور اس کے بعد سے بھی مجھ سے ان کی (مراد نیر مسعود) مراسلت حسبِ سابق برقرار ہے۔ ادھر پرسشِ احوال کے دو خط یکے بعد دیگرے آئے ہیں۔ مشیر لکھنوی کی ہرسیہ گوئی مشہور ہے۔ میرے بھائی نے نثری ہرسیہ لکھا ہے ...... مرحوم سیّد مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا نجم الغنی خاں کو 'نجم الغبی' کہا کرتے تھے۔ یوں کہ انھوں نے پوست کندہ حالات لکھے ہیں 'تاریخ اودھ' میں: ہاں، کتاب نما کے حالیہ شمارے میں جین صاحب کا تبصرہ 'مثنویاتِ شوق' پر پڑھا؟ اصلاً یہ سارا معاملہ اس مولانا آزاد ایوارڈ کا تھا۔ اکبر حیدری نے کراچی کے 'طلوعِ افکار' میں بھی کچھ گل افشانی فرمائی ہے۔ انعام کا اعلان ہوتے ہی یہی تحریر انھوں نے 'قومی آواز' میں چھپوائی تھی۔ لب لباب یہ تھا کہ بڑے غیر مستحق شخص کو اب کے یہ انعام دیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ روزانہ نیر مسعود صاحب کے یہاں جاتے ہیں۔ خیر حیدری صاحب کو میں غیر مکلّف مانتا ہوں بہ لحاظ تحقیق۔ یوں وہ کیا اور ان کی

بات کیا"[1]

رشید حسن خاں نے اسی معاملے کے تعلق سے جو خط نیر مسعود کو لکھے ان کے اور اس خط کے لہجے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یوں یہ پورا خط گہرے نفسیاتی مطالعے کا متقاضی ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں لیکن خط کشیدہ جملے خاص توجہ چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ خاں صاحب کا حسنِ ظن ہے، انھوں نے جس طرح نصیرالدین حیدر اور واجد علی شاہ کی عیاشی اور اوباشی کو لکھنؤ کے گھر گھر تک پہنچا دیا ہے اور پورے لکھنؤ کو گلے گلے تک اس میں ڈوبا بتایا ہے اس طرح اگر محمد شاہ رنگیلے کی بدکاریوں کے دائرے کو پھیلائیں تو اہلِ دہلی کا ردِ عمل بھی مختلف نہ ہوگا۔

یہاں میرا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ رشید حسن خاں کو تمام انسانی کمزوریوں سے عاری سمجھنا درست نہیں۔ ہاں، اس میں شک نہیں کہ انھوں نے تحقیق اور تدوین کے اعلا نمونے پیش کیے ہیں اور ان کی اہمیت کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔

'مثنویاتِ شوق' میں تینوں مثنویوں کا متن صرف ۱۰۴ صفحات کو محیط ہے جب کہ مقدمہ ۱۶۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور چار ضمیمے ہیں جن میں پہلا ضمیمہ 'تشریحات' ہے جو خاں صاحب کی دیدہ ریزی کو ظاہر کرتا ہے، دوسرا ضمیمہ بعنوان 'تلفظ اور املا' ہے۔ یہ تو خاں صاحب سے بہتر طور پر کون تیار کرسکتا تھا۔ تیسرا ضمیمہ 'اختلافِ نسخ' کے عنوان سے ہے اور چوتھا بعنوان 'الفاظ اور طریقِ استعمال' ہے اور پھر فرہنگ۔ گویا 'مثنویاتِ شوق' کا یہ متن بصورتِ موجودہ سب سے معتبر اور کارآمد ہے۔ 'مثنویاتِ شوق' کے بعد 'سحرالبیان' منظرِ عام پر آئی۔ خاں صاحب نے اس کی تدوین بھی اپنے مخصوص انداز میں کی۔ اس پر ۱۴۲ صفحے کا مقدمہ ہے۔ اس کے بعد 'سحرالبیان' کا متن ہے جو ۱۲۵ صفحات کو محیط ہے۔ اس کتاب کا انتساب گیان چند جین کے نام ہے۔ اس کے مقدمے میں بھی خاں صاحب نے تقریباً تمام ضروری مباحث کو سمیٹ لیا ہے۔ اس میں پانچ ضمیمے ہیں اور پھر فرہنگ۔ اور 'سحرالبیان' کا متن گیارہ خطی اور دو مطبوعہ نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔

مثنوی کے نام کی بحث میں رشید حسن خاں نے ثابت کیا ہے کہ میر حسن نے اس مثنوی کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ 'سحرالبیان' کیسے بن گئی؟ تو رشید

---

[1] محررہ ۴/اکتوبر ۱۹۹۸ء 'ہماری زبان' رشید حسن خاں نمبر، یکم تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۔

حسن خاں بتاتے ہیں:

''انھوں نے مثنوی کا کوئی نام ہی نہیں رکھا تھا۔ انھوں نے تو شاعرانہ رعایت کے ساتھ صرف یہ لکھا ہے: نہیں مثنوی، ہے یہ سحرالبیان۔ اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ اس مثنوی میں تو صاف لفظوں میں کوئی نام آیا نہیں تھا، بس یہ مرکب کلمہ بہ طورِ کلمۂ صفت ایک شعر میں آیا تھا؛ مگر اس مرکب کی معنویت توجہ کو اپنی طرف کھینچ سکتی تھی۔ سب سے پہلے مصحفی نے اس معنویت کو محسوس کیا اور یہ فرض کرلیا کہ اس مثنوی کے محاسن اور دل کشی اور دل فریبی کے لحاظ سے یہ کلمہ بطورِ نام آیا ہے۔ کوئی بھی بات ہوئی ہو، مصحفی نے اپنے تذکرے میں اس کا یہی نام لکھا''۔[۱]

خاں صاحب کے بقول مصحفی کے بعد افسوسؔ نے اپنے دیباچے میں اس کلمے کی مناسبت سے اس مثنوی کو 'اسم بامسمّیٰ' لکھا اور ''اب بہ طورِ عموم اسے سحرالبیان کہا جاتا ہے''۔[۲]

'سحرالبیان' کے متن کو رشید حسن خاں نے جس سلیقے سے تیار کیا ہے متن کی ترتیب و تہذیب کا یہ سلیقہ اردو کی حد تک رشید حسن خاں سے مخصوص ہے۔ لیکن خاں صاحب نے میر حسن کی 'سحرالبیان' کے سترہ شعروں کو ایک کاتب (ہمدمؔ) کے سر منڈھ دیا اور کسی معقول دلیل کے بغیر محض اخلاقی بنیاد پر۔ میں نے اپنے مضمون ''شعروں کے 'انتساب' نے....'' (مطبوعہ 'آجکل' دہلی، جنوری ۲۰۰۷ء) میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ یہ سترہ اشعار 'سحرالبیان' کے الحاقی بتائے جاتے ہیں۔ رشید حسن خاں بتاتے ہیں کہ ''سحرالبیان کا ایک خطی نسخہ نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے جس کا سالِ کتابت ۱۲۰۹ھ ہے۔ اس کی کتابت حیدرآباد میں ہوئی ہے، کاتب کا نام ہے گلاب چند..... گمانِ غالب ہے کہ کاتب مشہور شاعر رائے گلاب چند ہمدمؔ ہیں۔ ہمدمؔ، خواجہ احسن الدین خاں بیاںؔ کے شاگرد تھے۔ وہ نواب شمس الامرا کی سرکار میں پیش کار تھے، (جائزہ مخطوطات اردو، ص ۴۴۸)۔ مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۱۹۹ھ ہے، اس لحاظ سے یہ خاصا پرانا خطی نسخہ ہے.....

---

۱ 'سحرالبیان'، مرتبہ رشید حسن خاں، ص ص ۲۹، ۳۰۔ ۲ ایضاً، ص ۳۱۔

۲ رشید حسن خاں، غیر معتبر کلام: اردو ادب ص ص ۱۰۲، ۱۰۳ دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) اپریل تا جون ۲۰۰۲ء۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہ اشعار اس خطی نسخے کے کاتب ہمدم کے شامل کیے ہوئے ہیں''۔[1]

میرے خیال میں رشید حسن خاں نے فیصلہ کرنے میں جلدی کی۔ مثنویات میر حسن (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی) جلد اول، جنوری ۱۹۶۶ء لاہور: مجلس ترقی ادب میں ایک مثنوی 'نقل زن فاحشہ' صفحہ ۳۰۲ پر ہے۔ جس میں یہ شعر بھی ملتا ہے:

وہ دونوں تو لے کروٹیں مڑ گئے
یہ رنڈی کی ٹانگیں اٹھا جڑ گئے

اس شعر میں 'یہ' کی ضمیر تیسرے مرد کی طرف ہے۔ جب میر حسن سے یہ شعر اور یہ قصہ یادگار ہے تو محض اخلاقی بنیاد پر یہ کہنا کہ یہ رنگِ سخن میر حسن کا نہیں اور 'سحر البیان' کے یہ شعر الحاقی ہیں، کسی طرح درست نہیں۔ میں ان اشعار کو میر حسن کے ہی سمجھتا ہوں تاوقتیکہ کوئی ٹھوس دلیل نہ فراہم کردی جائے جو انھیں میر حسن سے منسوب بتائے۔

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ 'سحر البیان' کے جتنے خطی نسخے دستیاب ہیں ان میں یہ نسخہ خاصا قدیم ہے۔ اس سے پہلے اور صرف تین سال پہلے کا صرف ایک نسخہ دستیاب ہے۔ اس لیے بھی اس نسخے کے متن کی ایک خاص اہمیت ہے اور اس کے کسی حصے کو صرف اس لیے رد نہیں کیا جاسکتا کہ ''ان اشعار کی سطح خاصی پست ہے اور ابتذال نمایاں ہے؛ مگر وصل کے بیان کو یہ چٹ پٹا ضرور بناتے ہیں۔ ہمدم نے یا اور کسی نے، وہ کوئی بھی ہو، غالباً یہ خیال کرکے کہ وصل کا بیان خاصا بے رنگ اور بے مزہ ہے، یہ اضافہ کیا ہے''۔[2]

اور اگر یہ اشعار میر حسن کے نہیں ہیں، صرف اس لیے کہ ان کی سطح خاصی پست ہے تو ان سے فوراً پہلے اور بعد کے جو اشعار 'سحر البیان' کے ہیں جن کو خاں صاحب نے شعر نمبر ۱۱۳۰ تا ۱۱۴۲ (ص ۴۲) درج کیا ہے کیا وہ شریفانہ ہیں؟ یا ان کی سطح پست نہیں ہے؟ اور پھر یہ کہ پست و بلند کا مسئلہ بذاتِ خود بڑا پیچیدہ اور متنازعہ فیہ ہے۔ وہ سترہ اشعار ہیں:

چھوا عضو اس کے کہیں ران میں	تو برہم ہو بولی اسی آن میں
کہ بس بس زیادہ ڈھنکے ہی رہو	کچھ اب لگ چلے، اس سے آگے نہ ہو
ذرا ہاتھ اپنے اُدھر ہی دھرو	خیال اور بیہودہ کچھ مت کرو
بدن کو ادھر سے چرانے لگی	اور آنکھیں حیا سے چھپانے لگی

---

[1] رشید حسن خاں، غیر معتبر کلام؛ اردو ادب اپریل تا جون، ۲۰۰۲، دہلی؛ انجمن ترقی اردو (ہند)، ص ص ۱۰۲، ۱۰۳

[2] 'سحر البیان' مرتبہ رشید حسن خاں، ص ۹۵۔

ہوئی اور خواہش زیادہ اسے ہوا فتحِ در کا ارادہ اسے
اٹھا اور بیٹھا جو شہزادہ چست نہ چاہا رہے شاہزادی درست
ہرن سی جھجک کر بھڑکنے لگی تڑپھنے لگی اور پھڑکنے لگی
بہت کسمسائی و مانع ہوئی کہ اب تک چھبی تھی نہ اس کے سوئی
بہ زور اپنے قابو میں ان نے لیا اس ان بیدھے موتی میں برما کیا
ہوا تیر جس وقت سوفار تک خبر ہوگئی وار کی پار تک
کلی کھل کے گل ہوگئی ایکبار یہ صورت ہوئی جیسے بکسا انار
اگرچہ نہ تھی تاب و طاقت اسے ولیکن نہ دی اس نے فرصت اسے
مے عیش کے گھونٹ تھے پے بہ پے کری خوب...جوش کھا کھا کے قے
چھپرکھٹ ہوا تختۂ لالہ زار ہزارا کی گویا کھلی تھی بہار
وہ نجم النساء محرم خواب گاہ کہ تھی بے تکلف جسے دل میں راہ
وہ رکھ گئی تھی توشک کے نیچے رومال اور اب کوٹ کر جلد لائی اگال
کھلانے لگی بھونے بادام خشک پلانے لگی شربت بید مشک

'سحرالبیان' کے ضمیمہ ۲ (ج) میں رشید حسن خاں بتاتے ہیں کہ ''شعر ۱۳۷ کے بعد انجمن [نسخہ] میں یہ چودہ اشعار بھی ہیں ...... نسخۂ انجمن میں شعر ۱۴۵ کے بعد یہ تین شعر بھی ہیں ...... یہ سترہ شعر ادبیات ۲ [نسخہ] میں بھی شامل ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ شروع کے تین شعروں کے بعد شعر ۱۳۸ ہے، اس کے بعد باقی اشعار ہیں اسی ترتیب کے ساتھ''۔[1]

میں ان تمام اشعار کو میر حسن کے ہی مانتا ہوں اور کئی قدیم ترین قلمی نسخوں میں ان کی موجودگی بتاتی ہے کہ میں غلط نہیں ہوں۔

'سحرالبیان' کے مقدمے میں رشید حسن خاں نے اس مثنوی کے فنی محاسن پر جس طرح گفتگو کی ہے وہ ہمارے زمانے کا کوئی دوسرا محقق نہیں کرسکتا، بلکہ بہت سے نقادوں کے بھی بس کی بات نہیں۔ اور جہاں تک متن کی صحت کا تعلق ہے تو بے شک 'سحرالبیان' کا یہ نسخہ اب تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے بہتر ہے۔

خاں صاحب نے ۲۰۰۳ء میں 'زٹل نامہ' شائع کیا۔ یہ کتاب قومی اردو کونسل کے

---

[1] سحرالبیان، مرتبہ رشید حسن خاں، ص ص ۳۹۰، ۳۹۱۔

مالی تعاون سے شائع کی گئی۔ 'زٹل نامہ' جعفر زٹلی کا کلیات ہے۔ اس میں رشید حسن خاں کا مقدمہ قدرے مختصر ہے۔ یہ مقدمہ ۹۳ صفحات کا ہے۔ اس میں حالاتِ زندگی، کلامِ جعفر کی اہمیت، زبان اور بیان وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر یہ عنوان قائم کیا گیا ہے کہ مکمل کلیات کس نے مرتّب کیا؟ اس میں خاں صاحب بتاتے ہیں:

''یہ معلوم نہیں کہ جعفر کے مکمل کلام کا نسخہ کس نے مرتّب کیا تھا۔ صرف یہ معلوم ہے کہ قدیم ترین خطی نسخہ ۱۲۰۶ھ کا ہے''۔

اس کے بعد تمام نسخوں کا تعارف ہے اور پھر طریقِ کار کا بیان۔ کلیاتِ جعفر زٹلی کا متن دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا 'حصہٗ نثر' ہے جس میں ۳۰ مختصر تحریریں شامل ہیں۔ حصہٗ نظم ص ۱۱۹ سے شروع ہوتا ہے اور ص ۲۶۷ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد تین ضمیمے ہیں، پہلا مشکوک کلام اور دوسرا ضمیمہ غیر معتبر کلام ہے اور تیسرا ضمیمہ بعنوان 'لفظیات' ہے۔ 'زٹل نامہ' دس قلمی نسخوں اور چار مطبوعہ نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ 'زٹل نامہ' پر اس کتاب میں گوہر نوشاہی کا مضمون شامل کیا جارہا ہے۔

۲۰۰۳ء میں ہی 'کلاسکی ادب کی فرہنگ' بھی شائع ہوئی۔ 'کلاسکی ادب کی فرہنگ' جلد اول کی شکل میں ان تمام فرہنگوں کو ضروری اضافوں کے ساتھ یکجا کردیا گیا ہے جو رشید حسن خاں کی مرتّبہ کتابوں کے آخر میں بطورِ فرہنگ شامل تھیں۔ رشید حسن خاں کا ارادہ تھا کہ:

''دوسری جلد کے لیے اہم شاعروں کے کلام کو اور تیسری جلد کے لیے اہم نثری کتابوں کو بنیاد بنایا جائے، 'فسانۂ آزاد' اور 'طلسم ہوش ربا' کو بھی ایسی دوسری کتابوں کے ساتھ سامنے رکھا جائے۔ اس فرہنگ میں ایسے عام الفاظ کو شامل نہ کیا جائے جن کے معنی سے واقفیت مشکل نہیں۔ صرف ایسے لفظوں کو شامل کیا جائے جو اب استعمال میں نہیں آتے یا ان معنوں میں مستعمل نہیں جن معنوں میں وہ پرانی کتابوں میں ملتے ہیں''۔[1]

لیکن کلاسکی ادب کی فرہنگ جلد دوم کی نوبت نہ آسکی۔ اس بارے میں خاں صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] رشید حسن خاں: 'کلاسکی ادب کی فرہنگ' کے بارے میں: 'اردو ادب' دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) جنوری۔ مارچ ۲۰۰۵ء ،ص ۳۴۔

''معروف ایہام گو شاعروں کے دیوان اصول تدوین کے مطابق مرتب ہی نہیں ہو پائے ہیں اور جو چھپے ہوئے نسخے ملتے ہیں، ان کے متن پر پوری طرح بھروسا نہیں کیا جا سکتا...... ایہام گو شاعروں کے بعد جو اہم نام آتے ہیں، ان میں سے بیش تر شاعروں کے دیوان ابھی تک تدوین کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ سودا ملک الکلام ہیں لیکن ہم ابھی تک ان کا مکمل کلیات مرتب نہیں کر پائے ہیں۔ یہی احوال میر حسن کے کلام کا ہے۔ انشا کے کلام میں قدیم الفاظ کا بڑا ذخیرہ محفوظ ہے؛ کلیات ان کا بھی مرتب نہیں ہو سکا، بس پھٹکر کام ہوتے رہے ...... ایسی صورت میں اگر اس جلد پر کام شروع بھی کر دیا جائے تو آگے چل کر اسے ادھورا چھوڑنا پڑے گا، تا آنکہ مطلوبہ متنوں کی تدوین کا کام بھی ساتھ ہی شروع کیا جائے۔''[۱]

اور یہ کسی ایک شخص کے لیے اور اتنے بڑے پیمانے پر ممکن نہ تھا۔ چناں چہ خاں صاحب نے دوسری جلد کے منصوبے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ یوں 'کلاسکی ادب کی فرہنگ' جلد اول کا کام بھی بہت اطمینان بخش نہیں۔ جو لوگ اسے بڑا ادبی کارنامہ سمجھتے ہیں وہ فرہنگ نگاری کے آداب سے واقف نہیں ہیں۔

خاں صاحب نے اس کے بعد کلامِ غالب کی فرہنگ تیار کرنا شروع کیا جس کا نام انھوں نے 'گنجینۂ معنی کا طلسم' رکھا تھا۔ اس کے تقریباً آٹھ سو صفحات وہ کمپوز کروا چکے تھے کہ ان کا انتقال (۲۶ رفروری ۲۰۰۶ء کو) ہو گیا۔

اس کتاب میں خاں صاحب کی شخصیت اور فن سے متعلق جن حضرات کے مضامین شامل ہیں میں ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں، خصوصاً ان کا، جنھوں نے میری فرمائش پر مضمون لکھنا منظور کیا۔

نوٹ: 'گنجینۂ معنی کا طلسم' نامکمل ہے اور اس کام کی کوئی اہمیت نہیں جب تک یہ مکمل نہ ہو جائے۔ چناں چہ میں نے اس کام کے بقیہ حصے کو اسی نہج پر شروع کر دیا ہے تا کہ یہ اہم کام ضائع نہ ہو۔ (مرتبین)

---

۱ رشید حسن خاں: 'کلاسکی ادب کی فرہنگ' کے بارے میں: 'اردو ادب' دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) جنوری۔ مارچ ۲۰۰۵ء ص ص، ۳۴، ۳۵۔

اطہر فاروقی

رشید حسن خاں — سوانحی خاکہ

نام	:	رشید حسن خاں
والد کا نام	:	امیر حسن خاں
تاریخ ولادت	:	تعلیمی اسناد کے مطابق 10 جنوری 1930
مقام پیدائش	:	شاہ جہاں پور (یوپی)
مستقل پتا	:	167 باڑوزئی دوم۔ شاہ جہاں پور (یو. پی) 242001
ملازمت	:	مدرسہ فیض عام، شاہ جہاں پور اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول، شاہ جہاں پور شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی 31 دسمبر 1989 کو دہلی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

رشید حسن خاں صاحب کے والد میر حسن خاں صاحب ان پرانے لوگوں میں سے تھے جو انگریزی تعلیم کو برا سمجھتے تھے۔ وہ پولیس میں ملازم تھے اور سب انسپکٹر تھے۔ تحریکِ عدم تعاون کے زمانے میں اس تحریک سے متاثر ہو کر انھوں نے سرکاری ملازمت سے سبک دوشی حاصل کر لی تھی۔

انھوں نے رشید صاحب کو شاہ جہاں پور کے عربی مدرسہ بحرالعلوم میں داخل کرایا، جہاں 1939 تک وہ زیرِ تعلیم رہے مگر درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کر سکے۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی اور شاہ جہاں پور کی آرڈننس فیکٹری میں کارکنوں کی بھرتی زور و شور سے ہو رہی تھی۔ گھر کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے، یوں وہ 1939 کے اواخر میں اس فیکٹری

میں ایک معمولی ورکر کی حیثیت سے بھرتی ہوگئے۔ اس فیکٹری میں 1941 کے آخر میں چھپ کر پہلی مزدور یونین بنائی گئی۔ شروع میں یونین کے جلسے گھروں میں میلاد شریف یا کیرتن کے بہانے سے ہوتے تھے۔ ایک سال کے بعد باقاعدہ سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ چند سال کے بعد اس فیکٹری میں یونین کی طرف سے ہڑتال کی گئی، یہ پہلی ہڑتال تھی جو اس آرڈی ننس فیکٹری میں ہوئی تھی۔ یہ 34 دن تک چلی۔ رشید صاحب اس وقت اس یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے دو سال بعد فیکٹری میں چھٹنی ہوئی۔ نکالے جانے والوں کی پہلی فہرست میں ان لوگوں کے نام تھے جو یونین کے سرگرم رکن تھے، ان میں رشید حسن صاحب بھی تھے۔ اس کے بعد وہ شہر کے عربی مدرسہ فیضِ عام میں عربی اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے رکھ لیے گئے۔ چوں کہ داڑھی نہیں تھی اور دوسری شعائر کے بھی پوری طرح پابند نہیں تھے یوں عربی مدرسے کے طلبہ نے ان سے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد رشید صاحب کو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لیے دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔ اسی زمانے میں اسلامیہ ہائر سکینڈری اسکول میں فارسی، عربی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی اور ان کو وہاں ملازمت مل گئی۔

اس ملازمت کے سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ اسلامیہ اسکول کی اس جگہ کے لیے شہر کے ایک عالم اور مرشد بھی امیدوار تھے۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ ایک ایسے شخص کو ملازمت ملنے کا امکان ہے جو کمیونسٹوں کے ساتھ برسوں تک کام کر چکا ہے۔ کمیونسٹ تو دہریے ہوتے ہیں، لازماً یہ شخص بھی بے دین ہوگا۔ شہر کی ایک بڑی مسجد میں انھوں نے بعد نمازِ جمعہ یہ اعلان کیا کہ یہ شخص جو بے دینوں کے ساتھ رہا ہے اور خود بھی بے دین ہے، اسلامیہ اسکول میں اس کو جگہ نہیں ملنا چاہیے۔ مگر ان کی مشکل یہ تھی کہ شہر کے سب سے معروف عالم مولوی محمد مجتبیٰ خاں (مرحوم و مغفور) جو رشید صاحب کے استاد بھی تھے، وہ رشید صاحب کے لیے کوشاں تھے۔ یوں مرشد موصوف کی آہ و فغاں بے کار گئی۔ البتہ ان کے اس 'اعلان' کا اثر یہ ضرور ہوا کہ مینجنگ کمیٹی میں جب یہ معاملہ پیش ہوا اور رائے لی گئی تو صرف ایک ووٹ کی بڑھت سے رشید صاحب کو اسکول کی ملازمت مل سکی تھی۔ مولوی محمد مجتبیٰ خاں صاحب کی کوشش کے نتیجے میں مینجنگ کمیٹی کے چیئرمین خان بہادر فضل الرحمٰن خاں صاحب غیر جانب دار رہے تھے، ورنہ صورتِ حال مختلف ہو جاتی۔

فیکٹری کی ملازمت کے زمانے کے بہت سے واقعات رشید صاحب نے مجھے سنائے تھے، ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ اس فیکٹری میں اس زمانے میں تین شفٹیں آٹھ آٹھ گھنٹے کی ہوتی تھیں۔ چوبیس گھنٹے کام ہوتا تھا۔ تیسری شفٹ میں جو صبح چھ بجے ختم ہوتی تھی، درمیان میں آدھ گھنٹے سے کچھ زیادہ کا وقفہ ہوتا تھا۔ لوگ ذرا آرام کرلیا کرتے تھے۔ رشید صاحب 'طلسم ہوش ربا' کی جلد ساتھ لے کر جایا کرتے تھے اور اسے پڑھا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے 'طلسم ہوش ربا' کی دسوں جلدیں (آٹھ اصل جلدیں اور دو بقیہ 'طلسم ہوش ربا') دو بار مکمل طور پر اسی زمانے میں پڑھی تھیں۔

باقر مہدی کے رسالے 'اظہار' کے شمارہ 5 (جنوری 1984) میں پہلی بار گوشۂ رشید حسن خاں شامل ہوا تھا۔ اس میں رشید صاحب نے باقر مہدی صاحب کی فرمائش پر اپنے بارے میں لکھا تھا:

> ''میرے استادوں میں قابلِ ذکر نام مفتی محمد مجتبیٰ حسن خاں صاحب (شاہ جہاں پوری) مغفور مرحوم کا ہے جن سے میں نے عربی پڑھی تھی اور میری تربیت میں نمایاں حصہ انھی کا رہا ہے۔ اساتذۂ معنوی کی حیثیت سے حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا عرشی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات کی تحریروں سے میں نے صحیح معنوں میں تحقیق اور تدوین کے آداب اور اصول سیکھے۔ لیکن ان سب سے مقدم نام نیاز فتح پوری کا ہے جن کی تحریروں سے ابتدا ہی میں بہت کچھ سیکھا۔ تشکیک اور خطائے بزرگاں کو بھی خطا ہی سمجھنے کا سبق پہلے نیاز صاحب ہی سے پڑھا تھا۔ ان سے ملاقات تو بہت بعد میں ہوئی، متاثر بہت پہلے سے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تحقیق کے باضابطہ طالبِ علم کی حیثیت سے شیرانی صاحب اور قاضی صاحب کی تحریروں سے استفادہ کیا تو نیاز صاحب کا طلسم ٹوٹ گیا لیکن جو ابتدائی نقوش مرتسم ہوگئے تھے وہ اب تک کچھ نہ کچھ نمایاں ہیں۔ روایت سے بغاوت اور تشکیک ان میں خاص کر شامل ہیں۔ اسی لیے میں نیاز صاحب کا بہت قائل رہا ہوں۔ کچھ دنوں تک تو معتقدانہ انداز رہا، لیکن پھر وہ بات تو نہیں رہی۔ رہ بھی نہیں سکتی تھی، لیکن قائل آج بھی ہوں۔ ناقدین میں (بعض اختلافات

کے باوجود) کلیم الدین احمد کی میں بہت عزت کرتا ہوں اور ان کی تحریروں کو بہت توجہ سے پڑھتا ہوں۔ سرور صاحب کے مطالعے اور ذہانت کا میں قائل ہوں، لیکن ان سے بس یہ شکایت ہے کہ انھوں نے تنقید کو انشائیے سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ تنقید کا رنگ دب گیا ہے اور منافقانہ اندازِ بیان کے لیے بڑی گنجائش پیدا ہوگئی ہے۔ احتشام صاحب سے بہ حیثیت انسان بہت متاثر تھا۔ ایسے شریف انسان بہت کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی تنقیدی نگارشات سے کبھی متاثر نہیں ہوسکا۔ خواجہ احمد عباس کی فلموں کی طرح وہ مجھے بے اثر محسوس ہوتی رہیں۔ البتہ مجنوں صاحب کے ذوق اور کلاسکی ادب کے مطالعے سے ہمیشہ متاثر رہا۔ ناقدین میں کم لوگ شعر کے معاملے میں مجنوں صاحب کی طرح خوش ذوق ہوں گے۔ ایسا رچا ہوا شعری ذوق کم ملتا ہے۔

مشاغل میں سرفہرست اسپورٹس کو رکھا جانا چاہیے۔ ہاکی خود کھیلی ہے، اس لیے وہ میرا پسندیدہ کھیل ہے۔ اس کھیل میں جو فن کارانہ دقت پسندی ہوتی ہے اس کا میں عاشق ہوں۔ اس کے بعد باسکٹ بال، والی بال اور فٹ بال کا نمبر ہے۔ میں اب بھی اپنے وقت کا اچھا خاصا حصہ ان کھیلوں کو دیکھنے میں صرف کرتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم عربی مدرسے میں ہوئی تھی اور درسِ نظامی کے طالبِ علم کی حیثیت سے شعور نے بالیدگی پائی تھی۔ اچانک 1941 میں ٹریڈ یونین کے دائرے میں آ گیا۔ میرے شہر شاہ جہاں پور میں اس زمانے کی بہت بڑی آرڈی ننس فیکٹری تھی جس میں تیس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔ اس فیکٹری میں پہلی بار چھپ چھپا کر مزدوروں کی یونین بنائی گئی اور پھر 34 دن کی ہڑتال ہوئی۔ یہ 1945 کی بات ہے۔ میں اس فیکٹری میں 1939 میں مزدور کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا اور اب اس یونین کا جوائنٹ سکریٹری بھی تھا۔ اس دوران میں یوپی کے بیشتر لیڈروں اور کمیونسٹ پارٹی کے ذمے داروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور جس قدر ان سے قریب ہوتا گیا اسی قدر ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا

گیا۔ وہ زمانہ کمیونسٹ پارٹی میں سیاسی انتہا پسندی کا تھا۔ مزدوروں کے مسائل کمیونسٹ پارٹی کے لیے پارٹی کے دائرے کو وسیع کرنے کا وسیلہ بن کر رہ گئے تھے۔ مجھ جیسے ورکر یہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارے مسائل دوسرے کے مسائل سے مختلف ہیں اور انھیں مقامی مسائل کے مطابق حل کیا جانا چاہیے، جب کہ لیڈر شپ کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ صرف ایک نعرہ ہم سب سے لگواتے تھے کہ دنیا کے مزدور ایک ہو جاؤ۔ یہ بات ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یونین کے فیلڈ ورکر سیاسی مسائل اور جوڑ توڑ سے بیگانہ تھے۔ جی توڑ کر کام کرتے تھے اور سب کچھ لٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہم کو جو لیڈر ملے تھے وہ اپنے سے اوپر والے لیڈروں کی کٹھ پتلی تھے۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ورکر تو نچلے درجے سے نکل کر آیا تھا لیکن اس کا لیڈر اوپر کے طبقے سے نکل کر آیا تھا اور اپنے ساتھ اپنے طبقے کے سارے تضاد لے کر آیا تھا اور انتہا پسندانہ پالیسی نے کام بنانے کے بجائے کاموں کو بگاڑنے کو اپنا نقطۂ نظر بنا لیا تھا کہ اس وقت یہی سیاسی نقطۂ نظر تھا کمیونسٹ پارٹی کا۔

غرض کہ خاص خاص ورکروں اور لیڈروں میں خلیج بڑھتی گئی اور آخر کار مجھ ایسے ناآشنائے سیاست کارکن بالکل الگ ہو گئے۔ ان دنوں ایسے تلخ تجربے ان رہنماؤں کے ہوئے تھے کہ آج تک ان کی یاد باقی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ صورتِ حال رونما نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں بھی آج ترقی پسندی کا لیبل لگائے ہوئے ہوتا۔ ترقی پسند تحریک سے بچنے کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہوگئی کہ میں نے تنقیدی کتابیں پڑھنے سے پہلے وہ ادب پڑھا اور اسی نے مجھے محفوظ رکھا کیوں کہ فارسی شاعری اور کلاسیکی اردو ادب کے مطالعے نے ذہن میں ذوق اور معیار کا ایک تصور ضرور پیدا کر دیا تھا جس نے صحافت، نعرے بازی اور ادب میں فرق کرنا سکھایا تھا اور فرد کی حیثیت اور شخصیت کے دائرے کی وسعت سے آشنا کیا تھا۔

میں 22'23 سال سے دہلی میں ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس شخص کی اصل رائے کیا ہے۔ اس کے برخلاف آپ میرے چھوٹے سے شہر میں چلیے، پانچ منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ کس شخص کی اصلی رائے کیا ہے۔ خاندانی روایت، نسلی اثرات اور مقامی خصوصیات نے شروع ہی سے صاف گوئی کا عادی بنا دیا تھا۔ اسی نے تحقیق کی طرف متوجہ کیا اور اس میدان میں آکر مجھے طبعی مناسبت کا اندازہ ہوا۔ لغت، زبان کے مسائل، عروض اور قواعد جیسے موضوعات شروع میں میرے پسندیدہ موضوع تھے۔ ادبی تحقیق سے بھی تعلق خاطر تھا لیکن کچھ کم۔ 1960 سے اس طرف زیادہ توجہ مبذول ہوئی۔ حافظ محمود شیرانی صاحب کی تحریریں اولین رہنما کی حیثیت سے پیش نظر رہیں اور پھر قاضی عبدالودود صاحب کی تحریروں نے متاثر کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحریروں نے بھی عرفان کی نئی روشنی بخشی۔

ادبی تحقیق اور تدوین اب میرے پسندیدہ ترین موضوعات ہیں۔ میں اس تنقید کا قطعاً قائل نہیں جس میں انشائیہ نگاری کا انداز ہو اور وہ اسلوب ہو جو منافق کی سخن آرائی کا ہوتا ہے۔ اسی طرح میں اس تحقیق کو فکرِ شاعرانہ کا بدل سمجھتا ہوں جس میں صاف گوئی کے بجائے پسینے پونچھنے کا انداز ہو چوں کہ حالات نے اب بیشتر افراد کو دنیاداری کے پھیر میں مبتلا کر رکھا ہے اس لیے تحقیق کا یہ سادہ وصاف انداز ان کو پسند نہیں آتا اور اس کے لیے ان حضرات نے 'منفی اندازِ نظر' کی ایک اصطلاح وضع کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جھوٹ کو جھوٹ کہیں اور دوٹوک انداز میں رائے ظاہر کریں وہ تو منفی انداز والے ہوئے اور جو لوگ ادب کے نام پر تجارت اور جہالت کو فروغ دیں وہ مثبت اندازِ نظر والے ہوئے۔ آپ چور کو چور کہیں تو وہ بہت واویلا مچائے گا۔ یہی حال ان تاجرانِ ادب کا ہے۔

میں صاف، سادہ، واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دلچسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش

ہے۔ مجھے شخص سے دلچسپی نہیں، اس نے جو کچھ کہا یا لکھا ہے اس سے دلچسپی ہے، جھوٹ کوئی بھی بولے وہ جھوٹ ہے۔ میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں۔

آج کل علم وادب میں جس طرح اسیری کے جال بچھائے گئے ہیں، گروپ بندی نے جس طرح دائرے بنائے ہیں اور دانش گاہوں میں جس انداز میں تحقیقی مقالوں کے نام پر کم سوادی کے اعلیٰ ترین نمونے تیار کیے جا رہے ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ تحقیق اپنی صاف گوئی اور صاف بیانی کے دائرے کو وسیع کرے۔ سچ واقعتاً کڑوا ہوتا ہے اور تحقیق کا مقصد سچ کی تلاش ہے اس صورت میں اگر تحقیقی نگارشات میں سچ کی تلخی شامل ہو تو اس کی شکایت نہیں کی جانی چاہیے۔ اگر 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' کے نام سے ایک کثیر رقم صرف کرنے کے بعد اور بہت دھوم دھڑ کے کے ساتھ ایک ایسی کتاب پیش کی جائے جس کو پشتارۂ اغلاط کہنا مناسب ہو اور کوئی شخص یہ بتائے کہ یہ کتاب مقالہ نگاروں کی آسان پسندی اور بے پروائی کا شاہکار ہے اور اس کے اندراجات اس قابل نہیں کہ انھیں معتبر قرار دیا جا سکے تو اس میں شکایت کی کیا بات ہے؟ یہ عجیب بات ہے کہ ہم بے ایمانی کرنے والے کو تو کچھ نہیں کہنا چاہتے اور اگر کوئی شخص بے ایمان کا پردہ فاش کرے تو اسے منفی اندازِ نظر کی نمائش قرار دینا چاہتے ہیں۔

تحقیق کو سچ کی تلاش رہتی ہے۔ جھوٹ کس نے بولا، یہ بھی ایک بات ہے، لیکن اصلی بات یہ ہے کہ جھوٹ کیوں بولا گیا اور کیسے بولا گیا۔ اس 'کیوں' اور 'کیسے' کی تلاش اور وضاحت بھی تحقیق کا ایک مقصد ہے اور یہ میرا محبوب موضوعِ سخن ہے اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ تحقیق کا بڑا مقصد ہے حقائق کی تلاش اور ان سے اخذ نتائج، اور یہ میرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔"

مطبوعات

1. اردو املا: ترقی اردو بورڈ، دہلی، 1974

2. اردو کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1975
3. زبان اور قواعد (لغت، تلفظ، اور قواعد شاعری) ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، اشاعتِ اول 1974، اشاعتِ ثانی 1983
4. ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ: اشاعتِ اول، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1978، اشاعتِ ثانی اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، تیسری اشاعت: لاہور، 1989
5. تلاش وتعبیر (تنقیدی مضامین): دلّی اردو اکادمی کی اعانت سے)، 1988
6. تفہیم: (تنقیدی اور تحقیقی مضامین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1993-
7. انشا اور تلفظ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994
8. عبارتِ کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994
9. انشائے غالب: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994
10. فسانۂ عجائب (تدوین) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 1990، انجمن ترقی اردو، لاہور 1990
11. باغ و بہار: (تدوین) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 1992، انجمن ترقی اردو، لاہور، 1992
12. مثنوی گلزارِ نسیم: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 1995
13. انتخابِ ناسخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972
14. انتخابِ سودا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972
15. انتخابِ شبلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971
16. انتخابِ نظیر اکبرآبادی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1970
17. انتخاب مراثی انیس و دبیر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971
18. دیوانِ خواجہ میر درد: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971
19. مثنویاتِ شوق لکھنوی (تدوین) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
20. غرائب اللغات (تدوین)
21. زٹل نامہ (کلیات جعفر زٹلی) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 2003
22. مصطلحاتِ ٹھگی، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، 2002
23. کلاسیکی ادب کی فرہنگ، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، 2000

24. مثنویاتِ شوق، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 1998

انعامات و اعزازات

1. دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ	1977
2. یو. پی اردو اکیڈمی انعام	1978
3. غالب ایوارڈ	1979
4. امتیاز میر اعزاز (میر اکیڈمی لکھنؤ)	1980
5. نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی)	1989
6. نیشنل ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکادمی	1990
7. محمد طفیل ادبی ایوارڈ (لاہور)	1990
8. کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (دہلی اردو اکادمی)	1991
9. نیشنل حالی ایوارڈ (ہریانہ اردو اکادمی)	1992
10. یوپی اردو اکادمی انعام	1994

مختلف اداروں میں اصولِ تحقیق، صحتِ املا:

مشرقی شعریات، قواعد زبان اور قواعد شاعری لکچر

1. اصولِ تحقیق پر پانچ لکچر، شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی (28-24 فروری 1984)
2. مشرقی شعریات پر چھ لکچر، شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی
3. مشرقی شعریات پر تین لکچر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
4. اصولِ تحقیق پر تین لکچر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
5. اصولِ تدوین پر تین لکچر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
6. مشرقی شعریات پر تین لکچر، شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی
7. کلاسیکی ادب کی تفہیم پر تین لکچر، شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی
8. تصوف اور تحقیق پر ایک لکچر، اورینٹل کالج، لاہور، 1992

- انٹرنیشنل نیاز سمینار (کراچی) 1984
- تین سو سالہ جشن یادگار شاہ سراج اورنگ آبادی، اورنگ آباد
- شیرانی سمینار، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ
- اصولِ تدوین سمینار خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ

- چکبست سمینار، مہاراشٹر اردو اکیڈمی، بمبئی
- دکنی ادب سمینار، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
- نصابِ تعلیم سمینار، دہلی اردو اکادمی، دہلی
- عوامی ادب سمینار، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی
- اصنافِ ادب سمینار، دہلی اردو اکادمی، دہلی
- دلّی والے، دہلی اردو اکادمی، دہلی
- فانی سمینار، الہ آباد
- نیاز سمینار، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ
- سیماب سمینار، سینٹ کالج، آگرہ
- جوش سمینار، یوپی اردو اکادمی لکھنؤ
- انٹرنیشنل غالب سمینار، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی
- دکنی ادب سمینار، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی
- انٹرنیشنل املا سمینار، شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی، بمبئی (10 تا 13 دسمبر)
- مولانا آزاد سمینار، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
- مولانا آزاد صدی تقریبات سمینار، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ

املا ورک شاپ صدارت کی

1. یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے تین ہفتے کا تربیتی کورس، شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی، جموں: یکم جنوری سے 12 فروری 1981 تک۔
2. ہائر سکنڈری اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے دس دن کا تربیتی کورس (صحتِ املا)، کرناٹک آرٹس کالج، دھارواڑ، کرناٹک یونیورسٹی، 11 تا 22 نومبر 1982۔
3. پرائمری اسکول کے اساتذہ کے لیے صحت املا کا تربیتی کورس۔ علامہ اقبال ایجوکیشنل سوسائٹی ہبلی، کرناٹک۔ 27 مئی سے 3 جون 1983 تک۔
4. پرائمری اور ہائر سکنڈری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے صحت املا کا پانچ دن کا تربیتی کیمپ، دھارواڑ، زیر اہتمام کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور، 1985۔
5. اردو املا کی معیار بندی پر تین روزہ سمینار۔ اردو ٹیچنگ ریسرچ سینٹر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز (حکومت ہند) لکھنؤ، 28 تا 30 دسمبر 1987۔

وزٹنگ فیلو

1. شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی، تین ہفتے کے لیے بہ حیثیت وزٹنگ فیلو: اصولِ تحقیق، قواعد زبان اور مشرقی شعریات پر لکچر دیے۔ اپریل 1983
2. شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی میں بہ حیثیت وزٹنگ فیلو: دو ماہ کے لیے۔ اصولِ تحقیق، قواعد زبان، قواعد شاعری اور علومِ بلاغت پر لکچر دیے۔ فروری- مارچ 1992۔
3. شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی میں بہ حیثیت وزٹنگ فیلو: چار ہفتے کے لیے۔ متن کی قرأت، کلاسیکی ادب کی تفہیم، علومِ بلاغت اور اصولِ املا پر لکچر دیے۔ ستمبر 1995۔

(بہ شکریہ 'کتاب نما' خصوصی شمارہ 'رشید حسن خاں: حیات اور ادبی خدمات'
مرتب: اطہر فاروقی، سنہ اشاعت جولائی 2002)

○○○

صدیق الرحمٰن قدوائی

ہمارے خاں صاحب

(رشید حسن خاں)

شاید سنہ پچپن چھپّن کی بات ہے کہ 'قومی آواز' میں فیض احمد فیضؔ پر ایک مضمون شائع ہوا جس میں ان کی شاعری پر بہت سارے اعتراضات تھے، مثلاً فیض کی ایک مشہور نظم کے دو مصرعے ہیں:

کیسے سفاک حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

اعتراض یہ تھا کہ برفاب تو خود برف کا پانی ہے، وہ کیسے پگھلے گا۔ یہاں برف ہونا چاہیے تھا۔ معترض کی بات تو صحیح تھی مگر میں نے سوچا کہ یہ کون شخص ہوسکتا ہے جس کا تصور گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھلنے والے حسیناؤں کے جسم کو چھوڑ کر برف اور برفاب کی لغت میں منجمد ہوگیا۔ مصنف کا نام دیکھا تو رشید حسن خاں لکھا تھا۔ کچھ عرصے بعد شعری زبان کے سلسلے میں اور بحثیں بھی شائع ہوئیں۔ اختر تلہری اور اثر لکھنوی کے ساتھ رشید حسن خاں اکثر گتھے ہوئے پائے جاتے تھے۔ ان تحریروں کو دیکھ کر مجھے ایک دن اچانک بڑا اطمینان ہوا۔ سوچا کہ یہ شخص جس کا نام رشید حسن خاں ہے اپنے اطوار سے اختر تلہری اور اثر لکھنوی سے دس بیس سال بڑا ہی ہوگا۔ چناں چہ جلد مرجائے گا اور فیضؔ کی شاعری کی حسیناؤں کے جسم کی حرارت برف و برفاب کی گردان سے بالآخر محفوظ ہوجائے گی پھر وقت گزرتا گیا۔ میں علی گڑھ سے دہلی آیا اور خواجہ احمد فاروقی صاحب کی عنایت سے دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوا۔ فاروقی صاحب بے حد فعال، سلیقہ مند، سخت ڈسپلن کے عادی

ہونے کے باوجود بڑے خوش مزاج، خوش گفتار اور بردبار انسان تھے۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو نہ صرف قائم کیا بلکہ اس بلندی تک پہنچایا کہ برعظیم کے دوسرے ادارے رشک کرنے لگے۔ یہاں فاروقی صاحب نے اطراف و جوانب سے جمع تو بھانت بھانت کے لوگوں کو کیا مگر سب کو بامقصد کاموں میں لگا دیا اور اردو تحقیق کا رخ ایسے موضوعات کی طرف موڑا جدھر پہلے کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ یہ زمانہ قاضی عبدالودود صاحب کے تحقیقی تبصروں کی مقبولیت کا تھا۔ خود فاروقی صاحب کی میر تقی میر والی کتاب پر وہ پہلے ہی ہاتھ صاف کر چکے تھے۔ انھوں نے ساری اردو دنیا کو دہلا رکھا تھا۔ ہمارا معمولی طالب علم بھی اب بے چارہ علی ہذا القیاس جیسا روزمرہ استعمال کرنے لگا تھا۔ یونی ورسٹی کے اچھے بھلے لوگوں کے دماغوں میں دیکھتے دیکھتے اچانک تحقیق کی رگ پھڑک اٹھتی تھی اور پھر کوئی بھی نارمل نہیں رہ جاتا تھا۔ میں علی گڑھ کا فارغ، رشید صاحب اور سرور صاحب، خورشید الاسلام صاحب مسعود صاحب، جذبی صاحب، خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب جیسے لوگوں کی آنکھیں دیکھے ہوا ہشاش بشاش نوجوان ایسے لمحوں میں ششدر رہ جاتا۔ دہلی آنے کے بعد صبح و شام کی خوش باشیوں میں شامل رہنے والے ساتھیوں میں کوئی حواشی و تعلیقات کے گورکھ دھندے میں پھنسا تھا تو کوئی کسی قدیم مخطوطے کے اول و آخر کے مفقود الخبر ہونے پر سر پیٹتا ملتا اور کوئی کسی کرم خوردہ نسخے کے صفحات کے اندر جھانک جھانک کر آنکھیں دیے دے رہا تھا۔ اکثر تو ان کی بھاشا سن کر ہی میری طبیعت مکدّر ہو جاتی تھی۔ فاروقی صاحب کی شہ پر میں نے بھی ان سب کو منہ چڑھانے کے لیے پہلے ماسٹر رام چندر اور پھر گل کرسٹ پر زور آزمائی کر ڈالی۔ ان دنوں فاروقی صاحب کے دولت کدے پر اکثر محفلیں ہوتی تھیں اور کام کے وقت کام بھی بڑی سنجیدگی سے ہوتا۔ دراصل وہاں کام کا وقت تو چوبیس گھنٹے رہتا تھا۔ ایک دن فاروقی صاحب کے ہاں ایک صاحب ایک کرسی پر الگ تھلگ لیے دیے سے بیٹھے ہوئے اپنا کام کر رہے تھے۔ چہرے مہرے سے کچھ غلط آدمی نہیں لگتے تھے۔ دستور کے مطابق نہایت سلیقے سے چائے آئی اور یہ صاحب بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آئے۔ تعارف ہوا۔ نام رشید حسن خاں بتایا گیا۔ اب یہ روز دکھائی دینے لگے۔ بات آگے بڑھتی گئی اور ہم لوگ کافی ہاؤس میں پابندی سے ملنے لگے۔ مجھے لگا کہ یہ جو بھی شخص ہو، اچھا اور دوست آدمی ہے۔ اسی دوران یہ کھلا کہ یہ وہی برف و برفاب والے رشید حسن خاں ہیں اور اب تک مرکھپ نہیں سکے۔ بس اپنی

تحریروں سے اپنی عمر کے بارے میں دھوکا دے کر دشمنوں کی امیدیں بڑھاتے رہے، مگر ان سے اب کچھ ایسا تعلق ہوا کہ ان کی موت کی خواہش درازیِ عمر کی دعاؤں میں تبدیل ہوگئی۔ اب جب چالیس پینتالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور بیتے ہوئے دنوں کی کمائی پُر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ انمول خزانے ہم نے بھی جمع کیے ہیں ان میں ایک رشید حسن خاں کی دوستی ہے۔

خاں صاحب شاہ جہاں پور کے ہیں اور پٹھانوں کے کسی بڑے اڑیل جرگے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ دوستوں کی دوستی میں وہ کس حد تک جاسکتے ہیں اس کا اندازہ مجھ جیسے دوستوں کو ہے اور دشمنوں سے دشمنی کا اندازہ تو شاید اردو دنیا میں سب ہی کو ہوگا۔ دشمن بنانے کا گُر ہمارے زمانے میں ان سے بہتر کسی کو نہیں آتا۔ ان کا قلم بس خون کا پیاسا رہتا ہے۔ اگر روشنائی لال ہوکر نہ نکلے تو وہ خاں صاحب کا قلم نہیں۔ ایک بار اپنے دفتر میں خالی ہاتھ بیٹھے تھے، برابر میں دہلی کے مشہور خوش نویس زیدی صاحب کسی مسوّدے کی کتابت کر رہے تھے اور خاں صاحب اچھے بھلے حروف کے خم و پیچ میں مین میخ نکالنا شروع کرنے والے ہی تھے کہ میں پہنچ گیا۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ دفتر آتے ہوئے راستے میں کسی نے ان کا قلم اڑا لیا۔ میں نے سنا تو اردو ادب پر اس چور کے احسان پر اظہارِ تشکر کیا۔ خاں صاحب پیچ و تاب کھاتے رہے اور پھر کافی کی پیالی پر معاملہ رفع دفع ہوا۔ خاں صاحب کے اور میرے مزاج میں کوئی بات بھی مشترک نہیں، مگر قدرت نے ہم دونوں میں نہ جانے ایسی کون سی شے رکھ دی ہے کہ آج تک کبھی لڑے نہیں۔ مدتوں بعد جب بھی ملتے ہیں تو بات وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں چھوٹی تھی۔ انھوں نے تحقیق کے میدان میں جو کچھ کیا ہے وہ سب جانتے ہیں اور آئندہ اس کی اہمیت کا اور زیادہ اندازہ ہوگا۔ میرے سامنے انھوں نے جب بھی تحقیق کا موضوع چھیڑا، میں نے اسے ٹال کر اِدھر اُدھر کی باتوں میں انھیں لگالیا اور جب ہم دونوں ساتھ ہوں تو دراصل اِدھر اُدھر کی باتوں میں جی بھی خوب لگتا ہے اور خاں صاحب پیشۂ تحقیق کے باہر ڈھنگ کے لوگوں کی بستی کے آدمی لگنے لگتے ہیں۔ ایک بار طے ہوا کہ کبھی کبھی ہم دونوں اس طرح ملیں کہ کسی تیسرے کا قدم درمیان میں نہ ہو۔ یہ زمانہ وہ تھا جب وہ جوبلی ہال کے کھانے کے انچارج تھے۔ وہ بہترین کھانے بلکہ ایسی نعمتیں پکواتے تھے کہ ہوسٹل والوں نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوں گی۔ لازم تھا کہ ان

کے اس انتظام کا جائزہ لینے کے لیے ان کے دوست بھی وقتاً فوقتاً پہنچتے رہیں۔ چناں چہ ہماری یہ ملاقاتیں بڑی کامیاب رہیں۔ بس دو بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی ہم لوگ بیٹھے کسی نہ کسی بڑے قومی سانحے کی خبر آ گئی۔ ہم نے طے کیا کہ ہمارا اس طرح ملنا قومی مفاد میں نہیں ہے چناں چہ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ان کے ہوسٹل میں بند ہوا۔

خاں صاحب نے مجھ پر ناراض نہ ہونا کیسے سیکھا یہ تو مجھے نہیں معلوم اور یقیناً انھیں بھی نہیں معلوم ہوگا کہ بعض اوقات تعلقات کی نوعیت خود ہی ہر بات کو اس طرح طے کر دیتی ہے کہ اس پر کسی قسم کی تحقیق کی ضرورت نہیں رہ جاتی، مگر انھیں ناراضگی کا سامان بہم پہنچانے میں میں نے بعض اوقات خاصا اہتمام کیا۔ میں جب بھی ملک سے باہر گیا علم و تحقیق کا حیلہ کر کے گیا۔ یہاں دوستوں سے اور کیا کہہ کے جاتا۔ خاں صاحب کی فرمائش ہوتی کہ لندن، پیرس وغیرہ میں زندگی کے عزیز ترین لمحے فلاں کتاب کے فلاں اڈیشن کے فلاں صفحے کی فلاں سطر کے فلاں لفظ کے اعراب گننے میں ضائع کر دوں، گویا میں بھی سفاک حسیناؤں کی جگہ برف و برفاب کے چکر میں کھو جاؤں۔ پٹھان کتنا ہی پڑھ لکھ جائے، مہذب ہو جائے، چالاک بننے کی کوشش کرے مگر اس کی سادہ لوحی نہیں جا سکتی چناں چہ وہ اس کی توقع بھی کرتے رہے کہ میں نے ان کی بات پر کان دھرا ہوگا۔ لوگ مغربی دنیا میں کیا کیا ارمان لے جاتے ہیں، وہاں کی ہوا کھانے والوں کو تو جانے دیجیے جن لوگوں نے یہاں رہ کر صرف وہاں کے خواب دیکھے ہیں ذرا ان کے دل سے پوچھیے۔ مگر خیر! خاں صاحب مجھے اتنے عزیز ہیں کہ جہاں بھی رہا انھیں یاد کرتا رہا۔ کتب خانوں کے باہر کی دنیا میں بھی وہ نہ جانے کتنے موقعوں پر یاد آئے۔ ان کی فرمائش کو بھی میں بھولا نہیں۔ جب لندن سے پیرس سدھارنے کا وقت آیا تو لندن میں میرے ایک ہمدم و ہمراز بلکہ شکیب خاطر اہلِ وفا ہیں جنھیں اہلِ دنیا ضیاء الدین شکیب کہتی ہے اور میرے زمانۂ طالب علمی کے دوست اور دیارِ غیر میں میرے اکیلے سرپرست ہیں۔ تحقیق کے سمندر میں گلے گلے ڈوبے ہوئے لندن کے کتب خانوں کی الماریوں کے اندر تک اترے ہوئے ان سے خاں صاحب کی فرمائش کا ذکر کیا تو اُنھوں نے بڑی ہمدردی کے ساتھ یہ ذمے داری قبول کی کہ میرے جانے کے بعد وہ خاں صاحب کو ان کے مطلوبہ مسودات کی نقل بھیج دیں گے۔ مجھے اطمینان ہوا کہ خاں صاحب کو خوش کرنے کا بہانہ مل گیا، مگر جس طرح میں اپنے شکیب کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اسی طرح خاں صاحب مجھے جانتے ہیں۔ چناں چہ ہم

سب دوست مطمئن رہے مگر پٹھان دوست ہی کیوں نہ ہو، حساب تو ہمیشہ بے باق رکھتا ہے۔ اُدھار کبھی نہیں چھوڑتا۔ چناں چہ باغ و بہار کے مقدمے میں دو چار فقرے لگا ہی گئے۔ یہ بھی محض ان کی شرافت اور ہماری بے لاگ دوستی کی دلیل ہے۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک خاں صاحب اس کی ساری علمی و ادبی فتوحات کو مٹی میں ملا چکے ہوتے۔

خاں صاحب دراصل مخصوص صحبتوں کے آدمی ہیں، مجمعے جم گھٹے کے نہیں۔ حالاں کہ اگر مجمع انھیں مل جائے جو اکثر سمیناروں یا جلسوں میں مل بھی جاتا ہے تو انھیں بہت بُرا بھی نہیں لگتا کہ وہ ایسے موقعوں سے لوگوں کو ڈرانے ہڑکانے کا کام لیتے ہیں اور خصوصاً نوجوان جو اُن سے پہلے پہل ملے ہوں یا کم ملے ہوں بالکل ہی ڈھیر ہو جاتے ہیں مگر خاں صاحب اتنے بھیانک ہیں نہیں جتنے وہ خود لگنا چاہتے ہیں۔ میری طرح وہ بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ رکھنا تو پسند نہیں کرتے پھر بھی ان کے دوستوں کا حلقہ اچھا ہے اور اپنی صحبتوں کے اعتبار سے معتبر لگتے ہیں اور ہم لوگوں کے ساتھ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے خاص طور سے اپنے بزرگ غلام ربانی تاباں صاحب بہت یاد آتے ہیں کہ مخصوص ترین صحبتیں وہی تھیں جہاں تاباں صاحب بھی ہوتے تھے۔ پٹھانوں میں ایک قبیلہ ایسا ہے جس نے اپنے نام کے ساتھ پٹھان ہونے کی علامت کو باقی نہیں رہنے دیا۔ شاید اس لیے کہ سماج نے ان کی ہر ادا سے خود بخود پہچان لیا کہ وہ نہ صرف پٹھان ہیں بلکہ بالکل اصیل۔ پھر اگر وہ محقق اور نقاد نہ ہوں تو انھیں لوگوں کو ڈرانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تاباں صاحب ایسے ہی پٹھانوں میں تھے، بڑے نوک پلک کے شاعر، شفیق بزرگ، بے حد رواداراور صبر وضبط کے عادی۔ ان کی زیادہ تر خصوصیات شاید بائیں بازو کی تحریکات کے ڈسپلن میں ایک عمر گزارنے کی بدولت ان میں آئی تھیں۔ خاں صاحب ٹھہرے گھور محقق اور ترقی پسندی کے گھنگھور دشمن۔ وہ بے تکلف صحبتیں پُر لطف چشمکوں سے بڑی خوشگوار اور جاندار ہو جاتیں اور لاکھ کوشش کے باوجود دو پٹھانوں کا متحدہ محاذ نہ بن پاتا کہ دوسرے اہلِ بزم ان کی زد پر آسکتے۔

خاں صاحب کے بارے میں میرے کہنے اور نہ کہنے کے لائق ابھی ہزاروں باتیں ہیں جنھیں ان سے زیادہ کون جانتا ہے مگر بہر حال ہیں تو وہ اپنے آدمی، اس لیے فی الحال یہیں پر بس کرنا مناسب ہے۔

○○

قمر رئیس

رشید حسن خاں —— رفیق اور دوست

ہمارے عہد کے سب سے معتبر محقق رشید حسن خاں بھی رخصت ہو گئے۔

25 فروری 2006 کی رات میں ڈھائی بجے ان پر قلب کا تیسرا حملہ ہوا۔ وہ گھبرا کر اٹھے، قے ہوئی۔ پاس کی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ گھر کے لوگ اٹھ کر آ گئے اور چند منٹ میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ آخری وصیت، طبی مشورے اور معالجے کی مہلت بھی نہ ملی۔☆ حسبِ عادت دن میں وہ کام کرتے رہے۔ کچھ ملنے والوں سے دیر تک باتیں بھی کیں۔ برسوں سے وہ ایک بڑے پروجیکٹ ''لفظیاتِ غالب'' پر کام کر رہے تھے۔ کوئی لفظ غالب کے یہاں کب، کہاں کس سیاق میں، کن معنوں میں استعمال ہوا ہے تقریباً ایسے ایک ہزار نو سو الفاظ انھوں نے جمع کر لیے تھے۔ بہت فخر سے اپنے اس آخری کارنامے کا ذکر کرتے تھے۔ مگر وہ جو شاعر نے کہا ہے:

زندگی اک شمع ہے جلتے ہوئے بجھ جائے گی

اردو املا، زبان و قواعد، تلاش و تعبیر اور کلاسیکی ادبی سرمایے کی بے شمار و قیع کتابوں، جیسے فسانۂ عجائب، انتخابِ ناسخ کے متن کو مثالی صحت اور حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کرنے والے اس نامور محقق نے ہند و پاک کی دانش گاہوں کے اساتذہ، طلبہ اور علما کے لیے تحقیق، متنی تنقید اور علمی تلاش و تعبیر کے جو معیار مقرر و متعین کیے ہیں شاید اس میدان میں معاصرین میں کوئی ان کا مقابل اور ہمسر نہیں تھا، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو ہمیشہ انھوں نے اپنے گرو کا درجہ دیا اور ان سے سیکھنے کا اعتراف کیا ہے۔ رشید صاحب مرحوم کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی قدر شناسی کا کام تو برسوں جاری رہے گا۔ اس

☆ رشید صاحب کے خاص مقرب اختر شاہجہانپوری نے فون پر اطلاع دی۔

معاملے میں مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے اور مجھے امید نہیں کہ ان کے سرمایۂ تحقیق کا محاکمہ کرنے والا کوئی دیدہ ور عالم آسانی سے دستیاب ہو سکے گا۔ اس لیے کہ بقول شاعر:

شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اس لیے میں چاہوں گا کہ اس وقت ان کی شخصیت کا ایک ایسا سرسری سا خاکہ پیش کرسکوں جو دکھا سکے کہ ان کے ذوقِ علم کا سفر کن دشوار مرحلوں سے گزرا۔ ان کے جن بیشتر اور معاصر علما نے تحقیق کے میدان میں ان کی رہبری کی ان میں مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، عبدالستار صدیقی، مولانا امتیاز علی عرشی اور محی الدین قادری زور کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ وہ اکابر شخصیتیں ہیں جو اشرافیہ اور اعلیٰ علم دوست خانوادوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی تعلیم اعلیٰ تعلیمی اداروں اور بعض کی یورپ کی دانش گاہوں میں ہوئی تھی۔ علمی تحقیق کا کام یکسوئی اور لگن سے کرنے کے لیے انھیں بے شمار سہولتیں اور آسائشیں مہیا تھیں، لیکن رشید صاحب مرحوم کی ذات علمی کام کی سہولتیں تو بڑی بات ہے، زندگی کی ادنیٰ سہولتوں سے بھی محروم تھی۔

رشید صاحب میرے ہم وطن تھے۔ اور نوعمری میں یعنی 1949 میں جب میں نے گاندھی فیض عام کالج میں انٹر میں داخلہ لیا تبھی ان سے میرا تعارف ہوا۔ عمر میں وہ مجھ سے کم از کم سات آٹھ سال بڑے تھے (ان کے ریکارڈ میں درج تاریخ ولادت 10 جنوری 1930 صحیح نہیں) ان سے جب میری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا وہ محلّہ لال املی کے پاس واقع مدرسہ فیض عام میں مدرس تھے۔ شعر و ادب کا اچھا ذوق تھا اور شہر میں ان کے علم کی دھاک تھی۔ انھوں نے شہر کے مشہور مدرسہ بحرالعلوم میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے والد امیر حسن خاں سپاہی تھے اور بقول رشید حسن خاں انھوں نے ترکِ موالات کی تحریک سے متاثر ہوکر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی عسرت میں زندگی بسر کی۔ ان کے بچے اسکول کی تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہے۔ نوعمری میں رشید صاحب برسوں آٹا پیسنے کی چکی پر ملازم رہے۔ شہر میں فوجی لباس تیار کرنے کی ایک آرڈیننس فیکٹری تھی، اب بھی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں اس میں سیکڑوں مزدوروں کی نئی بھرتی ہوئی تو رشید صاحب کو بھی عارضی سرکاری نوکری مل گئی۔ یہاں کچھ اشتراکی نظریے کے ٹریڈ یونین لیڈروں سے ان کی دوستی ہوئی اور وہ فیکٹری کی ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں فعال ہو گئے۔ بائیس دن کی فیکٹری میں ہڑتال ہوئی۔ اس دوران جنگ ختم ہو گئی اور ہزاروں مزدوروں کو

بیک جنبشِ قلم نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ رشید صاحب بھی بے روزگار ہو گئے۔

شہر میں شاعروں کی کثرت تھی۔ ان کے الگ الگ اکھاڑے تھے۔ شعرا میں باہمی چشمکیں تھیں۔ آئے دن مشاعرے ہوتے تھے۔ رشید صاحب اگر کسی مشاعرے میں پہنچ جاتے تو استاد شاعر بھی ڈر جاتے۔ وہ زبان و بیان کی خامیوں پر برسرِ مشاعرہ ٹوک دیتے تھے۔ فنِ عروض و بیان پر ان کی گہری نظر تھی۔ شعر گوئی میں نے بھی شروع کر دی تھی۔ رشید صاحب نے مجھے ایک استاد شاعر حضرت عابد شاہجہانپوری سے ملوایا اور اصرار کیا کہ اپنا کلام انھیں دکھاؤں۔ میں نے دو غزلیں انھیں بغرضِ اصلاح و مشورہ دیں لیکن ان کی لفظی اصلاح سے اطمینان نہیں ہوا اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تاہم ان سے اور رشید صاحب سے دوستانہ مراسم قائم رہے۔ رشید صاحب نے اس دوران مولوی وغیرہ کے کچھ اورینٹل امتحانات پاس کیے۔ ان کی بنیاد پر غالباً 1956 کے آس پاس ان کا تقرر فارسی استاد کی حیثیت سے اسلامیہ اسکول میں ہو گیا۔

58-1957 میں جب میں علی گڑھ میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا اور جامعہ اردو کا ماہنامہ 'ادیب' ترتیب دے رہا تھا تو رشید صاحب سے لکھوا کر میں نے ان کے کئی مضامین 'ادیب' میں شائع کیے، ان میں ایک مضمون 1857 کی بغاوت پر تھا۔ اسی زمانے میں رشید صاحب نے 'اغلاط اللغات' کے عنوان سے ایک طویل مضمون انجمن ترقی اردو (ہند) کے جریدے 'اردو ادب' میں اشاعت کی غرض سے مجھے بھیجا۔ میں نے مضمون آل احمد سرور صاحب مدیر رسالہ کو اس امید کے ساتھ دیا کہ وہ اسے ضرور شامل کریں گے۔ لیکن چار پانچ مہینے تک پاس رکھ کر مضمون انھوں نے مجھے واپس کر دیا۔ مجھے تکلیف ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ مجھے یقین تھا کہ سرور صاحب نے مضمون پڑھنے کی زحمت نہیں کی کیوں کہ ان کے نام سے بھی وہ آشنا نہیں تھے۔ میں مضمون لے کر اپنے استاد معظم رشید احمد صدیقی کے پاس گیا۔ ان سے التجا کی کہ وہ اسے ضرور پڑھیں اور پسند آئے تو سرور صاحب کو 'اردو ادب' میں اشاعت کے لیے بھیج دیں۔ وہ انجمن کی مجلسِ عاملہ کے رکن تھے۔ انھوں نے مضمون پڑھ کر اپنی سفارش کے ساتھ سرور صاحب کو بھجوا دیا۔ اور اس طرح اس طویل تحقیقی مضمون کی پانچ چھ قسطیں 'اردو ادب' میں سائع ہوئیں۔ میرا خیال ہے کہ رشید صاحب کا یہ پہلا عالمانہ مضمون تھا جس نے اردو کے اہلِ نظر کو متاثر کیا۔

1959 میں میرا تقرر دہلی یونیورسٹی میں ہو گیا تو صدر شعبہ خواجہ احمد فاروقی نے ایک

دن مجھ سے کہا کہ انھیں شعبے کے تحقیقی پروجیکٹ کے لیے ایک ایسے اسکالر کی ضرورت ہے جو عربی اور فارسی سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ میں نے فوراً رشید صاحب کا نام لیا اور ان کے تجرِ علمی کی تعریف کی۔ شاید 'اردو ادب' میں انھوں نے ان کا مقالہ پڑھا تھا۔ چند منٹ سوچ کر انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ابھی تار گھر جایئے اور رشید صاحب کو تار دیجیے کہ اگر ڈیڑھ سو ماہانہ (جہاں تک یاد پڑتا ہے یہی رقم تھی) مشاہرے پر انھیں یونیورسٹی کی یہ ملازمت منظور ہو تو فوراً آ جائیں۔ تار رشید صاحب کو ملا اور وہ دوسرے ہی دن صبح کو دہلی پہنچ کر دریا گنج میں میری قیام گاہ پر آ گئے۔ میں انھیں فاروقی صاحب کے پاس لے کر گیا اور چند روز بعد آ کر انھوں نے ریسرچ اسسٹنٹ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

یہاں سے ایک اسکالر اور عالم کی حیثیت سے رشید صاحب کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ شعبے کے تحقیقی کاموں کے علاوہ وہ تحقیقی مجلّہ 'اردوئے معلّٰی' کی ترتیب وطباعت کا کام بھی دیکھتے تھے۔ شعبے سے تذکرۂ سرور، گنج خوبی (میر امن) اور دیوانِ بقا جیسی کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کی ترتیب میں بلاشبہ رشید صاحب کی محنت کا حصہ بھی رہا ہے۔ شعبے میں خواجہ احمد فاروقی صاحب مرحوم نے انھیں تحقیقی کام کرنے کے لیے جملہ سہولتیں فراہم کر دی تھیں، ان سے انھوں نے فائدہ بھی اٹھایا۔ شعبے سے زیادہ وہ اپنے ذاتی علمی کاموں پر توجہ دیتے رہے۔ چھ سال تک میں صدر شعبہ رہا تو میں نے بھی ان کو ذاتی کام کرنے کی پوری آزادی دی۔ ان کا کمرہ کچھ فاصلے پر دوسری عمارت میں تھا۔ اگر ان سے کسی معاملے میں مشورے کی ضرورت درپیش ہوتی تو ہمیشہ ان کو اپنے کمرے میں بلانے کے بجائے میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔ بعض رفیقوں کی شکایت کے باوجود میں نے کبھی کسی معاملے میں ان سے محاسبہ نہیں کیا۔

رشید صاحب کی علمیت اپنی جگہ، لیکن ان کی ذات میں ہمیشہ مجھے ایک طرح کی بے چینی، تلخی، بیزاری اور برگشتہ دلی کا شدت سے احساس ہوا۔ ابتدا میں مدت تک وہ منفی نکتہ چینی پر آمادہ رہتے تھے۔ کسی علمی کام یا کسی مشہور ادبی شخصیت کو Demolish کر کے انھیں جو داد ملتی تھی اس سے وہ خوش ہوتے تھے۔ شاید اس معاملے میں ان پر قاضی عبدالودود صاحب کے موقف کا بھی اثر تھا۔ لیکن قاضی صاحب کی گرفت علمی ہوتی تھی۔ رشید صاحب کی تحریروں میں بت شکنی کا جذبہ کچھ تلخی پیدا کر دیتا تھا۔ اس سلسلے میں میں نے کئی بار ان کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ وہ پٹھان تھے۔ کبھی کبھی انتقامی

جذبہ بھی ان پر حاوی ہو جاتا تھا۔ مثلاً آل احمد سرور صاحب سے انھیں کچھ شکایات تھیں۔ نتیجے میں ان کی نگرانی میں ترتیب پانے والی 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' کی ابتدائی جلدیں جب شائع ہوئیں تو انھوں نے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے۔ بے شک تحقیق کی جن چھوٹی بڑی غلطیوں کی انھوں نے گرفت کی وہ صحیح تھی لیکن یہی کام اگر وہ ہمدردانہ اور تعمیری جذبے سے انجام دیتے تو وہ انداز زیادہ علمی ہوتا۔ اسی طرح خواجہ احمد فاروقی صاحب ان کے عہدے میں اضافہ اور ترقی کے معاملے میں ان کے مطالبات پورے نہیں کر سکے۔ اس کا بڑا سبب ان کی رسمی تعلیمی اسناد کی کمی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 'تذکرۂ سرور' جو فاروقی صاحب کے نام سے شائع ہوا اور جس کی ترتیب میں علمی معاون کی حیثیت سے رشید صاحب نے بڑی مدد کی اس میں کچھ ایسے کھانچ چھوڑ دیے گئے یا رہ گئے کہ قاضی عبدالودود صاحب نے سختی کے ساتھ ان کی گرفت اور نکتہ چینی کی اور شعبے کے لوگوں کو کہنا پڑا کہ رشید صاحب نے اپنے منصبی فرائض ادا کرنے میں کوتاہی برتی۔ دراصل رشید صاحب کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ اسکول اور یونیورسٹی نیز انگریزی زبان کی تعلیم سے محرومی نے انھیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور اگرچہ اکیڈمیوں اور اعلیٰ علمی اداروں نے انھیں انعامات اور اعزازات سے نوازنے میں کوتاہی نہیں کی لیکن اس احساس کی گرانی سے وہ نجات نہ پا سکے۔ بہرحال یہ ایسے مسئلے ہیں جن پر گفتگو ہوتی رہے گی۔ دہلی میں ان کے قیام کے آخری زمانے میں ان کے اندر کی تلخی اور تناؤ میں کچھ کمی ضرور آ گئی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انھوں نے اعلیٰ معیار کے کچھ مثبت تحقیقی اور علمی کام انجام دیے۔ کئی کلاسیکی کتابوں کے متن مثالی صحت اور تنقیدی تعارف کے ساتھ شائع کیے۔ یہ بھی سچ ہے کہ انھیں کچھ ایسے خوش ذوق شعرا اور شاعرات کی صحبتیں میسر آ گئی تھیں جن کے ساتھ وہ گل رنگ شامیں گزارتے اور خوش رہتے تھے۔ اس سچائی سے انکار بھی مشکل ہے کہ ایسا علمی تبحر رکھنے والے اور صرف اپنی لگن، جانفشانی اور علمی انہماک سے شہرت اور ناموری کی ایسی ارفع منزلوں تک پہنچنے والے اسکالر اردو میں اب مشکل ہی سے پیدا ہو سکیں گے۔

○○○

خاں صاحب

رشید حسن خاں

تعلیمی اداروں کے سامنے سے جو سڑکیں گزرتی ہیں اُن پر اسپیڈ بریکر ضرور لگا ہوتا ہے۔ یہ ایک احتیاطی تدبیر ہے غیر محتاط سواریوں کی تیز رفتاری پر روک لگانے کی۔ دن کے اجالے میں تو خیر اپنی جان پر کھیلے بغیر راہ گیروں کی جان سے کھیلنے والے حوصلہ مند ڈرائیور بھی اسپیڈ بریکر کا کچھ لحاظ رکھتے ہیں، لیکن شام ہوتے ہی سڑک پر آمد و رفت کم ہونے اور اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ان جی داروں کی سوائی امنگیں اور دبی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ چوری چھپے اسپیڈ بریکرز کے دائیں بائیں جہاں گنجائش نظر آئی، اپنی رفتار کم کیے بغیر پہلو بدل کر تیزی سے نکل جاتے ہیں۔ انھیں بس اپنی منزل پر پہنچنے کی دُھن ہوتی ہے۔ راہ گیروں کے جان مال کی پروا کرنا، ہو نہ ہو، اپنی پیشہ وارانہ مہارت پر شک کرنا ہے۔

ہمارے تعلیمی اداروں میں علم اور فضیلت کے مناصب پر فائز اکثر اصحاب ان ڈرائیورز سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ پاؤنڈ کا کہنا تھا کہ ناقص اور بے اثر دوائیاں بنانے والا تو سماجی مجرم سمجھا جاتا ہے، مگر ناقص رویّوں اور خیالات اور معلومات کی اشاعت کرنے والے 'عالم اور دانش ور' صاف بچ نکلتے ہیں، جب کہ اُن کا وار منافع خور دوائی کمپنیوں کے وار سے آگے جاتا ہے۔ یہ اصحاب ہر معنی میں 'استاد' ہوتے ہیں۔ سینے پر پتھر رکھ کے جلسوں جلوسوں، سازشوں، خوشامدوں اور نمائشی تقریبوں جیسے نشہ آور مشغلوں سے وقت نکال کر یہ اصحاب جو بے مثال کتابیں لکھتے (لکھتے کم ترتیب دیتے زیادہ) یا چھپواتے رہتے ہیں ان کی حیثیت بقول ہمارے خاں صاحب کے اینٹ پتھر کی ہوتی ہے۔ ان پر پاؤں رکھ کر یہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ انھیں رُک رُک کر چلنے، سوچنے اور اپنے عمل کا محاسبہ کرنے کی عادت نہیں

ہوتی۔ ڈی۔ ٹی۔ سی۔ کے ڈرائیورز کی طرح یہ مخلوق بھی اسپیڈ بریکرز سے شدید نظریاتی اختلاف رکھتی ہے۔ انھیں خاطر میں نہیں لاتی، چناں چہ تیزی سے ترقی کرتی جاتی ہے۔

اور اسی لیے ہمارے تعلیمی اور فکری معاشرے میں اسپیڈ بریکرز کم ہیں، ڈرائیورز بے شمار۔ یہ دور ترقی کا ہے۔

رشید حسن خاں کے بارے میں جب بھی سوچا، خیال آیا کہ ہماری دانش گاہوں کی تعداد اور علما کی آبادی جس بے مہار طریقے سے بڑھ رہی ہے اس کے حساب سے صرف ایک خان صاحب کافی نہیں۔ مگر کیا کیا جائے؟ ایک تو یہ کہ خاں صاحب کا ثانی ملنا مشکل، دوسرے یہ کہ بھولے بھٹکے ایسا کوئی معجزہ ظہور میں آ بھی جائے تو خاں صاحب اُسے چھوٹ دینے کے نہیں۔ خاں صاحب ان لوگوں میں ہیں جو اپنی غلط کاری پر بھی 'بزن' کہنے سے نہ چوکیں گے۔

ہم نے پست معیاری، کم علمی، کورذوقی، دنیاداری اور کاروباری ذہنیت سے سمجھوتے کا ایک دنداں شکن جواز مہیا کرلیا ہے۔ یہ کہ سب چلتا ہے۔ یا یہ کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہوتے رہنا بہتر ہے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ بزرگوں کی خطا کو خطا ماننے میں تو خیر ہمارے قومی اخلاق و آداب پر حرف آتا ہے، معاصرین کی کوتاہی پر گرفت کو بھی ہم تنگ دلی سمجھنے لگے ہیں، یہ خیال کیے بغیر کہ بعض کوتاہیاں صرف ذاتی نہیں ہوتیں اور ان کا عذاب اجتماعی ہوتا ہے۔ روایت کی یہ پاسداری اور کشادہ ظرفی، علم کی اخلاقیات کے منافی ہو تو ہو، ترقی بازی اور دنیا سازی سے خوب میل کھاتی ہے۔

خاں صاحب ذاتی ترقی کے دشمن ہیں، اپنی ذات تک شاید اسی لیے باقر مہدی سے ان کی دوستی ہے۔ مجھے دونوں پسند ہیں۔ اس لیے بھی کہ دونوں ایک دوسرے کے قائل ہیں۔ دونوں دوست دشمن کسی سے سمجھوتے کے قائل نہیں اگر معاملہ اصول کا ہو۔ دونوں کا نام لیتے، ہم نے کئی لوگوں کو اکثر اس طرح دیکھا ہے گویا شاک لگ گیا ہو۔

یہ شاک ٹریٹمنٹ ناگزیر ہے۔ ہمارے ذہنی اور اجتماعی کلچر کی ضرورت بھی ہے۔ ہمارے حواس سُن ہوتے جارہے ہیں۔ عام زندگی کی طرح علم اور ادب کے معاملات میں بھی ہم صحیح اور غلط، نیک اور بد کی تمیز کھوتے جارہے ہیں۔ تشویش یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ اس خسارے کا احساس بھی روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔ ہمارا اردو معاشرہ اگر ان ایک خاں صاحب اور ایک باقر مہدی سے بھی محروم ہوتا تو کیا ہوتا!

رشید حسن خاں سے جب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں سوچتا تھا کہ کوئی سر کہ جبیں محقق ہوں گے۔ دنیا سے بیزار، اپنے آپ میں گرفتار، کرم خوردہ کتابوں کے ہجوم میں بیٹھے 'بزن بزن' کرتے رہتے ہوں گے۔ ہمارے یہاں محقق کا امیج ہی جرائم کی تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر کا ہے۔ یوں قبلہ مسعود حسن رضوی صاحب اور عرشی صاحب جیسے محقق اور عالم بھی تھے جن کی نرم خوئی اور خوش ذوقی مسلّم ہے۔ مسعود صاحب کی باتیں تو میں نے گھنٹوں سُنی ہیں اور سوچتا رہا کہ معلومات سے قطع نظر زبان کے رس اور جس کا جو مزہ اس گفتگو میں ہے، اسی سے زبان کے ذوق کی تربیت ہوسکتی ہے۔ لیکن بعض محققوں کا اپنا تجربہ یہ بھی تھا کہ کتبے تو صحیح پڑھ لیتے تھے۔ شعر غلط پڑھتے تھے۔ زندہ شعر اور جاگتی ہوئی کتاب کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ کسی اخبار یا رسالے کو بھی اسی وقت لائقِ مطالعہ سمجھتے تھے جب کاغذ مٹ میلا ہو جائے اور اس سے کچھ کافور کی سی بو آنے لگے۔ انھیں اپنے زمانے کے ادبی مسئلوں سے زیادہ کباڑیوں کی دکانیں اپنی طرف کھینچتی تھیں۔

لیکن یہاں ایک اعتراف۔ ایلیٹ کے اس قول پر میرا یقین بہت پختہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی تحقیق بھی ادب کو اور ادب کی تاریخ کو سمجھنے میں کسی نہ کسی طور پر معاون ہوسکتی ہے۔ کم سے کم ہمارے ذوق کو بگاڑتی تو نہیں، اسی لیے محقق کے وجود سے مجھے کوئی بے کلی نہیں ہوتی۔ وحشت ہوتی ہے تو اس نقاد سے جس کی بے توفیقی کا صدمہ بعض اوقات ادیبوں کی اور ادب پڑھنے والوں کی پوری نسل کو جھیلنا پڑتا ہے۔ یوں بھی چوں کہ مجھے تحقیق کا ہنر نہیں آتا اس لیے استفادے کی خاطر میں تحقیقی تحریریں ضرور پڑھتا ہوں، یہ سوچ کر کہ اس دانائے راز کو وہ کچھ معلوم ہے جو مجھے نہیں معلوم۔

اور خاں صاحب سے تو پہلی ہی ملاقات میں یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ محقق ہوں تو ہوں، ادب سے ان کا رشتہ بہت سچا ہے۔ خاں صاحب کی زندہ دلی، خوش مذاقی اور وسیع المشربی کی بنیادیں اتنی پکّی ہیں کہ تحقیق کا جوش بھی انھیں ہلا نہیں پاتا۔ دلّی آنے کے بعد ایک روز جامعہ کی کسی تقریب میں دوستوں سے غپ شپ جاری تھی۔ ادھیڑ عمر کے ایک بزرگ، بند گلے کا کوٹ پتلون پہنے، نک سک سے درست، نکھرے نکھرے اور بشاش صورت اس منڈلی میں شامل ہوگئے، ہم ایک دوسرے سے روشناس نہیں تھے۔ کچھ دیر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں ہوئی۔ پھر اچانک خاں صاحب نے کہا ''بھئی! سنا ہے شمیم حنفی صاحب علی گڑھ سے یہاں آگئے ہیں، ان سے ملاقات نہیں ہوئی''۔ ہم خاں صاحب کی رواداری پر حیران

ہوئے۔ خوش بھی ہوئے کہ اُن پر محقق ہونے کا گمان تک نہ تھا۔ ہما شما کا کیا ذکر، ایسے ایک بزرگ کو میں نے عسکری صاحب کے نام سے بھی ناواقف پایا تھا۔

ہم دوستوں کے حلقے سے ذرا ہٹ کر باتیں کرنے لگے۔ خاں صاحب کی ہر بات میں ذہانت اور خوش طبعی کا اظہار اور ایک رچی ہوئی، شائستہ خود اعتمادی جو لجلجے انکسار کے مقابلے میں ہمیشہ بہتر نظر آتی ہے۔ وہ جو بیشتر نادیدہ اصحاب کی کتابیں پڑھ کر اور ان سے دوبدو مل کر ایک پریشان کُن فرق محسوس ہوتا ہے۔ خاں صاحب کے سلسلے میں محسوس بھی ہوا تو ایک دوسری سطح پر۔ مجھے ان کی تحریریں اچھی لگتی تھیں۔ عام محققوں کے برعکس یہ تحریریں کُند نہیں ہوتی تھیں۔ مجھے ان میں اُس پرکشش قوت کا احساس ہوتا تھا جو شخصیت کے کھرے پن اور فکر کی دیانت داری سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ خاں صاحب کی تحقیقات کا مقصد دوسروں کو بے حرمت کرنا نہیں بلکہ علم و ادب کی حرمت کو بچائے رکھنا ہے۔ لیکن ان کا جو خاکہ ذہن میں تھا وہ کچھ ڈراؤنا بھی تھا۔ یہ ڈر نہیں تھا کہ خاں صاحب ہماری کسی تحقیق کو رد کر دیں گے۔ ہم سے ایسا کوئی کارنامہ سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ خاں صاحب جس اردو املا کے وکیل ہیں اس کی رو سے ہمارا املا درست نہیں تھا۔ ہم سوچتے تھے کہ پرانی وضع کے بزرگ ہوں گے۔ زیادہ تر پینک میں رہتے ہوں گے۔ ادب پر باتیں کرتے ہی نہ ہوں گے اور کرتے بھی ہوں گے تو اس طرح جیسے ریاضی کا فارمولا بیان کر رہے ہوں (بعض علمائے ادب کتاب میں اعداد، الجبرا اور اقلیدس کے نشانات، گرافس کا استعمال بہت کرتے ہیں) کسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوں گے۔ مردم آزار نہ سہی مردم بیزار ضرور ہوں گے۔ مگر یہاں تو قصہ ہی دوسرا تھا۔ خاں صاحب فٹ بال کے کسی ٹورنامنٹ کی روداد لے بیٹھے۔ اندازہ ہوا کہ کھیل سے بھی دلچسپی ہے، کھلاڑیوں سے بھی۔ ہاکی، فٹ بال، والی بال غرض کہ مردانہ کھیل خاں صاحب کی طبیعت سے بہت مناسبت رکھتے ہیں۔ میں نے اس وقت تک ایسا ایک ہی شخص دیکھا تھا۔ بلراج مینرا، جو اسپورٹس اور ادب سے یکساں باخبر ہو اور کرکٹ کا میچ اس سنجیدگی سے دیکھتا ہو جس طرح وہ دستوئیفسکی کی کتاب پڑھتا ہے۔ خاں صاحب اس نوعیت کی دوسری مثال تھے۔ کھیلوں کے سلسلے میں ان کی معلومات وسیع تھیں تحقیق کی طرح وہ ان کے داؤ پیچ بھی جانتے تھے۔

ایک بار کسی ادبی مذاکرے میں خاں صاحب پاس ہی کی نشست پر بیٹھے ملے۔ مقرر

یا مقالہ نگار نے ڈھنگ کی باتیں کیں تو سنجیدگی سے سنتے رہے۔ جہاں اول فول شروع ہوئی خاں صاحب نے بھی رنگ کمنٹری شروع کردی۔ پھر جلدی جلدی پرچے پر کچھ لکھا۔ پرچہ میری طرف بڑھایا —— حالاتِ حاضرہ پر منظوم تبصرہ تھا، اس زبان میں جسے سننے کی تاب بقول جوشؔ پلپلے معاشرے میں نہیں ہوتی۔ اس روز یہ راز کھلا کہ خاں صاحب طبیعتوں کی طرح شعر بھی موزوں کرسکتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اپنی حد سے بڑھی ہوئی صاف گوئی (جو بہتوں کو جارحیت دکھائی دیتی ہے) کے باوجود خاں صاحب کی شخصیت میں موزونیت بہت ہے۔ بے ڈھنگا پن ان کی تحریر وتقریر، بود و باش میں کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ دلّی یونیورسٹی گوائر ہال کے ایک ایسے حصے میں رہتے ہیں جس کے گرد و پیش کا سارا ماحول دفتری ہے۔ ایک شام تاباں صاحب، صدیق الرحمٰن قدوائی اور انور صدیقی کے ساتھ ہم وہاں گئے تو خیال آیا کہ یہ جگہ خاں صاحب جیسے نستعلیق اور مشرقی مزاج رکھنے والے اسکالر کو کیا راس آتی ہوگی۔ دو کمرے خاں صاحب کی تحویل میں تھے۔ پہلا کمرہ خاں صاحب کا کتب خانہ، دوسرا کمرہ بھی کتاب خانہ۔ سردیوں کے دن تھے، خاں صاحب کوٹ پتلون اوورکوٹ میں ملفوف ملے، جیسے دفتر میں بیٹھے ہوں۔ اس ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ۔ اردو املا، تحقیق، یونیورسٹیوں کے شعبے، فسانۂ عجائب، اثر لکھنوی، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالودود اور حافظ محمود شیرانی —— ایسی کئی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ہم بالآخر اپنے حال کو پہنچے تو وہاں بھی خاں صاحب اتنے ہی نیچرل۔ غزل، پھر ہزل، پھر یہ قافیہ اور آگے تک گیا۔ شام اچھی گزری۔ خاں صاحب نے اہتمام بہت سلیقے سے کیا تھا۔ واپسی پر راستے میں ایک شعر یاد آیا:

تمام عمر مجرد رہا ابو ریحاں
کہ کارِ لوح و قلم میں کہیں خلل نہ پڑے

تاباںؔ صاحب نے فرمایا ”خاں صاحب بال بچوں والے آدمی ہیں، بچے شاہ جہانپور میں رہتے ہیں اور خاں صاحب دلّی میں“۔

خاں صاحب کا علمی انہماک اور کام سے ایسا شغف جو دنیا کی کسی فکر کو غالب نہیں آنے دیتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ:

منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

ایک زمانے میں خاں صاحب خاصے سرگرم کارکن تھے۔ کہاں ٹریڈ یونینزم کے وہ ہنگامے جو خاں صاحب کا ماضی تھا، کہاں علمی تلاش و تحقیق کی تنہا سرگرمی جو خاں صاحب کا حال ہے۔ مگر خاں صاحب کتابوں کے ہجوم میں باہر سے اور اندر سے اتنے آباد نظر آئے کہ ایک پل کے لیے بھی کسی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ ان کی شخصیت اتنی مرتب ہے کہ اس پر ایسے کسی سفر کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یوں بھی ہم یہی سمجھتے ہیں کہ شاعر و ادیب چاہے لوگ اپنی مشقت اور دوسروں کی مروت سے بن جاتے ہوں، محقق ہمیشہ پیدائشی ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے ایک خاص ذہنی رویے کی۔ خاں صاحب علم و ادب ہی نہیں، ہر معاملے میں متشکک ہیں اور تشکیک بہرحال علم کی اساس ہے۔ کارل مارکس کا سب سے پسندیدہ مقولہ یہی تھا کہ ہر حقیقت پر شک کرنا سیکھو۔ یہ اور بات کہ خود مارکس کے مقلدوں نے مطلقیت کے چکر میں یہ دولتِ اضطراب کھودی۔ اب اپنے آپ میں آسودہ ہیں، مگر خاں صاحب ٹریڈ یونینزم کے پھیر میں پڑنے کے بعد بھی اپنے تئیں یا کسی بیرونی جبر کے تئیں خوش گمانی میں مبتلا ہونے سے بچے رہے اسی لیے آزاد دکھائی دیتے ہیں۔

اپنی آزادی کے سلسلے میں خاں صاحب ہمیشہ چوکنے رہتے ہیں۔ میں نے انھیں کبھی بے جا مفاہمت یا مصالحت کا طور اپناتے نہیں دیکھا۔ سچ بولنے کے دعوے دار تو بہت ہیں، مگر سچ کا مول چکانے کی گھڑی آتی ہے تو اچھے اچھوں کو پٹری سے اُتار دیتی ہے۔ خاں صاحب کے لیے سچ اتنی بڑی قدر ہے کہ اس کی خاطر وہ روایتی آداب کو بھی نظر انداز کردیتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ چلن پرانا ہے کہ شخصیات پر جو جلسے یا سمینار ہوتے ہیں ان میں متعلقہ شخصیت ہر بشری کمزوری سے دور فرض کرلی جاتی ہے۔ خاں صاحب ایسے موقعوں پر بھی روایت اور رواج کے حصار سے باہر ملے۔ انھیں سچ اپنی عافیت سے زیادہ عزیز ہے۔ اور تو اور ایک بار کسی مذاکرے میں تدریس کے مسئلے زیر بحث تھے، ایسی بحثوں میں اساتذہ پیش پیش رہتے ہیں۔ سو یہاں بھی بڑا بڑا جلیل القدر استاد موجود تھا۔ دو تین مقرروں کے بعد خاں صاحب نے مائک سنبھالا۔ متن کی صحیح قرأت کے سوال پر انھوں نے بہت دوٹوک انداز میں کہا کہ ”ابھی جو تقریریں ہوئیں اور مقالے پڑھے گئے ان میں تلفظ کی کم سے کم بیس غلطیاں میں نے نوٹ کی ہیں۔ جب حال یہ ہے تو ہم کیا پڑھائیں گے اور طلبہ کیا سیکھیں گے۔

وہ تو کہیے کہ جس طرح رنج کا خوگر ہونے سے رنج کا احساس جاتا رہتا ہے، اسی

طرح 'حوصلہ مند اصحاب' خاں صاحب کی ایسی باتوں کے بھی عادی ہو چکے ہیں۔ لوگوں نے سن لیا، کچھ جھینپے، کچھ ہنسے، پھر اپنی پرانی ڈگر پر چل نکلے۔ شیخ بھی ہے آدمی کردار کا۔ خاں صاحب اپنی وضع پر قائم، شیخ اپنی وضع پر۔ یہ تماشا سدا یوں ہی چلتا رہے گا۔

کئی بار ذہن میں یہ بات آئی کہ رشید حسن خاں جیسے منتخبات کا مقدر کیا ہے، سوائے ایک بے بسی کے۔ یہ واقعہ بجائے خود عبرت کے لیے کافی ہے کہ ہمارا عہد، جو کمالِ بے ہنری کے اعتراف میں فیاض ہے۔ یہاں خاں صاحب جیسوں کی حیثیت بس ایک آؤٹ سائڈر (out sider) کی ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہ افسوس کرتے رہو اپنے آپ پر اور دوسروں پر کہ یہ شہر شہر افسوس ہے۔ ابھی کچھ روز پہلے خاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو خلافِ معمول دوسرے عالم میں تھے، کہنے لگے "اب سے پہلے متعلقین یا عزیزوں میں کوئی گلہ کرتا تھا کہ میں اپنی ذاتی ذمہ داریوں کے سلسلے میں بے پروا رہا ہوں تو بات آئی گئی ہو جاتی تھی۔ لیکن اب عمر کی اس منزل پر کسی کسی وقت بے چینی سی ہوتی ہے۔ جو وضع اختیار کی تھی، اس کے نتائج سامنے ہیں"۔

سچ مچ انسان خسارے میں ہے۔ اور جانتا ہے کہ خسارے میں ہے اور نہیں چاہتا ہے کہ اس خسارے سے باہر آئے۔ اور نہیں چاہتا کہ اُس جرگے میں شامل ہو جائے جو خسارے میں نہیں ہے۔

○○○

گیان چند جین

خدائے تدوین

رشید حسن خاں کی جملہ کتابوں پر لکھنے کے لیے کم از کم ایک سال کی مدت چاہیے تاکہ سوڈیڑھ سو صفحوں کا سیر حاصل مقالہ تسوید کیا جا سکے۔ زندگی مختصر مجھے اتنی مہلت دینے کو تیار نہیں، میں اپنے تصنیفی کام میں مصروف ہوں اس لیے مختصراً رشید حسن خاں کی دو شاہکار تدوینوں کی داد دوں گا لیکن اس سے پہلے ان کی بعض اور کتابوں کے بارے میں دو حرف۔

مکتبہ جامعہ نے معیاری سیریز شروع کیا جس کے تحت قدیم ادب کی کتابیں صحتِ متن اور ضروری فرہنگ کے ساتھ شائع کیں۔ ان کی قیمت کم رکھنے کے لیے متعلقاتِ متن کو طول نہیں دیا۔ 'کتاب نما' کی ایک حالیہ فہرست کے مطابق رشید حسن خاں نے اس سلسلے کے لیے ذیل کی کتابیں تیار کیں:

باغ و بہار، سحر البیان، گلزارِ نسیم، انتخابِ ناسخ، موازنۂ انیس و دبیر، حیاتِ سعدی، انتخاب مضامین شبلی، دیوانِ درد، مقدمۂ شعر و شاعری۔

میرے پاس ان میں سے کچھ کتابیں ہیں، بقیہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سب سے اہم 'باغ و بہار' اور 'انتخابِ ناسخ' ہیں۔ معیاری سیریز میں 'انتخابِ ناسخ' اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں تقریباً سوا سو صفحوں کا مقدمہ ہے، عام طور سے اس سیریز میں دو چار صفحوں کا مقدمہ ہی ہوتا ہے۔ میں نے اس انتخاب پر تبصرہ کیا تھا جو پہلے 'کتاب نما' میں شائع ہوا اور پھر میرے مجموعہ مضامین 'ذکر و فکر' میں۔ اس مقدمے کے کئی پہلو قابلِ ذکر ہیں جن میں اہم ترین یہ ہے کہ خاں صاحب نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ ناسخ نے اصلاحِ زبان کے ضابطے بنائے تھے۔ انھوں نے کئی اقتباسات سے ثابت کیا کہ یہ ضابطے ناسخ کے بعد ان کے شاگردوں نے بنائے تھے۔ مقدمے کا اتنا ہی اہم حصہ ناسخ کے رنگِ سخن کی

تعین ہے۔ اس میں رشید حسن خاں کامیاب نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

تلاش و تحقیق کی بنا پر تنقید کرنا ان کا رنگِ خاص ہے۔ فیض اور جوش کے متعلق ان کی تنقیدیں مشہور ہیں۔ ان کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ 'تلاش و تعبیر' کے نام سے سامنے آچکا ہے۔

معیاری ادب سیریز کی 'باغ و بہار'، 'سحر البیان' اور 'گلزارِ نسیم' میں متن تو معتبر ہے ہی ان میں شامل فرہنگ بھی بہت مفید ہے۔

رشید حسن خاں قاضی عبدالودود کے پیرو ہیں۔ حالیہ دو شاہکار تدوینوں سے پیشتر ان کی شہرت ایک خوردہ گیر محقق کی تھی۔ اس سلسلے کے ان کے بعض مضامین ان کے مجموعے 'ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ' (علی گڑھ 1978) میں ملتے ہیں۔ ان میں تین تبصراتی مضامین اہم ترین ہیں۔ دیوانِ غالب صدی ایڈیشن، اردو شاعری کا انتخاب اور علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ تینوں تبصرے یک رخی ہیں یعنی ان میں محض اغلاط دکھائی ہیں، خوبیوں کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔

دیوانِ غالب صدی اڈیشن کے مرتب مالک رام ہیں۔ اس پر خاں صاحب کا تبصرہ پہلے رسالہ 'تحریک' دہلی غالب نمبر 1969 میں شائع ہوا، بعد میں 'اردو تحقیق اور مالک رام' نام کی کتاب میں اور تیسری باران کے مجموعے 'ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ' میں۔

خاں صاحب نے تبصرہ بڑی دیدہ ریزی اور عمق نظر سے لکھا ہے۔ کاش انھوں نے غیر جذباتی رنگ میں لکھا ہوتا اور خامیوں کے بیان کے ساتھ مالک رام کے اکتسابات کا بھی اعتراف کیا ہوتا۔ رشید حسن خاں کے اعتراضات اور تجاویز میں سے میں بیشتر سے متفق ہوں بعض سے نہیں۔ تفصیل کا موقع نہیں۔ جسے اس سے دلچسپی ہو وہ میرا مضمون 'مالک رام بحیثیت ماہرِ غالبیات' دیکھ لے جو میرے مجموعے 'ذکر و فکر' (الٰہ آباد 1980) میں شامل ہے۔

دوسرا اہم تبصرہ ڈاکٹر زور کی مرتبہ 'اردو شاعری کا انتخاب' پر ہے۔ انتخاب ساہتیہ اکادمی کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ خاں صاحب نے اس میں تحریفِ متن کے جو نمونے دیے اور انتخاب میں عدم توازن کی نشاندہی کی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کام ڈاکٹر زور نے خود نہیں کیا بلکہ کسی شاگرد سے کرایا ہے۔ تیسرا شہرت یافتہ تبصرہ 'علی گڑھ تاریخِ ادب اردو' پر ہے۔ رشید حسن خاں نے اس تاریخ کی خامیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مشہور ہے کہ ان کے تبصرے کے بعد کتاب بازار سے واپس لے لی گئی۔

صحتِ زبان کے سلسلے میں ان کا پہلا شاہکار ان کی ضخیم کتاب 'اردو املا' (ترقی اردو بورڈ، دہلی، 1974) اور دوسرا شاہکار اسی ادارے سے شائع شدہ ان کے مضامین کا مجموعہ 'زبان اور قواعد' (دہلی 1976) ہے۔ ان کتابوں میں انھوں نے زبان کے مسائل پر جس علم وفضل اور قدیم کتب میں جس گہری نظر کا ثبوت دیا ہے وہ ہمارے زمانے میں تقریباً نایاب ہے۔ 'اردو املا' میں انھوں نے متعدد الفاظ کے جس تلفظ اور املا کی سفارش کی ہے ان میں سب سے اتفاق کرنا مشکل ہے لیکن انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں جو اسناد پیش کی ہیں انھیں رد کرنا آسان نہیں۔ 'زبان اور قواعد' کے مضامین میں جن قدیم کتب اور رسالوں سے حوالے اور اقتباسات دیے ہیں ان میں سے بعض کا ہم نام لیا کرتے ہیں، انھیں دیکھتے نہیں۔ دوسری طرف متعدد ایسے مآخذ ہیں جن کو ہم نے، کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اردو کے کلاسیکی دفینے پر ایسی نظر اس دور میں شاید ہی کسی دوسرے شخص کی ہو۔ مجموعے کے آخر میں انھوں نے بحر لکھنوی کا رسالہ 'بحر البیان' پورے کا پورا شامل کر دیا ہے۔ یہ خوب کیا۔

رشید حسن خاں نے مالک رام کے مرتبہ دیوانِ غالب پر اعتراض کیا۔ ان سے یہ کہنے کو جی چاہتا تھا کہ ''حضرت دوسروں کے بخیے تو بہت ادھیڑ چکے کچھ خود بھی کر کے دکھایئے تاکہ معلوم ہو کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔ خاں صاحب نے اس ساکت سوال کا مسکت جواب دیا اور جواب بھی ایک نہیں دو دو۔ انھوں نے پہلے 'فسانۂ عجائب' کی اور پھر 'باغ و بہار' کی تدوین کی اور اس طرح کی کہ آگے سوچا ہی نہیں جاسکتا۔ میں دونوں کارناموں کا تعارف پیش کرتا ہوں۔

فسانۂ عجائب:

اسے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا۔ سنہِ اشاعت 1990 درج ہے لیکن رشید حسن خاں نے مجھے اس کتاب کی جو جلد پیش کی اس پر 26 دسمبر 1989 کی تاریخ درج ہے۔ یہ عام بات ہے کہ کتاب پر جو تاریخِ اشاعت درج ہے، وہ بازار میں اس سے بعد میں آئی ہو۔ یہ شاذ ہے کہ جو سنہِ اشاعت چھپا ہے، کتاب اس سے پہلے سال میں شائع ہو چکی ہو۔ تدوین کے اعتبار سے 'فسانہ عجائب' کا انتخاب کرنا ایک ہفت خواں کا سامنا کرنا ہے۔ ایک تو اس کی مشکل زبان، پھر مختلف اڈیشنوں میں مصنف کی ترمیم اور اضافے۔ رشید حسن خاں سے پہلے کئی محققوں نے اس کتاب کی ترتیب کی لیکن جب انھوں نے کی تو معلوم ہوا کہ

اس کی تدوین کیسے کی جانی چاہیے تھی چند صفحات میں اس کے محاسن کا احاطہ مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ قاری خود اس کی ورق گردانی کر کے گل چینی کرے۔ اس کی ابتدا میں 114 صفحات کا مقدمہ ہے۔ پھر صحیح ترین متن، اس کے بعد تقریباً ڈھائی سو صفحوں پر ضمیمے، فرہنگ اور اشاریہ۔ میں نہیں جانتا کہ مقدمہ، متن اور تعلیقات میں کس حصے کو زیادہ عالمانہ قرار دوں کتاب کا یہ عالم ہے:

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

مقدمے کے ابتدائی حصے میں انھوں نے تدوین کی حدود متعین کی ہیں اور اس سے اتفاق کرنا ہوگا۔ لکھتے ہیں:

''تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو ممکن حد تک منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں بنیادی حیثیت صحتِ متن کی ہوتی ہے۔'' (مقدمہ ص 22)

ان کے مطابق مصنف کی مفصل سوانح تشکیل کرنا، داستان کے ماخذ کی نشان دہی اور اس کا تنقیدی جائزہ تدوینِ متن میں داخل نہیں۔ سوانح یا ماخذ کو مختصراً دیا جاسکتا ہے۔ مدوّن کو محض متعلقاتِ متن پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔

اس کے بعد انھوں نے سرور کی 'ولادت، وطن، وفات اور مدفن' کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ اطلاع دی کہ منشی نول کشور نے 'فسانہ عجائب' کا حقِ اشاعت خرید کر 1283 ہجری میں پہلا اڈیشن شائع کیا لیکن اس سے پہلے بھی نول کشور اس کتاب کو شائع کر چکے تھے۔ 1283 ہجری کے اڈیشن کو خاں صاحب نے برسوں کی تلاش کے بعد بہم پہنچایا (ص 27-26)۔ مخمور اکبرآبادی کے مرتبہ رام نرائن لعل اڈیشن (1974) کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ بارِ دوم ہے، پہلی اشاعت 1928 کی ہوگی۔ عرض کرتا ہوں کہ میرے پاس یہ اڈیشن زمانۂ طالب علمی سے ہے۔ ایم۔اے کے کلاس میں بھی اسی سے متن خوانی کرتا تھا۔ فی الوقت میں نے یہ اڈیشن اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس کو بجنور بھیج رکھا ہے۔

سرور کے وطن کے سلسلے میں بھی یہ عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے باشندے تھے لیکن ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے تین قدیم تذکروں میں کچھ اور ہی پایا۔ مبتلا وعشق میرٹھی نے تذکرۂ طبقاتِ سخن میں اور خیراتی لال بے جگر نے اپنے تذکرے میں انھیں

خوش باش شہر کالنہ پور لکھا ہے۔ خوب چند ذکا نے بھی معیار الشعرا میں انھیں ساکن کالنہ پور قرار دیا ہے۔ یہ بیانات اس وقت کے ہیں جب سرور نے 'فسانہ عجائب' نہیں لکھی تھی۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر نیر مسعود اور رشید حسن خاں اپنی اپنی کتاب مرتب کرتے وقت ان تینوں کے مآخذ سے ناواقف تھے۔ حنیف نقوی کے مطابق سرور کے اہلِ خاندان کا مستقل قیام کانپور میں تھا۔ ان سب سے سرور کی لکھنؤ سے وطنی نسبت کے متعلق شبہے کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن سرور نے 'فسانۂ عجائب' کی تمہید میں کانپور کی جس شدت کے ساتھ ہجو کی ہے اس کے پیش نظر یہ امکان نہیں رہتا کہ کانپور ان کا وطن مالوف ہوگا۔

قطع کلام کر کے مجھے ایک بات کہنی ہے۔ رشید حسن خاں نے اس کتاب میں، نیز 'باغ و بہار' میں فٹ نوٹ میں بہت سے اہم مطالب درج کیے ہیں جن کا متن مقدمہ سے براہِ راست تعلق ہے۔ انھیں حاشیے میں کیوں جگہ دی گئی، متن میں کیوں نہیں۔ مثلاً زیر نظر کتاب کے ص 28 کے حاشیے 4 کو جس میں مفتی انتظام اللہ شہابی کے سرور کو اکبر آبادی قرار دینے کا ذکر ہے۔ خاں صاحب کے ذہن میں حاشیے کے حصار کی بات صاف نہیں معلوم ہوتی۔ فٹ نوٹ میں عام طور سے مآخذ کا حوالہ دیا جاتا ہے یا ایسے تبصرے جو متن میں دیے جائیں تو دخل درمعقولات معلوم ہوں۔ حتی الامکان تبصراتی حاشیے متن ہی میں شامل کرنے چاہئیں۔ حواشی متن پر غالب نہ ہونے پائیں نہ اس کے حریف ہوں۔ حواشی کے مطالب کے صحیح حصار کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب 'تحقیق کا فن' (لکھنؤ 1990، ص 24-323۔)

'نوازش اور اصلاح' کے عنوان کے تحت 'فسانۂ عجائب' میں سرور کے استاد نوازش کے اشعار کی بحث بڑے عارفانہ انداز میں کی ہے۔ 'فسانۂ عجائب' کے صاحب فرمائش کے بارے میں یہ دریافت کہ وہ سرور کا مردِ محبوب ہو سکتا ہے دلچسپ اور قابلِ قبول ہے۔ (ص 45)۔

لکھتے ہیں کہ قصے کہانیوں کی کتابوں میں نوطرزِ مرصع کو چھوڑ کر اور کوئی کتاب مشکل زبان میں نہیں لکھی گئی تھی (ص 55)۔ میں عرض کرتا ہوں کہ حکیم مہجور کی گلشن نوبہار کے بھی بعض حصے حسبِ توفیق مرصع اسلوب میں لکھے گئے ہیں، مثلاً:

> ''اور پر سخن وران شیریں مقال ونکتہ دانان صحیفہ خیال کے حقیقت اس شکستہ حال، وابستہ ملال ضیم الاعمال وخیم الخصال، آوارۂ بادیۂ کربت وسرگشتہ صحرائے غربت کے اخفا اور پوشیدہ نہ رہے۔''

(گلشن نو بہار مرتبہ ڈاکٹر سلیمان حسین۔ لکھنو 1985 ص 84)

مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ سرور نے اسی کتاب کے اسلوب کی تقلید کی۔ خاں صاحب نے مقدمہ 61 سے 74 تک سرور کی زبان و بیان پر بحث کی ہے۔ متون کے مرتبین لسانیاتی مطالعے بھی کرتے ہیں لیکن خاں صاحب کا بیان ان کے عام اسلوب نگارش کے مطابق معلوماتی اور دل آویز دونوں ہے۔ اکثر اوقات کسی مصنف پر لکھنے والے اس کی مدلل مداحی کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ رشید حسن خاں سرور کے طرف دار نہیں، اس کی تخلیق کے حسن و قبح دونوں کو بیان کرتے ہیں، مثلاً:

''فسانہ عجائب کی نثر میں بہت سے مقامات پر کچا پن محسوس ہوتا ہے اور لفظی رعاتیوں کی غیر ضروری پابندی نے بے ڈھنگا پن بھی پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، اس میں ان کی 'کم مشقی' کا دخل کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔'' (ص 65)

''متعدد مقامات پر بیان میں ایسا بھدا پن ہے کہ اسے بے اختیار 'پھوہڑ پن' کہنے کو جی چاہتا ہے۔'' (ص 69)

انھوں نے اس کی جو مثالیں دی ہیں وہ ان جیسا خود اعتماد شخص ہی فراہم کرسکتا تھا۔ خاصے کے یہ بیانات ان کی تنقیدی نظر کی دین ہیں۔ انھوں نے جو لسانی تجزیہ کیا ہے وہ روایتی تجزیے سے بہت مختلف اور مفید تر ہے۔

اس کے بعد انھوں نے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی تفصیل دی ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اب تک اس کتاب کے کسی ایسے خطی نسخے کا پتا نہیں چل سکا جو مکمل کتاب پر حاوی ہو۔ عہدِ مصنف کا مکتوبہ ہو اور اس سے متن کی صحیح ترتیب میں مدد لی جاسکے'' (ص 76)

'فسانۂ عجائب' کی موجودہ ہیئت کا کوئی مخطوطہ نہیں لیکن محمود الٰہی والا بنیادی متن اور نورالحسن ہاشمی کا مملوکہ میر فضل رسول والا نسخہ دونوں مکمل کتاب پر حاوی ہیں۔ میں نے ان دونوں کے جزوی اختلافات پر ایک مفصل مضمون لکھ کر رسالہ 'اردو' کراچی شمارہ 1، 1986، نیز 'آج کل' بابت مئی 1986 میں شائع کرادیا۔ بعد میں اسے اپنے مجموعہ مضامین 'کھوج' (دہلی، 1990) میں شامل کرلیا۔ اس مضمون میں میں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ محمود الٰہی کا نسخہ ہاشمی کے نسخے سے قدیم تر معلوم ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ نسخے میرے دائرہ کار سے قریب کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ میرا اصل مقصد تو اس متن کی اس صورت کو پیش کرنا ہے جسے آخری بار مصنف نے پیش کیا تھا اور اس میں ان نسخوں کے مباحث کے شمول کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔'' (ص 102)

خاں صاحب نے مطبوعہ نسخوں کے مخفف کے طور پر حرفِ علامات ح، م، ک وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔ ان سے مرتب کو سہولیت ہو جاتی ہے لیکن قاری کی الجھن کا سامان ہو جاتا ہے۔ اسے یاد نہیں رہتا کہ کون سا حرف کس نسخے کی علامت ہے۔ اگر ان کے بجائے لفظی مخففات مثلاً حسنی 1 مصطفائی حیدری، حسنی 2۔ محمدی۔ افضل۔ نجم اور نول وغیرہ استعمال کرتے تو ذہن کو بھٹکنا نہ پڑتا۔ مقدمے کے آخری حصے میں علامات و رموزِ اوقاف کی تفصیل ہے۔ ان کے ذریعے سے انھوں نے صحتِ متن کی جو کوشش کی ہے وہ بے نظیر ہے، مثلاً ذیل کی علامات دیکھیے:

یائے مخلوط کے لیے اس پر آٹھ کے ہند سے کا نشان مثلاً پیار۔ واوِ معدولہ کے نیچے خط مثلاً خوزادہ۔ درمیانِ لفظ واقع نونِ غنہ پر قوس کا الٹا نشان جیسے آنت۔

انھوں نے اسمائے معرفہ یعنی عَلَم کے اوپر خط کھینچا ہے۔ میری رائے میں قطعاً غیر ضروری ہے۔ انگریزی میں کتابوں کے نام ترچھے حروف Italic میں چھاپے جاتے ہیں۔ مصنف اپنے مسودے میں کتاب کے نام کے نیچے خط کھینچ دیتا ہے جو پریس کے کمپوزیٹر کے لیے اشارہ ہوتا ہے کہ اس لفظ کو ترچھے حروف میں چھاپا جائے۔ باقی اعلام کو خط کشیدہ نہیں کیا جاتا۔ خاں صاحب اپنی تحریروں میں اشخاص اور کتب کے ناموں کے اوپر خط کھینچتے ہیں۔ وضاحت کو اس کی ضرورت نہیں، ہاں بدنمائی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔

انھوں نے اپنے مقدمے میں ایک اور نرالے رمزِ اوقاف بڑے بریکٹ [ ] کا استعمال کیا ہے۔ اردو اور انگریزی تحریر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انگریزی فقرۂ معترضہ کو دو لمبی لکیروں کے بیچ محصور کر دیا جاتا ہے اور یہ قوسین کا نعم البدل ہیں۔ اردو میں اگر الٹے کاما سے اگر کام نہ چل سکے اور وضاحت کی غیر معمولی کوشش ہو تو چھوٹے بریکٹ یعنی قوسین ( ) کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ترتیبِ متن میں بڑا بریکٹ صرف وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں دوسرے کی عبارت کے بیچ چھوٹے ہوئے ایک آدھ لفظ کو خلا پُر کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ بڑا بریکٹ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس سے محصور الفاظ اصل متن میں موجود نہ تھے،

مدون نے قیاساً لکھے ہیں۔ اس سے ہٹ کر عام تحریر میں بڑے بریکٹ کا استعمال خواہ مخواہ الجبرائی رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ چھوٹے بریکٹ کا استعمال بھی کم سے کم کرنا چاہیے۔

مجھے ان کی زبان کے محض دو الفاظ کے بارے میں عرض کرنا ہے۔ انھوں نے جا بجا مصرع مطبع وغیرہ کو امالے کی شکل میں مصرعے، مطبعے لکھا ہے۔ اپنی کتاب 'اردو املا' میں ص 43-441 پر ان الفاظ سے بحث کی ہے۔ بحر لکھنوی اور جلال ان الفاظ کو 'ے' بغیر لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ حرفِ ماقبل کو کسرے سے ادا کرنا امالے کے لیے کافی ہے جب کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی واحد محرف کی شکل میں بھی 'ے' کا اضافہ پسند کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں آخر الذکر کے مقلد ہیں۔ میری رائے میں بحر اور جلال کا موقف قابلِ ترجیح ہے۔

خاں صاحب کئی جگہ 'ہے ہی' کی جگہ 'ہئ' کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً مقدمہ 'فسانۂ عجائب' میں ص 52 سطر 6 میں، مقدمہ 'باغ و بہار' میں ص 63 سطر 19 میں۔ خاں صاحب کو میر امن یا آغا حیدر حسن دہلوی بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ داستان اور انشایئے میں یہ روپ جائز ہو سکتا ہے، علمی تحریر میں نہیں۔ مقدمے کا آخری عنوان 'باعثِ تاخیر' ہے۔ خاں صاحب نے متن کی ترتیب اور اختلاف نسخہ کا کام مکمل کر لیا، متن کی کتابت بھی کرا لی کہ معلوم ہوا کہ پٹنے میں مصنف کا نظر ثانی کیا ہوا 1280 ہجری کا اڈیشن ہے، اسے دیکھا۔ آسان صورت یہ تھی کہ کتابت شدہ متن کو اسی طرح رہنے دیا جاتا اور آخر میں ایک نوٹ شامل کر دیا جاتا کہ اس نسخے کی بازیافت اس منزل پر ہوئی کہ اس سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا لیکن خاں صاحب کا ضمیر اس پر تیار نہیں ہوا اور انھوں نے متن کو ازسرِ نو مرتب کیا (ص 112)۔ لکھتے ہیں:

> ''فسانہ عجائب اور باغ و بہار دونوں میں مقدمے میں صفحات کے شمار کا ایک سلسلہ ہے، اس کے بعد متن میں نئے ص 1 سے دوسرا سلسلہ جو کتاب کے آخر تک چلا جاتا ہے۔ اس طرح 'فسانہ عجائب' میں ص 1 سے 117 تک اور 'باغ و بہار' میں ص 1 سے 136 تک کے نمبر مکرر ملتے ہیں۔

یہ دوہرا سلسلہ قواعد تدوین بلکہ روایت کتاب بندی کے بھی خلاف ہے۔ اب کبھی ان صفحات کا حوالہ دینا ہو تو لکھنا ہوگا مقدمہ صفحہ فلاں، متن صفحہ فلاں۔ اس دوئی کی وجہ لکھتے ہیں:

''ضمیموں کے اندراجات کے سلسلے میں یہ ضروری تھا کہ متن پر نمبر شمار

موجود ہوں (متن میں کتابت پہلے ہوئی تھی) تاکہ صفحات کا حوالہ دیا جاسکے۔ مقدمہ (حسبِ روایت اور حسبِ معمول) ضمیموں کی تکمیل کے بعد لکھا گیا۔ امتیاز کی خاطر ابتدائی حصے کے صفحات پر نمبر شمار صفحات کے نچلے حصے میں لکھے گئے ہیں جب کہ باقی کتاب میں صفحات کے نمبر شمار (حسبِ معمول) صفحات کے اوپری حصے پر ہیں'' (مقدمہ ص 112)۔

'باغ و بہار' میں پوری کتاب میں نمبر شمار یکساں طور سے صفحے کے نچلے حصے ہی میں ہیں۔ میں مرتب اور کاتب کی مشکل کا اندازہ کرسکتا ہوں کہ اگر کتابت کا پورا کام مقدمہ لکھنے کے بعد شروع کیا جاتا تو اس میں جہاں جہاں دوسرے صفحوں کا حوالہ تھا (انگریزی میں اسے Cross Reference کہتے ہیں) وہاں خلا چھوڑا جاتا، پھر کتابت اور نمبر اندازی کے بعد ان خلاؤں کو پُر کیا جاتا۔ بڑا دردِ سر ہوتا۔ 'دیوانِ غالب' نسخہ عرشی میں بھی مقدمے اور متن میں صفحوں کے نمبر کی یہی تکرار ہے۔

'فسانۂ عجائب' کے متن کو اس صحت کے ساتھ پیش کرنا کہ ہر فقرہ اور ترکیب قطعی طور پر منشائے مصنف کے مطابق ادا ہوجائے، اس اڈیشن کا سب سے بڑا اکتساب ہے۔ اسی کے لیے تو خاں صاحب نے اتنی کھکیڑ اٹھائی ہے۔ جب میں الٰہ آباد یونیورسٹی کا ایم.اے کا طالبِ علم تھا تو میرے اساتذہ پروفیسر ضامن علی اور سید اعجاز حسین کلاس میں کتابوں کے متن کو ہمیشہ کسی طالب علم سے پڑھواتے تھے اور جہاں کچھ بتانا ہوتا تھا وہاں طالب علم کو روک کر تبصرہ کر دیتے تھے۔ ایم.اے کے دو برسوں میں قسم کھا کر ہر کلاس میں تنہا میں نے متن خوانی کی ہے۔ یہ بڑی ذمے داری تھی اگر عطف و اضافت غلط آجاتے تو مجھے نکو بننا پڑتا۔ میرے پاس 'فسانۂ عجائب' کا مخمور اکبر آبادی کا 1928 کا اڈیشن تھا۔ کتاب بہت گنجان چھپی تھی۔ میں کلاس سے قبل ہوسٹل میں بیٹھ کر جملوں کے بیچ فقروں کو الگ کرنے کے لیے ان میں کاما اور اڈیش لگا کر کلاس میں جاتا تھا تاکہ میری جگ ہنسائی نہ ہو۔ اگر رشید حسن خاں کا مرتب کردہ متن میسر ہوتا تو کتنی سہولت ہوتی۔

اگر انھوں نے صحیح ترین متن پیش کیا ہے تو اس کے کاتب ابو جعفر زیدی اردو کے صحیح ترین خوش نویس ہیں جنھوں نے صحتِ زبان کی خاطر اپنی جان لڑا دی ہے۔ اس آقائے خطاطی نے کتابت کو تحقیق کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ ان کی دونوں کتابوں میں سہوِ کتابت کا سوال ہی نہیں۔

متن کے بعد سات ضمیمے ہیں: پہلا نثر ہائے خاتمہ کتاب، دوسرا تشریحات، تیسرا انتساب اشعار، چوتھا اشخاص، مقامات، عمارتیں، پانچواں تلفظ اور املا۔ چھٹا الفاظ اور طریق استعمال۔ یہ قاضی عبدالودود کے مطالبے کی مناسبت ہے۔ ساتواں، ضمیمہ اختلافِ نسخ کا ہے۔ یہ اختلافات صرف دیباچہ فسانہ عجائب تک محدود ہیں۔ مدون نے 85 صفحوں کا ضمیمہ تیار کیا لیکن پھر یہ معلوم ہوا کہ زیادہ ضخامت کی وجہ سے یہ کتاب نہیں چھپ سکتی۔ ناچار اس ضمیمے کو حذف کرنا پڑا۔ افسوس۔ کتاب کی تکمیل میں ایک نقصان رہ گیا۔ اب انھیں چاہیے کہ اس اختلافِ نسخ کو کسی رسالے میں یا علاحدہ کتابچے کے طور پر شائع کر دیں۔

ضمیموں کے بعد فرہنگ ہے جس کے دوسرے حصے میں عربی فقروں اور عبارتوں کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد مختصر اشاریہ ہے جو محض متن داستان پر حاوی ہے۔ سیر حاصل اشاریے کو مقدمہ مرتب اور ضمیموں کا بھی احاطہ کرنا چاہیے تھا لیکن پھر وہی ضخامت کے اضافے کا سوال ابھرتا۔ میرے لیے یہ ضمیمے اور فرہنگ معلومات کے ایسے ہشت گنج خسرو ہیں جن کے مشاہدے اور استفاضے میں عمر بسر کی جا سکتی ہے۔

باغ و بہار:

تصنیفی اعتبار سے 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب' پر مقدم ہے لیکن رشید حسن خاں نے اس کی تدوین 'فسانۂ عجائب' کے بعد کی۔ انھوں نے 1964 میں مکتبہ جامعہ کے معیاری سیریز کے لیے 'باغ و بہار' مرتب کی تھی۔ تبھی سے ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اس کتاب کو مکمل طریقے سے مدون کیا جائے۔ ان کی انتھک کوششوں کا نتیجہ 1992 میں سامنے آیا۔ خوش قسمتی سے 'باغ و بہار' کی طبع اوّل (1804) دستیاب ہے۔ گلکرسٹ نے جس صحت رموز واوقاف کے ساتھ چھپوایا تھا وہ اس کی تدوین کا پہلا قدم تھا، خاں صاحب کی کاوش اس سفر کا آخری قدم ہے۔ میں نے یہ ایڈیشن دسمبر 1945 میں انجمن ترقی اردو دہلی میں سرسری طور پر دیکھا تھا۔ ایک زمانے کے بعد اس کی ایک کاپی انجمن ترقی اردو بک ڈپو، اردو بازار دہلی میں برائے فروخت دیکھی۔ میں جموں یونیورسٹی کے لیے خریدنا چاہتا تھا۔ دکان کے مالک مولانا زیادہ قیمت مانگ رہے تھے۔ سودا نہ پٹ سکا۔ اب افسوس کرتا ہوں کہ بڑی کوتاہی کی۔ مجھے اتنا روپیہ دے کر خود اپنے لیے خرید لینا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں وہ کاپی کس ذخیرے کا مقسوم ہوئی۔

'باغ و بہار' کی اشاعتِ اول سے پہلے اس کے متن کے 102 صفحے ہندی مینول (1802) میں شائع ہو چکے تھے۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ مینول تقریباً نایاب ہے۔ رشید حسن خاں نے برسوں کی جستجو کے بعد اس کا عکس حاصل کیا۔ اس کی دلچسپ روداد مقدمے کے ص 16-18 پر دیکھیے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی کے بارے میں یہ مزے کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

> ''قدوائی صاحب اچھے دوست ہیں، مخلص اور غم گسار ہیں لیکن پرانے شرفائے کرام کی طرح کاہلی اور بے پروائی میں بھی کسی سے کم نہیں۔ سونے میں سہاگا یہ کہ انھوں نے لندن میں جن صاحب سے عکس بھیجنے کی فرمائش کی تھی وہ صاحب ان لوازم تہذیب اشرافیہ میں موصوف کے شریک غالب نکلے۔'' (ص 17)

معلوم ہوا کہ کاہلی اور بے پروائی اشراف کی تہذیب کا لازمہ ہیں۔ خاں صاحب نے قیاس کیا کہ گو ہندی مینول میں صرف 102 صفحے چھپے لیکن اس کتاب کی اس روایت کو مکمل صورت میں کہیں تو ہونا ہی چاہیے۔ لکھتے ہیں کہ لندن میں اس روایتِ اول کا مکمل خطی نسخہ دریافت ہو گیا اور اس کا عکس بھی مل گیا (ص 18) لیکن صفحہ 69 پر وہ اس نسخے کی جو تفصیل دیتے ہیں اس کی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نسخہ کم سواد تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ مخطوطہ ہندی منیول کی پریس کاپی نہیں۔

اس مقدمے میں بھی وہ تدوین کی حدود کا وہی تعین کرتے ہیں جو 'فسانۂ عجائب' کے مقدمے میں کیا تھا اور اس سے اتفاق کرنا ہوگا۔ اس میں انھوں نے زور دیا ہے کہ متن کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کیا جائے۔ میر امن نے دلّی کی بول چال کا روزمرہ لکھا ہے جس میں بارہا نامانوس روپ آ گئے ہیں۔ پیشتر کے مرتبین نے انھیں سہوِ طباعت سمجھ کر بدل دیا لیکن رشید حسن خاں نے میر امن کے ہاتھ کی لکھی 'گنج خوبی' دیکھی ہے۔ ہندی مینول کے مطبوعہ اوراق، بقیہ حصے پر مشتمل مخطوطہ، گلکرسٹ کا نظامِ اوقاف، ان سب کی مدد سے وہ میر امن کے سویدائے دل میں اُتر گئے ہیں، ہر لفظ اور ہر محاورے کو اسی طرح لکھا ہے جو میر امن کا منشا رہا ہوگا۔

وہ میر امن کی سوانح کے غیر مستند بیانات کو رد کر کے مختصر لیکن باوثوق حالات کی باز تشکیل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مفتی انتظام اللہ شہابی کی غلط بیانی کے سبب ممتاز حسین اور

مرزا حامد بیگ نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں ان کی پوری داستان منکشف کرتے ہیں۔ مفتی صاحب جس مرتبے کے راوی تھے، حامد بیگ اسی درجے کے مرید ثابت ہوئے جو آنکھ بند کر کے بیعت کر لیتے ہیں۔

'باغ و بہار- آغاز و اختتام' (ص 44) ایک مفید عنوان ہے جس میں یہ معرکے کی دریافت ہے کہ گلکرسٹ نے میرامن سے 'چار درویش' کی تالیف کی فرمائش ان کے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہونے سے پہلے ہی کر دی تھی اور میرامن نے اصلاً اس کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ 'کتاب کا نام' کے تحت خاں صاحب لکھتے ہیں کہ میرامن نے اصلاً اس کا نام 'چار درویش' رکھا تھا، نظر ثانی کے بعد 'باغ و بہار' سے موسوم کیا (ص 51)۔

کیا میر شیر علی افسوس نے 'باغ و بہار' کی نثر کی درستی میں کچھ مشورے دیے، اس سلسلے میں انھوں نے افسوس کی 'آرائش محفل' کے خطی نسخے (مخزونہ کلکتہ) کے دیباچے سے صحیح صورتِ حال معلوم کی۔ مطبوعہ نسخے میں اشارہ ہے کہ تفصیلات خطی نسخے میں دی ہیں۔ افسوس کہ فورٹ ولیم کی کتابوں کی زبان کی درستی میں جن اختلافات کا سامنا کرنا پڑا، دیباچے کے بین السطور سے ان کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے حاشیے میں اعتراف کیا ہے کہ انھیں اس خطی نسخے کے وجود کی اطلاع ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے تحقیقی مقالے سے ملی۔ مجھے توجہ دلانی ہے کہ خاں صاحب نے ہر جگہ دوسروں سے ممنونیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

'باغ و بہار' کے خطی نسخوں کے سلسلے میں وہ ڈاکٹر ثریا حسین کے مطبوعہ مقالے 'گارسیں دتاسی اردو خدمات، علمی کارنامے' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ثریا حسین نے مارسیلز کی میونسپل لائبریری میں 'باغ و بہار' کا 1217 ہجری کا مخطوطہ دیکھا (ص 68)۔ جب خاں صاحب نے دنیا بھر سے قدیم روایتوں کی تلاشی کی تو اتنے اہم نسخے سے کیوں صرفِ نظر کیا۔ کوشش کر کے اس کا عکس حاصل کرنا چاہیے تھا۔ کیا معلوم یہ اس کتاب کی طبعِ اول کی پریس کاپی بخطِ مصنف تو نہیں۔ اس سے قطع نظر انھوں نے لندن کے مخطوطے، ہندی مینول کے اوراق اور 'باغ و بہار' طبعِ اول کے اندراجات کا دیدہ ریزی سے تقابلی مطالعہ کیا اور ان کی روشنی میں نسخۂ لندن کا شجرۂ نسب متعین کرنے کی قابلِ داد کوشش کی۔

نسخوں اور ایڈیشنوں کے لیے حرفی مخففات مجھے یہاں بھی الجھاتے ہیں مثلاً 'باغ و بہار' طبعِ اول کی علامت ک کیوں ہے۔ لفظی مخفف ہو تو اس کی موضوعی علامت سے کوئی

ذہنی نسبت ہوسکتی ہے۔ص 83 پر'اعراب، علامت، رموزِ اوقاف' کا عنوان بیش بہا معلومات رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گلکرسٹ نے املا پر ایک رسالہ لکھا تھا جو اب دستیاب نہیں لیکن اس کا نچوڑ کئی کتابوں میں موجود ہے۔ اسے خاں صاحب نے پیش کر دیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں گلکرسٹ نے اس معرکے کا کام کیا۔

چار درویش کا قدیم ترین فارسی مخطوطہ حبیب گنج کلکشن مسلم یونیورسٹی میں بالیقین موجود تھا۔ میں نے نثری داستانیں میں اس کا ترقیمہ نقل کیا ہے۔ میری اطلاع کے بعد کسی نے اسے غائب کر دیا۔ افسوس!

'باغ و بہار کی نثر- اہمیت اور اجزائے ترکیبی' اس عنوان کے تحت ص 107 سے 128 تک 'باغ و بہار' کی زبان و بیان کا تجزیہ کیا ہے۔ کوئی محض لسانیات داں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے لیے رشید حسن خاں جیسے دیدہ ور عارف رازہی کی ضرورت تھی۔

کتاب کے مستند متن کے بعد تین ضمیمے ہیں: پہلا ضمیمہ 'تشریحات، اختلاف نسخ، انتساب اشعار، افراد، مقامات، عمارتیں' ہے۔ دوسرا ضمیمہ 'تلفظ اور املا' ہے۔ یہ دونوں ضمیمے ایسی کانیں ہیں جن میں فاضلانہ معلومات کے سونے کے ڈلے بھرے پڑے ہیں۔ ان سے استفادے کے لیے کئی برس کا عرصہ درکار ہے۔

تیسرا ضمیمہ 'الفاظ اور طریقِ استعمال' ہے۔ اس کے بعد فرہنگ ہے۔ 'باغ بہار' کی فرہنگ کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ اس کے بعض ایڈیشنوں کے شروع یا آخر کے اوراق کا عکس دیا ہے۔ ص 711 پر یہ صحیفہ ذریں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس میں مقدمے کے 136 صفحے جوڑیے تو پوری کتاب 847 صفحات بغل میں لیے ہے۔

ہدیۂ تحسین و تبریک:

اب تک اردو نثر میں بہترین تدوینات مولانا عرشی اور مالک رام ومختار الدین احمد کی تھیں۔ رشید حسن خاں نے 'فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' کو اس انداز سے مدون کیا ہے کہ یہ ایسے مکمل ومثالی کام ہیں جن کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے، نہ عرصے تک مستقبل میں ملنے کی امید ہے۔ یہ کتابیں تدوین کا ایسا بیش بہا خزینہ ہیں جن میں لامتناہی دولت چھپی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک ایسی کتاب تیار کرنے کے لیے پندرہ بیس سال کا عرصہ درکار ہے۔ ان میں سے ہر کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لیے ایک ایک سال کی مدت چاہیے کیوں

کہ ان کے ضمیموں میں جو معلومات بھری پڑی ہیں انھیں پرکھنے اور ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے عمرِ عزیز کا ایک موقر حصہ نذر کرنا ہوگا۔ میرؔ کا شعر ہے:

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

ان کتابوں کا بھی یہی عالم ہے۔ کئی مغربی و مشرقی علما کلاسیکی زبانوں کے متون کو مرتب کر کے شہرتِ دوام پا چکے ہیں۔ رشید حسن خاں کا کام کسی سے کم معیار کا نہیں۔ اگر وہ کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوتے، یورپ و امریکہ کی سیر کیے ہوتے، عظیم الشان جلسوں میں صدرِ مملکت یا وزیرِ اعظم سے رسمِ اجرا کراتے تب ان کارناموں کو عظیم الشان قرار دیا جاتا۔ بہ صورتِ موجودہ ایسے شاہکاروں کا جو غلغلہ ہونا چاہیے، نہیں ہوا۔ حضرت امیر حمزہ نے 'طلسم ہوش ربا' فتح کیا تھا۔ تدوین کے ہفت خواں میں رشید حسن خاں کی تسخیر اس سے کم نہیں۔ اگر تدوین کوئی ملت ہوتی تو یہ کتابیں اس کے دو مقدس صحیفے قرار پاتے اور ان کا مدون ان کا نبی، لیکن میں انھیں پیغمبر تدوین کہنے پر قانع نہیں، انھیں خدائے تدوین کہوں گا گو اس پر کتنے زعما چیں بہ جبیں ہوں۔ مجھے رشید حسن خاں سے محبت نہیں (کد بھی نہیں)۔ انھوں نے کبھی میرے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ میں نے اپنی کتاب 'تحقیق کا فن' انھیں پیش کی تو انھوں نے لکھا کہ میں اس کا ایک ایک لفظ پڑھوں گا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں لکھا۔ شاید کتاب کی ورق گردانی کی ہی نہیں لیکن میں کیا کروں، میں تو فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' کے مرتب کی قدر شناسی کے لیے مجبور ہوں۔ میں کہا کرتا تھا کہ اردو میں دانشوری کی روایت کمزور ہے۔ رشید حسن خاں کے دونوں کارناموں نیز ان کی کتاب 'زبان اور قواعد' کے ہوتے یہ داغ رفع ہو جاتا ہے۔

❖❖❖

مخمور سعیدی

رشید حسن خاں

’’باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا‘‘

رشید حسن خاں اردو زبان و ادب کے ایک معتبر محقق، باذوق نقاد اور سلیقہ مند مدوّن تھے، یہ ان سے منسوب ایسی صفات ہیں، جنھیں ان کے مخالفین بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ علمی امور میں اختلاف معیوب نہیں بلکہ اس سے دید و دریافت کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں جو ایک امر مستحسن ہے لیکن خاں صاحب سے اختلاف کی جسارت کم لوگوں کو ہوئی، بعض حلقوں کی طرف سے ان کی اور ان کے کاموں کی مخالفت زیادہ کی گئی۔

اختلاف اور مخالفت میں جو فرق ہے، بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ رشید حسن خاں سے زیادہ اختلافات اس لیے نہ کیے جاسکے کہ ان کے نتائجِ تحقیق اور ان کی تنقیدی رائیں ایسی صحیح سمتوں کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں جنھیں رد کردینا آسان نہیں اور انھوں نے تدوین کے بھی جو نمونے پیش کیے، مثالی کہے جاسکتے ہیں لیکن ان کی مخالفت بہت ہوئی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

دراصل رشید حسن خاں علم و فضل کی دشوار گزار منزلوں کو سر کرتے ہوئے جس طرح قدم بہ قدم آگے بڑھے اس کا حوصلہ ان کے بہت سے معاصرین نہ کرسکے۔ ان کے معاصرین نے علمی فتوحات سے زیادہ مادّی فتوحات پر نظر رکھی اور اس میدان میں وہ خاں صاحب سے بہت آگے نکل گئے۔ خاں صاحب ان کی پیش قدمی سے ذرا کبیدہ خاطر نہ ہوئے کہ ان کا مقصودِ سفر ہی کچھ اور تھا۔ ان کی پیش قدمی کا رخ ایک مختلف سمت میں رہا اور یہاں وہ ان لوگوں کو، جو خدمتِ علم وداب کی آڑ میں ذاتی امنگوں کی تکمیل کے درپے تھے، پیچھے چھوڑ گئے۔

کہا گیا کہ رشید حسن خاں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ تنک چڑھے اور گھمنڈی ہیں اور اپنے اس گھمنڈ میں دوسروں کی دل آزاری تک کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ان کی خود بینی اور خود پسندی نے انھیں مردم بیزار بنا دیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور ایسی دوسری تمام باتیں جو خاں صاحب کے بارے میں بعض لوگ کہتے رہے ہیں، ان کا تعلق خاں صاحب کی علمی شخصیت سے نہیں، نجی شخصیت سے ہے، اس لیے اگر انھیں درست بھی مان لیا جائے تو خاں صاحب کی عادات و اخلاق کے بارے میں کچھ منفی خیالات لوگوں کے ذہن میں جگہ بنا سکتے ہیں لیکن ان کے علمی اکتسابات اور کمالات پر ایسی باتیں کیا اثر ڈال سکتی ہیں! ویسے واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری کی ساری باتیں، ان بے بنیاد افواہوں کی طرح ہیں جو بد نیتی سے دیدہ و دانستہ پھیلائی جاتی ہیں اور یہ صرف انھی لوگوں کو مغالطے میں ڈال سکتی تھیں، جو خاں صاحب کو ذاتی طور پر نہیں صرف ان تحریروں کے حوالے سے پہچانتے تھے۔ اپنی تحریروں میں بلا شبہ وہ آدابِ مروّت و محبت کے قائل نظر نہیں آتے کہ اپنے قلم سے انھوں نے حقیقتوں کی تلاش اور صداقتوں کی ترجمانی کا کام لیا ہے اور اپنی علمی زندگی کے آغاز ہی سے ان کا یہ شعار رہا۔ رشید حسن خاں سے میرا غائبانہ تعارف لگ بھگ چالیس سال پہلے ہوا۔ ان دنوں میں گوپال متل صاحب کے رسالے 'تحریک' میں کام کرتا تھا۔ رسالے کی ڈاک میں ہی دیکھتا تھا۔ ایک دن شاہجہانپور سے ایک بھاری بھرکم لفافہ موصول ہوا۔ کھولا تو اس میں ایک مختصر سا خط اور ایک مفصّل مضمون تھا فیضؔ کی شاعری پر۔ خط میں لکھا تھا کہ فیضؔ ہمارے دور کے بہت مقبول شاعر ہیں لیکن اس مقبولیت کا ایک منفی پہلو بھی ہے کہ ان کی شاعری میں زبان اور بیان کے جو نقائص پائے ہیں وہ لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں، اس سے فیضؔ کے بعد آنے والے شاعر اس غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں کہ ان نقائص کا شاعری کی اچھائی یا برائی سے قریب و دور کا کوئی واسطہ نہیں۔ مضمون میں فیضؔ کے اس وقت تک کے شائع شدہ مجموعوں کو سامنے رکھ کر نہ صرف زبان و بیان کی بہت سی خرابیوں کی بلکہ فکر و احساس کی بے راہ رویوں کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ مضمون 'تحریک' میں شائع ہوا تو اس کی بازگشت دور دور تک سنائی دی۔ فیضؔ کے ساتھ غیر مشروط عقیدت رکھنے والوں نے اس کا برا مانا لیکن شاعری کے ان قدر شناسوں نے جو فیضؔ کی ذات یا ان کے شعری نظریات سے اس طرح کی کوئی جذباتی یا ذہنی وابستگی نہیں رکھتے تھے، اس کا خیر مقدم کیا۔ اس مضمون کی اثر آفرینی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد جن لوگوں نے

فیضؔ کی شاعری پر قلم اٹھایا، ان میں سے اکثر نے اس کا حوالہ ضرور دیا۔

غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہمارے دور میں جو لوگ معتبر سمجھے گئے، ان میں ایک نام مجروح سلطانپوری کا ہے۔ ان کا یہ اعتبار و امتیاز آج بھی برقرار ہے لیکن ترقی پسندوں کی بھیمڑی کانفرنس کے بعد انھوں نے نظریاتی شدّت پسندی کے زیرِ اثر بعض ایسی غزلیں بھی کہیں جو ہنگامی سیاست کے تقاضوں کی تابع مہمل تھیں۔ یہ اندازِ سخن غزل کی اس روایت کی نفی تھا جس کی توسیع ہمیں خود مجروحؔ صاحب کی اچھی غزلوں میں نظر آتی ہے اور جس کا زور ہمیشہ اس پر رہا ہے کہ ماورائے سخن بھی ہے اک بات۔ خاں صاحب کا دوسرا مضمون جو 'تحریک' نے شائع کیا، مجروحؔ کی غزل گوئی پر تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ترقی پسندی کے بے جا جوش میں ایک اچھے غزل گو شاعر کے برباد ہو جانے کے کیسے قوی امکانات ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے مجروحؔ صاحب نے جلد ہی اس روش کو خیر باد کہہ دیا اور صراطِ مستقیم کی طرف لوٹ آئے۔

رشید حسن خاں کا ایک اور ہنگامہ خیز مضمون جو 'تحریک' میں شائع ہوا 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' پر تھا جو لاکھوں روپے کے مصارف سے مشہور و معتبر لوگوں کی نگرانی میں تیار کرائی گئی تھی لیکن جو غلط بیانیوں کا پشتارہ تھی۔ خاں صاحب نے کتاب کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے مرتبین کے تسامحات کی بھی نشاندہی کی تھی اور ایسے بیانات کی بھی جو حقائق کے بجائے مرتبین کے ذہنی تحفظات بلکہ تعصّبات کو سامنے لاتے تھے۔ تسامحات کا امکان تو ہر ایک کے ساتھ ہے لیکن اپنے مفروضات کو تاریخی حقیقتیں بنا کر پیش کرنے کی کوشش ایک مجرمانہ فعل تھا جس کی خاں صاحب نے بہت سخت گرفت کی۔ ایسی غیر ذمے دارانہ کتاب کی اشاعت کسی نجی ادارے کی طرف سے بھی قابلِ گرفت سمجھی جاتی لیکن یہ کتاب تو ایک قومی ادارے نے قومی حکومت کی فراہم کردہ مالی مدد سے تیار اور طبع کرائی تھی اس لیے جب اس کی گمراہ کن نوعیت سامنے آئی تو بڑا ہنگامہ ہوا اور بالآخر یہ کتاب واپس لے لی گئی۔

خاں صاحب نے اردو املا کے مسئلے پر بھی توجہ صرف کی اور اس کی معیار بندی پر متواتر زور دیتے رہے، ان کی کتابیں 'اردو املا' جو بڑوں کے لیے ہے اور 'اردو کیسے لکھیں' جو بچوں کے لیے ہے، اسی سلسلے کی کوششیں ہیں۔ خاں صاحب سے پہلے مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جیسے بزرگ بھی اس مسئلے پر دماغ سوزی کر چکے تھے لیکن یہ خاصا پیچیدہ مسئلہ ہے یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں لیکن اس معاملے پر اپنی معروضات

میں نے 'اردو املا' پر تبصرہ کرتے ہوئے پیش کی تھیں۔ یہ تبصرہ 'تحریک' میں شائع ہوا تھا۔

رشید حسن خاں کا ایک بڑا کام اہم کلاسیکی متون کی تصحیح وتدوین اور ان کی پیشکش ہے۔ یہ کام تحقیقی ذوق کے علاوہ تنقیدی شعور کا بھی تقاضا کرتا ہے اور قدرت نے یہ دونوں صفات خاں صاحب کو دویعت کی تھیں۔ اس سلسلے کی کئی کتابیں مکتبہ جامعہ نے شائع کی ہیں جو اکثر اہلِ ذوق کی نظر سے گزری ہوں گی، ان میں ایک کتاب 'انتخاب کلام ناسخ' ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ناسخ کے کلام کا اس سے بہتر انتخاب میرے محدود مطالعے میں ابھی تک نہیں آیا، اس کا مقدمہ خاں صاحب کی ادبی سوجھ بوجھ ہی کو نہیں، تاریخی عوامل اور امور سیاست سے بھی ان کی باخبری کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ لکھنؤ میں تہذیبی وادبی سطح پر دہلی سے جو انحرافات روبہ عمل آئے، دراصل ان کی نوعیت سیاسی تھی۔ اودھ میں تاریخ نے ایک نئی بساطِ سیاست بچھادی تھی۔ اس بساط پر جو کھیل کھیلا جارہا تھا، اس کی کامیابی کی شرط تھی دہلی سے ہر معاملے میں انقطاع وانحراف اور نئے کھلاڑیوں کی اپنی امتیازی پہچان اور انفرادی شان۔ ناسخ کی شاعری کو اس عملِ انحراف کا نقطۂ عروج کہا جاسکتا ہے اور اس وقت کے لکھنوی معاشرے میں ان کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب بھی یہیں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

تدوین کے سلسلے میں خاں صاحب نے کئی ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے۔ میر امن کی 'باغ وبہار' اور رجب علی بیگ سرور کے 'فسانۂ عجائب' کے ان کے مرتب کردہ نسخے اس کی روشن مثالیں ہیں جن پر ان کے طویل مقدمات میں ان اہم کلاسیکی متون سے متعلق تمام مباحث سمٹ آئے ہیں اور بہت سے نکات روشن ہوئے ہیں۔ ان کے مستند متنوں کی تعیین اور ان کی فرہنگوں کی تیاری میں خاں صاحب نے جو محنت اور دیدہ ریزی کی ہوگی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اس طرح کے مشکل کاموں کو کبھی ہاتھ لگایا ہو۔ ان کے علاوہ مثنوی 'سحر البیان'، مثنوی 'گلزارِ نسیم'، 'مثنویاتِ شوق'، 'غرائب اللغات' اور 'زٹل نامہ' (کلیات جعفر زٹلی) کی تدوین بھی انھوں نے بڑی محنت اور لگن سے کی ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے، خاں صاحب سے میرا غائبانہ تعارف، ان کے قیامِ شاہجہانپور کے زمانے میں ہوا تھا جو ان کا آبائی شہر ہے اور ان سے پہلی ملاقات 'تحریک' کے دفتر میں ہوئی۔

'تحریک' کا عملہ تین افراد پر مشتمل تھا۔ رسالے کے مالک ومدیر گوپال متل، ان کے بڑے بیٹے پریم گوپال اور یہ خاکسار۔ ایک دن سہ پہر کے وقت میں اور پریم گوپال، دفتر

کے فرش پر بیٹھے مکتبۂ تحریک کی مطبوعات کے بنڈل بنا رہے تھے جنھیں کہیں باہر بھیجا جانا تھا۔ گوپال متل دفتر میں موجود نہیں تھے، اچانک ایک صاحب جو کرتے پاجامے اور شیروانی میں ملبوس تھے اور سر پر ٹوپی بھی تھی، تبسم زیرلب کے ساتھ وارد ہوئے اور کہا "میں رشید حسن خاں ہوں"۔ میں نے اور پریم گوپال نے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور اپنا اپنا نام بتایا۔ خاں صاحب نے تپاک سے ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور ساتھ ہی متل صاحب کے بارے میں پوچھا۔ دیر تک بیٹھے رہے اور بتایا کہ اب وہ مستقلاً دہلی آگئے ہیں۔ خاں صاحب سے مل کر خوشی ہوئی مگر وہ تصویر چکنا چور ہوگئی جو اُن کی تحریروں نے ذہن پر نقش کی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی ساٹھ ستر سالہ بزرگ ہوں گے۔ خاں صاحب کی عمر اس وقت چالیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔

خاں صاحب پر مردم بیزاری کا الزام تو سراسر بیجا ہے لیکن وہ دیر آشنا اور کم آمیز ضرور تھے۔ دہلی میں ان کے جن لوگوں سے مراسم قائم ہوئے ان میں میرے استاد مرحوم بسمل سعیدی، گوپال متل، غلام ربانی تاباں، شہباز حسین، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور بیگم ممتاز مرزا اور نوجوانوں میں ڈاکٹر اطہر فاروقی کو شاید ان سے زیادہ قربت رہی۔ اس فہرست کے آخر میں اس خاکسار کا نام بھی رکھا جاسکتا ہے۔

میرا دوسرا مجموعۂ کلام 'سیہ بر سفید' شائع ہوا تو رشید حسن خاں دلّی آچکے تھے۔ برادرم ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنے گھر پر اس کتاب کے اجرا کی تقریب رکھی۔ اس تقریب میں خاں صاحب نے میری شاعری پر ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا 'ذہن کا سفر'۔ مضمون میں انھوں نے چھوٹے شہر سے نکل کر بڑے شہر میں آبسنے والے تنہا فرد کے جذبات و احساسات کی نشاندہی میرے کلام میں کی تھی اور اس پر زور دیا تھا کہ دراصل یہ محض نقلِ مکانی نہیں، یہ گزرے ہوئے کل کو خیرباد کہہ کر آنے والے کل کی طرف پیش قدمی کا مرحلہ ہے جس سے بہ سلامت گزر سکنا زیادہ آسان نہیں ہوا کرتا کہ اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ میں ان مقامات سے سلامت روی کے ساتھ گزرا ہوں۔ یہ مضمون نہ صرف یہ کہ اس محفل میں بہت پسند کیا گیا بلکہ جب ایک رسالے میں چھپا تو وہاں سے کئی جگہ نقل ہوا اور اس کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے 'مخمور سعیدی - ایک مطالعہ' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تو اس میں بھی انھوں نے اس مضمون کو شامل کیا لیکن مجھے افسوس ہے کہ خود خاں صاحب کے کسی مجموعۂ

مضامین میں یہ جگہ نہ پاسکا۔ انھوں نے غلام ربانی تاباں کی شاعری پر بھی ایک مضمون لکھا تھا، وہ بھی ان کے کسی مجموعۂ مضامین میں شامل نہیں ہے۔

دلّی کی زندگی بڑی جاں کاہ مصروفیتوں کی زندگی ہے، دوستوں سے، بلکہ خود اپنے سے بھی ملاقات کے مواقع کم کم ہی میسر آتے ہیں، مکانی فاصلے بھی بہت زیادہ ہیں۔ مہینوں گزر جاتے خاں صاحب سے ملنا نہ ہوتا لیکن اس سے تعلق کی وہ گرم جوشی ذرا متاثر نہ ہوتی جو ایک دوسرے کے لیے ہمارے اندر موجود تھی۔ جب بھی ملنا ہوتا خاں صاحب تپاک سے ملتے اور کبھی کبھی اپنے لطف آمیز خطوں سے نصف ملاقات کی مسرت بھی وہ بخشتے رہتے، خاص طور پر اگر میری کوئی شائع شدہ یا نشر شدہ نظم و غزل انھیں پسند آجاتی تو وہ ضرور خط لکھ کر اس کی داد دیتے اور اس داد میں اپنی پسندیدگی کی وجوہ پر اس طرح روشنی ڈالتے کہ سامنے ہوں تو ان کے ہاتھ چوم لیے جائیں۔

چند برس پہلے تک دلّی میں ایسی کئی ذی علم شخصیتیں موجود تھیں کہ کسی علمی ادبی مسئلے میں الجھن پیش آنے پر ان سے رجوع کیا جاسکتا تھا۔ اب ایسے لوگ کم ہی رہ گئے ہیں، ایسے موقعوں پر مجھ حقیر فقیر کا دھیان سب سے پہلے رشید حسن خاں کی طرف ہی جاتا۔ دلّی آنے کے کچھ ہی مدت بعد کسی وجہ سے خاں صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ واپس شاہجہانپور چلے جائیں۔ ان کے اس فیصلے کی اطلاع جب ان کے کچھ قریبی دوستوں کو ملی، جن کے نام اوپر آچکے ہیں تو انھوں نے خاں صاحب کے لیے ایک الوداعی محفل کا اہتمام کیا۔ اس محفل میں میں نے ایک مختصر نظم پڑھی تھی جس میں خاں صاحب کے ساتھ اپنے تعلق قلبی کے اظہار کے علاوہ ان کے اس حسنِ سلوک اور اس فراخدلانہ تعاون کا بھی ذکر تھا جو تشنگان علم کو ان سے ملتا رہا تھا۔ بعد میں خاں صاحب نے اپنا ارداہ ملتوی کردیا اور ملازمت سے سبکدوشی تک دلّی ہی میں رہے۔

خاں صاحب کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ شعر کے فنّی محاسن یا معائب کی بحث ہو، کوئی عروضی مسئلہ ہو، زبان و بیان کی خوبیوں یا خامیوں کا معاملہ ہو، صحت یا عدم صحت متن کا سوال ہو، لغات، محاوروں، کہاوتوں اور روزمرہ کی بات ہو؛ خاں صاحب ہر سوال کا جواب اتنی وضاحت و صراحت کے ساتھ دیتے کہ محسوس ہوتا سامنے کوئی دبستاں کھل گیا ہے۔ اتنا بھرپور علم اوّل تو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اور جنھیں نصیب ہوجاتا ہے وہ اس کے صرف میں اکثر بخل سے کام لیتے ہیں۔

ایک اور معاملے میں میں نے اکثر لوگوں کو، بالخصوص ان لوگوں کو جن کی کارکردگی کسی خاص شعبے میں تسلیم کی جا چکی ہو، بخیل پایا ہے، وہ ہے دوسروں کے اچھے کاموں کا اعتراف۔ خاں صاحب اس معاملے میں فراخدل تھے۔ غالب صدی تقریبات کے موقع پر دہلی کے دو رسائل 'اردوے معلی' اور 'تحریک' نے اپنی خصوصی اشاعتوں میں غالب کی فارسی کتاب 'دستنبو' کے اردو تراجم شائع کیے، 'اردوے معلی' میں جو ترجمہ شائع ہوا وہ خاں صاحب کے نام سے نہیں تھا لیکن کیا ہوا انھی کا تھا۔ 'تحریک' میں جو ترجمہ چھپا وہ میں نے کیا تھا۔ دونوں رسالے ساتھ ساتھ منظر عام پر آئے۔ خاں صاحب نے میرا ترجمہ پڑھا تو اس کی داد ان لفظوں میں دی کہ ''آپ نے صرف کتاب کے مفہوم کو نہیں غالب کے اسلوب کو بھی اردو میں منتقل کرلیا ہے۔''

میں اسے دہلی اور اہلِ دہلی کی خوش نصیبی پر محمول کرتا ہوں کہ خاں صاحب ایک مدتِ مدید تک دہلی میں رہے۔ چند برس پہلے دہلی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد اپنے وطن شاہجہاں پور واپس چلے گئے تھے۔ کسی شہر میں ان جیسے لوگوں کی موجودگی اس شہر کے علمی اور ادبی منظر نامے کو وقار اور اعتبار بخشتی ہے اور وہاں کی تہذیبی زندگی کو تابانی اور درخشانی عطا کرتی ہے۔ خاں صاحب جن تہذیبی قدروں کے امین تھے موجودہ دور میں ان کی پامالی کا منظر عام ہے لیکن خاں صاحب سے مل کر یہ منظر جیسے دھندلانے لگتا اور حالی کا یہ مصرع مجسم ہو کر سامنے آ کھڑا ہوتا:

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

خاں صاحب نے عمر طبیعی پائی۔ ان کے انتقال کی خبر ملنے سے تین چار روز پہلے ان سے فون پر بات ہو رہی تھی، کہنے لگے: بھائی اب میں اسّی کے لپیٹے میں ہوں، کئی عوارض نے آگھیرا ہے مگر بہت سے کام ہیں جو ابھی تشنۂ تکمیل ہیں۔ میں نے کہا: خاں صاحب! ابھی آپ بہت جئیں گے اور مزید کام کریں گے۔ اس وقت وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد سفرِ آخرت پر روانہ ہونے والے ہیں۔ خاں صاحب کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے، اسے پُر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ انھوں نے پوری زندگی علم وادب کی خدمت میں صرف کی، اس خدمت کا بھرپور اعتراف بھی ہوا اور امید ہی کیا یقین ہے کہ آئندہ بھی ان کے کاموں کی قدر و قیمت محسوس کی جاتی رہے گی۔

○○○

یعقوب میراں مجتہدی

رشید حسن خاں: چند یادیں

۲۳ر فروری ۲۰۰۶ء کی صبح تھی۔ فون کی گھنٹی بجی، میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے رشید حسن خاں صاحب کی آواز آئی۔ کہنے لگے بہت دنوں سے آپ کی آواز سنائی نہیں دی اور پھر ڈکشنری سے متعلق پوچھنے لگے۔ میں ہر پندرہ بیس روز میں انھیں فون کرتا تھا، اس مرتبہ بہت تاخیر ہوگئی۔ چوں کہ ان کے پاس STD نہیں ہے اس لیے انھوں نے باہر سے مجھے فون کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مجھ سے اور ڈکشنری سے کتنا لگاؤ تھا۔

میں انھیں شخصی طور پر نہیں جانتا تھا، البتہ رسالوں اور ہفت روزہ 'ہماری زبان' سے ان کے نام اور کام سے واقف ہوا۔ وہ کتنے قابل تھے اس کا اندازہ پروفیسر گیان چند جین کے بیان سے ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''رشید حسن خاں کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور پچاس اساتذہ کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو رشید حسن خاں کا پلڑا ہی جھک جائے گا''۔

آٹھ سال پہلے ایک خط میں، میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میری اردو-انگریزی ڈکشنری کا اردو Portion ایک نظر دیکھیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ بخوشی اس کام کو کریں گے۔ یہ ان کے لیے زحمت نہیں رحمت ہے۔ اس وقت میری ڈکشنری دس ہزار ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل تھی۔ (بعد میں Computerise کرنے پر اس ڈکشنری کے ۲۸۱۲ صفحات ہوگئے) میں انھیں تین تین سو ٹائپ شدہ صفحات بذریعۂ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا کرتا اور وہ دیکھ کر انھیں واپس کردیتے۔ اس طرح ان سے ربط ضبط بڑھا۔ پھر میں نے انھیں فروری ۲۰۰۰ء میں میری لڑکی عفت فاطمہ کی شادی کی دعوت دی۔ انھوں نے اسے بہت خوشی سے قبول کرلیا اور وہ ۲۶ر فروری ۲۰۰۰ء کو شام میں سکندرآباد اسٹیشن پہنچے۔ میں نے اور چند دوسرے حضرات نے ان کا استقبال کیا۔ میں نے انھیں ملک پیٹ کے ایک

ہوٹل میں ٹھہرایا۔ میرا لڑکا صبح کار میں جاکر انھیں میرے گھر لاتا اور پھر ان کی دن بھر کی مصروفیات کے بعد انھیں ہوٹل چھوڑ آتا۔ انھوں نے آتے ہی کہا کہ وہ زینت ساجدہ سے ملنا چاہتے ہیں، ان سے ان کے پرانے روابط ہیں۔ میں دوسرے دن یعنی ۲۷رفروری کو رشید حسن خاں صاحب کو زینت ساجدہ صاحبہ کے گھر لے گیا۔ وہ دونوں مل کر بہت خوش ہوئے۔ رشید حسن خاں صاحب تیس سال پہلے ریسرچ کے سلسلے میں سالار جنگ میوزیم آئے تھے۔

وہ ۲۷رفروری ۲۰۰۰ء کی شام میں بچی کی شادی میں شریک ہوئے۔ وہاں بھی کئی لوگوں نے ان سے ملاقات کی۔ وہ دس دن تک میرے مہمان رہے اور ان دس دنوں میں وہ بے حد مصروف رہے۔ چاروں یونیوسٹیوں (عثمانیہ، حیدرآباد، اوپن اور اردو) میں انھیں لکچر دینے بلایا گیا۔ پروفیسر لئیق صلاح، پروفیسر انور معظم اور پروفیسر افضل محمد نے انھیں کھانے پر مدعو کیا۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ ایوانِ اردو اور اردو ہال میں بھی ان کی تقریریں ہوئیں۔ اردو ہال میں انھوں نے بیگ احساس صاحب کی کتاب کی رسم اجرا انجام دی۔ وہ جب تک میرے پاس رہے کئی اساتذہ اور دوسرے لوگ ان سے ملنے آتے رہے۔ ہر کوئی ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ ان دس دنوں میں تمام اخبارات میں انھی کا تذکرہ رہتا تھا۔ شاہجہاںپور واپس ہونے کے بعد انھوں نے مجھے ایک شکریے کا خط لکھا جس میں لکھا تھا کہ میری عزت افزائی میں آپ نے جو سعی فرمائی ہے اس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔

'کتاب نما' میں میری ڈکشنری پر پروفیسر اشرف رفیع کا ایک طویل مضمون چھپا تھا۔ اس مضمون کو پڑھ کر انھوں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ''ڈاکٹر اشرف رفیع کا مضمون واقعی خوب ہے۔ ایک تو اس معنی میں کہ اسے پڑھنے کے بعد پہلا تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرمائشی تحریر نہیں ہے، اپنی رائے ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ یہ محض ستائشی تحریر نہیں، مقالہ نگار نے پڑھ کر بہت سی کتابیں دیکھ کر اور لغت نویسی کے مسائل سے آگہی کے بعد یہ تحریر لکھی ہے۔ انھوں نے مستشرقین کے لغات کے جو حوالے دیے ہیں، حروف و علامات تلفظ کے تحت یہی ایک بات ان کی واقفیت اور ان کے مطالعے کی شہادت دیتی ہے۔ وہ جو روایتی انداز کے عامیانہ مضامین لکھے جاتے ہیں، یہ مضمون ان سب سے بالکل مختلف ہے اور اسی لیے قابلِ توجہ ہے''۔ میں نے ان سے ڈکشنری پر مضمون لکھنے کی خواہش کی تھی تو

انھوں نے لکھا کہ اشرف رفیع کے مضمون کے بعد میرے مضمون کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی کی بھی تعریف کرنے میں بہت محتاط رہتے تھے، مگر انھوں نے اشرف رفیع کے مضمون کی دل کھول کر تعریف کی۔

پوری ڈکشنری دیکھنے کے بعد انھوں نے اپنے خط میں لکھا: ''دیکھیے صاحب اس پورے ملک میں تو مجھے کوئی شخص اب نظر آتا نہیں جو تنِ تنہا اتنا بڑا کام کر سکے اور کام بھی ایسا جس کی افادیت اور اہمیت کے سبھی قائل ہیں اور مانتے ہیں۔ آپ کا یہ کام تاریخی حیثیت رکھتا ہے''۔

میرے نام ان کے بے شمار خطوط آئے۔ میری بچی کے تعلق سے انھوں نے لکھا تھا بیٹی 'تمھارے طفیل میں تو میں حیدرآباد آیا'۔

وہ 'مصطلحاتِ ٹھگی' مرتب کر کے شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ آندھرا پردیش اورینٹل مینو اسکرپٹ لائبریری میں اس کا اصل نسخہ موجود ہے، اس کی زیروکس کی انھیں ضرورت تھی، میں نے اس کی زیروکس حاصل کر کے انھیں بھیج دی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر اس کو مرتب کر کے شائع کر دی۔ ایک کاپی مجھے بھجوائی۔ اس کے دیباچے میں چار مرتبہ میرا ذکر کیا۔

۲۳ر فروری کی صبح ان کا فون آیا تھا اور ۲۶ر فروری کی شام میں ان کے انتقال پُر ملال کی خبر ملی۔ آفتابِ علم و ادب ۸۱ سال کی عمر میں غروب ہوگیا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھے۔ ان کا انتقال میرا شخصی نقصان ہے۔ ان کو میری ڈکشنری کی طباعت کی بہت فکر تھی۔ افسوس یہ ان کی زندگی میں نہ چھپ سکی۔ اب انشاء اللہ جلد چھپ جائے گی۔

□□□

اشفاق محمد خاں

رشید حسن خاں

1963 کا واقعہ ہے کہ ایک دن مجھے ڈاکٹر عبدالعلیم[1] (مرحوم) نے بلاکر دریافت کیا کہ 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' کی کتنی جلدیں فروخت ہو چکی ہیں؟ میں نے موصوف کو فوراً تعداد (غالباً دس یا بارہ) بتادی۔ علیم صاحب نے مجھے ایک خط رجسٹرار یونیورسٹی کا دکھایا اور فرمایا کہ اب اس کتاب کی فروخت بالکل بند کر دیجیے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آخر ماجرا کیا ہے کہ اس قدر اہم تاریخ کی کتاب پر پابندی لگادی گئی۔

ہاں صاحب تو 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' کی فروخت بند کردی گئی۔ میں نے دوسرے دن آفس جا کر علیم صاحب سے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا کہ اس کتاب کی فروخت پر پابندی لگائے جانے کی آخر وجہ؟ (علیم صاحب کو جن حضرات نے قریب سے دیکھا ہے، شاید وہ درج ذیل گفتگو کی تصویر کشی سے محظوظ ہو سکیں گے۔)

میرے اس سوال پر محترم کے سرخ چہرے کی سرخی دگنی ہوگئی اور حسبِ عادت غصّے والی کیفیت کے ساتھ ایک لمحے کے لیے سر اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور فوراً سر جھکاتے ہوئے بولے: آپ کو نہیں معلوم؟

میں : جی نہیں۔

علیم صاحب : وہ بے شمار اغلاط کا مجموعہ ہے۔

میں : کس طرح کی اغلاط ہیں صاحب؟

---

[1] علیم صاحب اس زمانے میں صدر شعبہ عربی، ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز اور ڈائرکٹر یونیورسٹی پبلی کیشنز تھے اور میں پبلی کیشنز کا آفس انچارج تھا۔

علیم صاحب : (جھنجھلا کر) یہ سرور صاحب سے جا کر پوچھیے۔ بس اتنا سن کر میں کرسی پر سے اٹھا اور دو قدم ہی چلا تھا کہ (حسبِ معمول) علیم صاحب: ذرا سنیے۔

میں : جی، ارشاد۔

علیم صاحب : ابھی اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیجیے گا۔

میں : بہتر ہے۔

(جیسے ہی مڑا تھا کہ حسب عادت)

علیم صاحب : اور ہاں سنیے۔

میں : جی فرمائیے۔

علیم صاحب : ایک جلد اس تاریخ کی کل چپراسی کے ہاتھ میرے گھر بھجوا دیجیے۔

میں : کیا آپ نے ابھی تک اس تاریخ کو نہیں دیکھا؟

علیم صاحب : جی نہیں۔ اس پر جو تبصرہ رسالہ ''تحریک'' میں رشید حسن خاں کا شائع ہوا ہے، بس وہ پڑھا ہے۔ آپ بھی پڑھ لیجیے۔

راقم الحروف کا رشید حسن خاں صاحب سے غائبانہ تعارف پہلی بار علیم صاحب کے مزید اس جملے سے ہوا: ''ارے بھئی رشید حسن خاں کے تبصرے نے اس تاریخ کی فروخت پر پابندی لگوادی ہے۔''

تیسرے دن جب میں آفس ذرا دیر سے پہنچا تو احباب سے معلوم ہوا کہ علیم صاحب مجھے دریافت کر رہے تھے۔ میں فوراً علیم صاحب کے پاس گیا۔ علیم صاحب نے چپراسی کی زبانی کہلا بھیجا کہ جن جن بک سیلرز کے پاس یہ کتاب پہنچ چکی ہے، اگر ممکن ہو تو واپس منگوا لیجیے۔

مختصر یہ کہ رشید حسن خاں کے تبصرے نے یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے باہر اردو کی باقی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور اس حادثے کی اطلاع اخبارات تک پہنچ گئی۔ اس تاریخ ادب کے متعلق 'صدق جدید' لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک بیان شائع ہوا تھا، پہلے اسے ملاحظہ فرمائیں:

''ایک ذمے دار بتصرہ نگار رشید حسن خاں صاحب (دہلی یونیورسٹی) کے قلم سے ماہنامہ 'تحریک' (دہلی) میں:

کتاب کا سب سے زیادہ قابلِ اعتراض حصہ اس کا پہلا باب ہے جس کا

عنوان ہے 'سیاسی اور تمدنی پس منظر'۔ اس بات کی تین خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعی طور پر کتاب سے اس کا کم سے کم تعلق ہے، بیشتر غیر متعلق باتوں پر مشتمل ہے...... دوسری یہ کہ مقالہ نگار نے جگہ جگہ ایسا اندازِ بیان اختیار کیا ہے جو بہت سے لوگوں کی دل آزاری کا سبب بن گیا ...... مقالہ نگار کو اس کا حق ہے کہ وہ عظیم المرتبہ صوفیہ کو خیرات خوار سمجھیں، اورنگ زیب کو دنیا کا بدترین حکمراں مانیں، اکبر کے دینِ الٰہی کو منشورِ انسانیت قرار دیں۔ ان کو یہ بھی حق ہے کہ وہ مسلمان بادشاہوں کے خالص حکومتی اقدامات کو 'مسلم آئین حکمرانی کے مسلمہ اصول' قرار دے کر طنز و تعریض کے تیروں سے اپنا ترکش خالی کریں اور اس طرح اپنی وسیع الخیالی یا قوم پرستی کی صفت میں کچھ اور اضافہ کرلیں۔ لیکن ان کو اس کا کوئی حق نہیں کہ وہ تاریخِ ادب کی کسی ایسی کتاب میں جو محض ان کے اندازِ فکر کی ترجمانی کے لیے مرتب نہیں کی گئی ہے، ان مفروضات کو پیش کر کے نارسیدہ طلبہ کو اپنے مخصوص خیالات کی تلقین کا نشانہ بنائیں۔ تاریخِ ادب کی کتابیں اس لیے مرتب نہیں کی جاتیں کہ ان سے کوئی شخص اپنے ذاتی خیالات کی نشر و اشاعت کا کام لے، جب کہ ایک قابلِ ذکر گروہ ان کو غلط سمجھتا ہو۔

ذکر علی گڑھ کی 'تاریخ ادب اردو' کا ہے جس کی تیاری کا غلغلہ مدت سے بلند تھا اور جس کی تحریر و ترتیب کے لیے شہرہ یہ تھا کہ یہ جدید مغربی اصول پر ہوگی اور اس کے اڈیٹر سرور صاحب ہوں گے۔ کتاب میں علمی و رتاریخی تحقیقی حیثیتوں سے جو عیب بہ کثرت موجود ہیں، ان کی افسوس ناک تفصیل تو رشید حسن خاں صاحب کے اصل مقالے میں ملے گی۔ یہاں ذکر صرف اس کے مذہبی و ملّی پہلو کا ہے۔ کون فرض کرسکتا تھا کہ مسلم آزاری کا یہ ریکارڈ ایک 'مسلم' ادارہ (یعنی مسلم یونیورسٹی کا ایک شعبہ) قائم کرے گا۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی ہجو تو بہتوں کا شعار رہ چکا ہے۔ مسلم آئین حکومت کی بدگوئی کرنے والے بھی دنیا میں کم نہیں ہیں۔ صوفیائے کرام کی تحقیر و توہین سے بھی آلودہ بہت سے قلم رہ چکے

ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ تھا کہ ان مباحثِ عالیہ کے لیے جگہ 'تاریخِ ادب اردو' کے سے بے ضرر موضوع میں بھی نکال لی جائے گی اور تاریخِ ادب اردو کے ذہین وطباع اڈیٹر صاحب انھی لوگوں کے سُر میں سُر ملانا قرینِ مصلحت تصور فرمائیں گے۔'' (صدق جدید، 8 نومبر 1963)۔

'صدق جدید' میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ تحریر پڑھنے کے بعد وہ حضرات بھی جو تاریخ کی فروخت پر پابندی لگانے کو سرور صاحب وغیرہ کے خلاف ایک سازش تصور کر رہے تھے، بالکل خاموش ہو گئے اور اسی میں اپنی نجات وفلاح سمجھی کہ اب رشید حسن خاں صاحب کے تبصرے پر کوئی تبصرہ نہ کیا جائے۔ 15 فروری 1964 کے 'صدق جدید' میں درج ذیل عنوان کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادی کی دوسری تحریر شائع ہوئی:

''ایک صحیح فیصلہ۔ بڑی مسرت کے ساتھ دہلی کے ماہ نامہ 'تحریک' میں یہ خبر پڑھنے میں آئی:

اردو ادب اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بہی خواہوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ 'علی گڑھ تاریخِ ادب اردو' کی فروخت روک دی گئی ہے۔ تحریک میں اس کتاب پر جو تبصرہ شائع ہوا اس کی اردو کے مشہور ترین اخباروں، جریدوں اور اربابِ ادب نے تائید کی تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ اربابِ اقتدار نے رائے عامہ کا احترام کیا اور اس کتاب کی فروخت کو بند کر دیا جو ایک ایسے تعلیمی ادارے کی پیشانی پر داغ تھی جو درخشاں روایات کا حامل ہے۔ اس سے (فلاں اور فلاں صاحب) کی رسوائی میں تو ضرور اضافہ ہوگا لیکن یونیورسٹی کی پیشانی سے داغِ رسوائی دُھل جائے گا۔ ہم اس فیصلے کے لیے ارباب بست وکشاد کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

بیشک یہ فیصلہ قابلِ مبارک باد ہے اور ملّت کا صحیح احتجاج کامیاب رہا لیکن اس کی اصلی داد رشید حسن خاں صاحب کو ملنی چاہیے جن کا تبصرہ واقعی بصیرت افروز تھا۔ کیا اچھا ہو کہ اب کتاب نظر ثانی وترمیم کے لیے جن صاحبوں کے سپرد کی جائے اس جماعت کے ایک رکن خود رشید حسن خاں صاحب ضرور ہوں۔'' (صدق جدید، 15 فروری 1964)

اس ہنگامے کے بعد ہوا یہ کہ لوگ اس تاریخ کا نام تو بھول گئے مگر اس کے حوالے

سے رشید حسن خاں صاحب کے نام، ان کے ادبی، تحقیقی کارناموں اور تنقیدی صلاحیتوں کی جستجو میں لگ گئے۔ خاں صاحب اس وقت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک تھے اور راقم الحروف ایم.اے، پی ایچ ڈی کے چکر میں علی گڑھ میں بھلے برے دن گزار رہا تھا۔ فارغ التحصیل ہو کر جب میں روزگار کی تلاش میں دہلی پہنچا تو وہاں پرانے احباب پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر اسلم پرویز سے جواہرلال نہرو یونیوسٹی میں ملاقات ہوئی اور اتفاق سے مجھے بھی یہاں روزگار نصیب ہوگیا۔ ان دونوں احباب کی وساطت سے ایک ایسی بھی مبارک گھڑی آئی کہ میری ملاقات رشید حسن خاں صاحب سے ہوئی۔ چند ملاقاتوں میں ہی خاں صاحب کی دلکش، دلچسپ اور عالمانہ شخصیت نے مجھے ان سے بہت قریب کر دیا اور کچھ ایسا محسوس ہوا گویا مجھے کوئی کھوئی ہوئی قیمتی شے مل گئی ہو۔ بہرحال اس قربت سے فائدہ اٹھا کر رفتہ رفتہ میں نے اپنے ایم فل کے طلبہ کے تحقیق و تدوین سے متعلق کورس کی تیاری کے سلسلے میں خاں صاحب کو لکچر دینے کے لیے زحمت دینا شروع کر دی۔ خاں صاحب نے ہمیشہ میری دعوت قبول کی اور جواہرلال نہرو یونیورسٹی میں تشریف لائے۔ راقم الحروف بھی ان کے بیش قیمت لکچرز سے مستفید ہوا۔

مخدومی رشید حسن خاں صاحب میرے بزرگ ہیں۔ میں ذاتی طور پر 'بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال' کا قائل ہونے کی بنا پر خاں صاحب کی بزرگی اور برتری کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک کسی شخص کی بزرگی اور برتری اس کی شخصیت جن عناصر سے تعمیر و تشکیل پاتی ہے ان پر منحصر ہے۔ ان عناصر میں اول عقل و دانش والی صفت ہے۔ دوم، مرتبۂ علم و فضل اور کمالِ فن ہے اور سوم جسے ہم عام طور پر 'عظمتِ کردار' کہتے ہیں۔ ان تین عناصر سے مرکب شخصیت کو بزرگ اور برتر ہونے کا اہل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سرِدست میں اس طرح کی بزرگ و برتر شخصیت کا نام رشید حسن خاں تجویز کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ بلا شبہ ان کی شخصیت میرے نزدیک سرتا پا آدمیت سے عبارت ہے۔ مزید برآں یہ کہ رشید حسن خاں صاحب جن کے اسلاف اگر تلوار کے دھنی تھے تو خود رشید حسن خاں کے حصے میں ایک ایسا قلم آیا ہے جو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ دھاردار ہے۔ فیض احمد فیضؔ کی شاعری پر قلم اٹھانے کی جرأت خاں صاحب سے پہلے کسی کو نہیں ہوئی۔ انھوں نے روایتی تنقید نگاری سے ہٹ کر اپنے منفرد اسلوب اور منفرد تنقیدی نقطۂ نظر سے 'فیض کی شاعری کے چند پہلو' پر جس انداز سے تبصرہ فرمایا ہے یہ انھی کا حصہ ہے اور سچ یہ ہے کہ خاں صاحب سے میری

دلچسپی، قربت اور یگانگت کا دوسرا پہلو یہ مضمون بھی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی طبیعت کے مطابق خاں صاحب کے تمام تنقیدی مضامین جو ان کے مجموعے 'تلاش وتعبیر' میں شامل ہیں، ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ عرصۂ دراز کے بعد کسی کتاب کے پڑھنے میں بڑا ہی مزا آیا۔ خاں صاحب کا شائستہ لہجہ، شگفتہ زبان اور رواں دواں اسلوب میں حقائق کا بے باکانہ بیان دماغ کی بند کھڑکیوں کو کھولتا چلا جاتا ہے۔ درج ذیل بیان آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

> ''فیض کی اکثر غزلیں سپاٹ اور سرسری اشعار کا مجموعہ ہیں۔ اس کے علاوہ زبان وبیان کے ایسے معائب ان میں موجود ہیں کہ خوش مذاقی آنکھیں بند کرلیتی ہے۔ کہیں بندشیں سست ہیں، کہیں تعبیرات ناقص ہیں اور کہیں یہ صورت ہے کہ ایک مصرع ترشا ہوا ہے اور دوسرا مصرع اس کے برابر کا نہیں۔ ردیفیں جگہ جگہ اُکھڑی سی ہیں۔ اور بہت سے قافیوں کو جن پہلوؤں سے بٹھایا گیا ہے وہ زبانِ حال سے فریاد کناں ہیں۔ بہت سے اشعار میں مفرد لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال میں بے طرح بے پروائی سے کام لیا گیا ہے جس کی وجہ سے زبان کے بڑے عیب اور بیان کے واضح اسقام نمایاں ہوگئے ہیں......'' (تلاش وتعبیر، صفحہ 97)

یہ تبصرہ پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ شاید اس لیے کہ اس سے قبل فیض کی شاعری پر اس طرح کا بے باکانہ تبصرہ یا تنقید میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ ہم سب ترقی پسند فیض کی ذات اور ان کی تخلیقات سے شاید اندھی عقیدت رکھتے تھے اور ان کو نہایت منکسر مزاج، علم دوست، بے نیاز اور بے غرض انسان سمجھتے تھے مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کچھ نہ تھا اور غالباً رشید حسن خاں کی اس طرح کی تنقید کا نتیجہ ہی یہ ہوا کہ لندن کے فیض سمینار میں شرکت کرنے والے مندوبین اور مقالہ نگاروں کی فہرست جب آخری منظوری کے لیے فیضؔ صاحب کے سامنے پیش کی گئی تو اس فہرست میں سے کئی نام فیضؔ نے نکال دیے۔ ان نکالے گئے ناموں میں سے ایک نام رشید حسن خاں صاحب کا بھی تھا (ایک معتبر راوی کی روایت کے مطابق۔)

میں رشید حسن خاں صاحب کو گروہ بند یا نظریہ ساز قسم کے ناقدین سے الگ ادب کا ایک منفرد، معتبر اور غیر جانب دار ناقد تسلیم کرتا ہوں اور ان کی ذات میں وہ تمام عالمانہ، ناقدانہ اور مردم شناسی کے اوصاف پاتا ہوں جن کی بنا پر غالبؔ نے کہا تھا:

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد

بلاشبہ ایسی نکتہ سنج، پاکیزہ اخلاق پسندیدہ اور روح بالیدہ صفات کے حامل انسانوں کو شاید ہمیشہ زندگی کے بے پناہ تلخ وترش حقائق کا ذائقہ شناس ہو کر طرح طرح کے نشیب وفراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاں صاحب نے بھی بڑی ریاضت، بے حد مشقت، شرافت، دیانت اور نفاست کے ساتھ زندگی کے حقائق کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ مردانہ وار مقابلہ بھی کیا ہے۔ دریوزہ گری اور بے جا انانیت ان کا مزاج نہیں۔ وہ خودداری، اعلاظرفی اور کچھ کچھ قلندری جیسی صفات و اقدار کا ایک حسین تہذیبی گلدستہ ہیں جن کے پاس گھنٹوں بیٹھیے، کچھ سنیے، کچھ سنائیے۔ کچھ سیکھیے اور خوش اٹھیے۔

تحقیق کے سلسلے میں ہمارے علمائے کرام نے بہت کچھ لکھا ہے اور طرح طرح کی تعریفات اور اصطلاحات سے لفظ 'تحقیق' کے معنی اور مطالب پر روشنی ڈالی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ تحقیق کا کام تنقید سے زیادہ جان لیوا ہے اور اس کا عملی حق وہی محقق ادا کرسکتا ہے جس کی فطرت میں تلاش وجستجو کا مادہ ہو، اور وہ اشیا کو دو دو چار کے حساب سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ نیز خود محقق کی شخصیت اور کردار حق گوئی اور بے باکی کی صفات سے آراستہ ہو۔ بصورتِ دیگر کوئی بھی محقق اور ناقد کسی طرح کے علمی اور ادبی کارناموں کے تحقیقی اور تنقیدی رشتوں، موضوع اور ہیئت کی نسبتوں، زبان وبیان کی لطافتوں، نزاکتوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر رہے گا اور اس کی تحقیق وتنقید لفظوں کے کھیل سے زیادہ قدر و قیمت کی حامل نہیں ہو سکے گی۔ ہمارے بعض صاحبِ بصیرت وبصارت نقاد اس راز کو دانستہ طور پر نہ صرف نظر انداز کرتے ہیں بلکہ اپنی کمزوریوں اور ناقص فکر اور پُرفریب طرزِ زندگی کی پردہ پوشی کی خاطر طرح طرح کی اصطلاحیں گڑھتے رہتے ہیں۔ مثلاً مثبت تحقیق اور منفی تحقیق کی اصطلاحیں، جو راقم الحروف کی سمجھ سے کم از کم بالاتر ہیں۔ تحقیق کا تعلق حق وصداقت سے ہوتا ہے، اس لیے تحقیق صرف تحقیق ہے نہ کہ مثبت اور منفی۔

بلاشبہ رشید حسن خاں صاحب کے تحقیقی کارناموں اور مشاغل کو ہم حق وصداقت کے اعلا معیار پر رکھ سکتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ عصر حاضر میں ان کی تحقیقی سرگرمیاں اردو زبان وادب کے سرمایے میں ایک بیش بہا اور مثالی اضافہ ثابت ہوں گی۔

❖❖❖

اسلم پرویز

رشید حسن خاں: ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیت

دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی روایت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے لیکن روایت کے ساتھ ہر شخص کا تعلق ایک سا نہیں ہوتا۔ بے شمار لوگ تو وہ ہیں جو اپنی روایت سے بے خبر اور بے گانے ہوتے ہیں۔ روایت کے ساتھ رشتہ استوار رکھنے والوں میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کے ہاں روایت کے زمانی ضابطوں کا کوئی تصور نہیں ہوتا اور جو روایت کے بارے میں ایک طرح کی ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو روایت پرست کہا جاسکتا ہے۔ روایت پرستوں کو اس وقت زبردست بحران کا سامنا ہوتا ہے جب کسی عبوری دور کے زمانی ضابطے روایت کے چراغوں کی لو کو مدّھم کر دیتے ہیں جب کہ روایت پرست صرف انھی چراغوں کی روشنی میں راستہ چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ روایت کے ساتھ رشتہ استوار رکھنے والوں میں دوسری طرح کے لوگ وہ ہیں جن کی شخصیت میں روایت کا امتزاج عقلی اور جذباتی دونوں سطحوں پر ہوتا ہے۔ گویا ان کے ہاں روایت کا عرفان اور احترام بھی ہوتا ہے اور اس کی توسیع اور بقا کا جذبہ بھی۔ انھی لوگوں کو صحیح معنوں میں روایت کا امین کہا جاسکتا ہے۔ روایت کی مختلف جہات ہیں اور علاحدہ علاحدہ سیاق وسباق میں اس کی الگ الگ سطحیں بھی۔ اس لیے کسی فرد واحد کے تعلق سے روایت کی تخصیص بھی ضروری ہے۔ اور جب تذکرہ رشید حسن خاں کا شروع ہوا ہے تو آپ یقیناً یہاں میرے ہم خیال ہوں گے کہ رشید حسن خاں کا شمار ان لوگوں میں ہے جو ہماری قدیم ادبی روایت کے امین ہیں۔ روایت کی یہ امانت ان تک اور ان کے ساتھ ان کے کئی دوسرے ہم عصروں تک حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسی شخصیتوں کے واسطے سے پہنچی ہے۔ روایت پرست اور روایت کے امین کے درمیان خط کھینچنا اس لیے ضروری تھا کہ ہم واضح خطوط پر اپنی بات آگے چلائیں۔ روایت کے امین کا کام روایت کو،

جو ماضی کی امانت ہے، حال کی وساطت سے مستقبل تک پہنچانا ہے جو اس کا حقیقی وارث ہے۔ اس اعتبار سے گویا کسی روایت کے امین کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ماضی سے اپنی پیوستگی اور حال سے وابستگی کے ساتھ ساتھ مستقبل کی نیابت کے فرائض بھی انجام دے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں اس لیے کہ یہاں تمام تر لیاقت اور صلاحیت کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص ذہنی رویے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ ذہنی رویہ ہے روایت کے معاملے میں ہر طرح کے تعصب اور تنگ نظری کو جھٹک کر الگ کر دینے کا، ایک سائنٹفک نقطۂ نظر اختیار کرنے کا اور حال کی ناگزیر حقیقتوں کو کھلے دل اور دماغ کے ساتھ تسلیم کرنے کا۔ مختصر یہ کہ اس ذہنی رویے کا دوسرا نام ہے روشن دماغی۔ رشید حسن خاں یقیناً قدیم ادبی روایت کے پرستار اور دل دادہ ہیں۔ ان کی اب تک کی تمام زندگی اس روایت کو گلے لگا کر گزری ہے یہاں تک کہ زندگی کے ایک خاص موڑ پر انھوں نے اس روایت کی خدمت کو مشغلۂ حیات بنا لیا۔ چناں چہ پچھلے لگ بھگ پینتیس سال سے ادبی مشاغل ان کا اوڑھنا بھی ہیں اور بچھونا بھی۔ لیکن اس میدان میں ان کی شہرت اور کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ روشن دماغ بھی ہیں۔

تحقیق ایک سنجیدہ اور علمی مشغلہ ہے، اگر چہ بعض لوگوں کی نظر میں یہ ایک انتہائی خشک موضوع ہے۔ رشید حسن خاں ایک خوش طبع انسان ہیں اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک کھلا ذہن رکھتے ہیں اور اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں زمانۂ موجود کے انسان کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر تحقیق ان کا موضوع ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دقیانوسیت کی مکڑی نے ان کے گرد اپنا جال بن کر انھیں اس میں قید کر دیا ہو اور وہ ایسے ہی کرم خوردہ سے لگنے لگے ہوں جیسی کرم خوردہ کتابوں سے انھیں عام طور پر واسطہ رہتا ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے قدیم ادب کے بہت سے گوشوں پر سے مکڑی کے جالے صاف کر کے انھیں آج کے سورج کی دھوپ دکھلائی ہے۔

رشید حسن خاں جب دلی آئے تو پہلے پہل کچھ دنوں ان کا قیام سرسید روڈ پہ سرسید کے مکان میں رہا۔ جامع مسجد کے اطراف میں اس وقت ڈی۔ اے۔ کا وہ بل ڈوزر نہیں چلا تھا جو اور چیزوں کے ساتھ جامع مسجد کے ادبی ٹھکانوں کو بھی ڈھاتا ہوا نکل گیا تھا۔ چناں چہ روزانہ شام کو دہلی کی بیشتر ادبی شخصیتیں اردو بازار میں مولوی سمیع اللہ قاسمی کے کتب خانہ عزیزیہ، فلورا ہوٹل، میر مشتاق کے اروناہال اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر

قائم بھائی ظہیر کے فرینڈز ٹی اسٹال المعروف بہ چنڈو خانہ پر جمع ہوتی تھیں۔ رشید حسن خاں کے ساتھ میری اور خلیق انجم کی تقریباً روزانہ شام کو یہیں ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ہم دونوں سرسید روڈ پر ان کی قیام گاہ پر بھی ان سے ملنے چلے جاتے تھے۔ خلیق انجم اس زمانے میں کروڑی مل کالج سے وابستہ ہو چکے تھے اور میں بھی اپنے پی. ایچ. ڈی کے کام کے سلسلے میں تقریباً روزانہ ہی دہلی یونی ورسٹی جاتا تھا۔ لہٰذا اکثر دن کے اوقات میں بھی خاں صاحب کے ساتھ کیمپس میں ملاقات رہتی تھی۔ یہ تعلق رفتہ رفتہ ایک دوستی کے رشتے میں بدلتا گیا۔ اس طرح رشید حسن خاں سے جو قربتیں حاصل ہوئیں ان کے ذریعے ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آئے — علمی پہلو بھی اور انسانی پہلو بھی — اور ہر پہلو انتہائی دل چسپ نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک باصلاحیت، روشن خیال اور دوست دار قسم کے انسان ہیں۔

اس گفتگو کے آغاز میں رشید حسن خاں کے تعلق سے روایت کے امین کا جو تذکرہ چھڑا تھا اسی کی روشنی میں رشید حسن خاں کے بارے میں ایک بات یہ کہنی ہے کہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری جھولی میں اپنی روایت کا جو کچھ بھی سرمایہ ہے اسے ہمیں پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنے خردوں میں تقسیم کرتے رہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ خاں صاحب ادب کے طالب علموں کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہی نسل روایت کے مستقبل کے سفر کی ساتھی ہے۔ جن لوگوں کو رشید حسن خاں سے قربت حاصل ہے اور جو اُن سے مسائلِ ادب پر صلاح مشورہ کرتے رہتے ہیں ان کی تحریر و تقریر پر رشید حسن خاں کے کان اور نگاہ برابر لگے رہتے ہیں تا کہ ان کے ہاں اگر کہیں کوئی کوتاہی ہے تو وہ اس سے انھیں برملا آگاہ کر دیں۔ نوجوانوں کی وہ نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ وہ ان کے لیے نئے نئے موضوعات بھی تجویز کرتے ہیں اور متعلقہ ماخذوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ وہ اس نازک سے فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ طالب علم کس سلوک کے مستحق ہیں اور ادب کی قد آور شخصیتوں مثلاً پروفیسر محی الدین قادری زور اور پروفیسر آلِ احمد سرور وغیرہ کے ساتھ علمی مجادلے کے کیا تقاضے ہیں۔

تحقیق اور متنی تنقید رشید حسن خاں کے دو خاص میدان ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اعلا پایے کی تحقیق اور تنقید کے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں بلکہ تحقیق اور متنی تنقید کے اصول وضوابط پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ اس طرح وہ تحقیق اور عملی تحقیق دونوں کے

مردِ میدان ہیں۔ ان کے تحقیقی قول و عمل میں تضاد ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے اور یہی دراصل کسی شعبۂ علم میں خصوصی مہارت کے صحیح معنی ہیں۔ اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ تھیوری کے تو بڑے ماہر ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر جب وہ خود کچھ کرنے بیٹھتے ہیں تو کوئی مثالی کام انجام نہیں دے پاتے۔ دوسری طرح کے لوگ وہ ہیں جو خدا داد صلاحیت کے بل پر اچھا کام تو سرانجام دے لیتے ہیں لیکن نئے کام کرنے والوں کی تربیت کی صلاحیت ان میں نہیں ہوتی۔ رشید حسن خاں کا امتیاز یہی ہے کہ وہ دونوں محاذوں پر چاق و چوبند ہیں۔

ہر شعبۂ علم میں اصلاح اور ترمیم کا سلسلہ برابر جاری رہنا چاہیے تاکہ ہر زمانے میں اس میں تازگی اور توانائی برقرار رہے۔ یہ کام روایت پرستی کے بل پر نہیں، بلکہ روایت سازی کی قوت کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ رشید حسن خاں کے علمی کارناموں میں ان کی کتاب 'اردو املا' اس کی روشن مثال ہے۔ اس کتاب میں اردو املا سے متعلق انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے عہد تک کے تمام مباحث کو سمیٹا ہے بلکہ سائنٹفک انداز میں طریقۂ املا میں مناسب اور موزوں اصلاحات اور تبدیلیوں کے ذریعے اس کو ایک نئی شکل دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے عبارت میں رموزِ اوقاف کے استعمال پر شدت کے ساتھ زور دیا ہے جس کا اردو میں خاطر خواہ رواج نہیں۔ اسی طرح املے کے سلسلے میں بھی انھوں نے ہمارے ذہن کو صاف کیا ہے۔ تاہم ضروری نہیں کہ املا سے متعلق آپ رشید حسن خاں کی ہر بات کو من و عن قبول کرلیں۔ ان کی بعض تجاویز سے لوگوں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ دوسری طرف ایسے اسکالر بھی ہیں جنھوں نے 'اردو املا' کی بنیاد پر املا کے مسائل پر کتابچے شائع کر ڈالے حالاں کہ 'اردو املا' جیسی ضخیم کتاب کے بعد اگر ضرورت تھی تو اس بات کی کہ اس کتاب کی ایسی تلخیص تیار کی جاتی جس کے مطالعے سے اردو کے اساتذہ اور طلبہ کو یہ آگاہی بہم پہنچائی جاتی کہ 'عبارت کیسے لکھیں'۔ یہ کام بھی بعد میں خود رشید حسن خاں ہی نے انجام دیا۔ بہرحال املا کے معاملات میں رشید حسن خاں کی خصوصی دل چسپی آگے چل کر بڑی مبارک ثابت ہوئی۔ میرے نزدیک 'فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' کی تاریخی تدوین املا کے معاملات میں رشید حسن خاں کی اسی دل چسپی کا ثمرہ ہے۔ اب آپ 'فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' میں رجب علی بیگ سرور اور میر امن دہلوی کو براہِ راست بولتے ہوئے سن سکتے ہیں۔

رشید حسن خاں نے اس بات پر بھی بجا طور پر زور دیا ہے کہ تحقیق کی زبان صاف،

سادہ اور دوٹوک ہونی چاہیے، ان کے نزدیک تحقیق، دلائل اور ثبوت کی بنیاد پر مروّجہ حقائق کے ردوقبول اور نئے حقائق کی دریافت کا عمل ہے۔ اس اعتبار سے عبارت آرائی، طول کلام، انشا پردازی، صفات اور مغلق الفاظ کا استعمال تحقیق کے لیے غیر مناسب ہی نہیں نقصان دہ ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر دونوں میں بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ اگرچہ ادبی تحقیق کا تعلق براہِ راست ادب سے ہے لیکن بجائے خود تحقیق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ویسی ہی لچھے دار زبان میں گفتگو کرے جو سحرالبیان، گلزارِ نسیم، فسانۂ عجائب اور باغ و بہار جیسی تخلیقات میں استعمال ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک تحقیق کی زبان دستاویزی ہونی چاہیے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ آخر دستاویزی زبان اپنے قاری کو گرفت میں کیسے لے۔ جان دار تحقیق میں جاسوسی ناول کا سا سسپنس ہوتا ہے۔ حقائق کی اندھی گپھا میں ٹٹول ٹٹول کر چلنے کا سا سسپنس۔ جو محقق یہ سسپنس پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے پھر دستاویزی زبان ہی راس آتی ہے۔

جیسا کہ میں جانتا ہوں رشید حسن خاں بنیادی طور پر مدرسے کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان کے پاس یونیورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں پھر بھی ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں میں وہ توسیعی خطبات دینے کے لیے بلائے جاتے ہیں، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کے ممتحن بنائے جاتے ہیں۔ بمبئی، جموں، حیدرآباد اور دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں انھیں برابر دعوت دی جاتی ہے۔ ان کی جو قدرو منزلت ہندوستان میں ہے وہی پاکستان میں بھی ہے۔ وہاں بھی لوگ ان کے ادبی منصب اور مرتبے سے پوری طرح واقف ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسی پاکستان کی مقتدر شخصیتیں ان کی قدردان اور مداح ہیں۔

جو شخص رشید حسن خاں سے ذاتی طور پر کبھی نہ ملا ہو وہ ان کے کارناموں اور شہرت کو دیکھ کر یہی اندازہ لگائے گا کہ یہ صاحب یقیناً کوئی مردم بیزار قسم کی چیز ہوں گے جو بس ہمہ وقت اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف رہتے ہوں گے اور باہر کی دنیا سے انھیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ لیکن رشید حسن خاں کے بارے میں یہ درست نہیں۔ وہ بالکل نارمل انسان ہیں۔ وہ ایک طرف پرانی وضع داریوں اور رکھ رکھاؤ کے قائل ہیں اور انتہائی سلیقے سے انھیں اپنی زندگی میں برتتے ہیں تو دوسری طرف ان کی زندگی کے مشاغل و معمولات میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو انھیں آج کے زمانے کا آدمی ثابت کرتی ہیں۔ ان کی ادبی فتوحات

کم نہیں لیکن انھوں نے یہ فتوحات سماجی رشتوں کی قیمت پر حاصل نہیں کیں۔ انھوں نے اپنے اوقاتِ روز و شب کو پورے توازن اور اعتدال کے ساتھ اپنے علمی کاموں، اپنے دوستوں اور عزیزوں اور مشاغل و تفریحات میں تقسیم کیا ہے۔ آپ سوال کر سکتے ہیں کہ پھر خاں صاحب نے تحقیقی کام کا اتنا انبار کیسے لگا دیا۔ اس کا ایک سیدھا سا جواب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سلامت روی اور وقت کے صحیح استعمال کے اصول پر قائم رہے ہیں۔ وہ اگر پٹھان ہیں تو اسی حد تک کہ غلط آدمی اور غلط بات کے ساتھ کبھی مصالحت نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں قابل رشک توازن اور اعتدال ہے۔ اپنے علمی مشاغل پر وہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چند ہی گھنٹے صرف کرتے ہیں اور اپنے اس معمول پر وہ سختی سے کار بند رہتے ہیں۔ لمبی لمبی قلانچیں بھرنے والے خرگوشوں کو جھاڑیوں میں سوتا چھوڑ کر اپنے اس استقلال کے بل پر وہ فتوحات کے جھنڈے گاڑتے چلے جا رہے ہیں۔

خاں صاحب یعنی رشید حسن خاں دہلی یونیورسٹی کے گوائر ہال میں لگ بھگ تیس پینتیس سال رہے۔ گوائر ہال کے عملے، ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ اور اساتذہ سب کے ساتھ خاں صاحب کے خوش گوار تعلقات تھے۔ یہ تمام لوگ خاں صاحب کے روزانہ کے معمولات سے بھی باخبر تھے اس لیے کہ ان معمولات میں کبھی سرِ مو فرق نہیں آتا تھا۔ اگر آپ کسی وقت بنا بتائے خاں صاحب سے ملنے گوائر ہال چلے گئے اور وہاں خاں صاحب کے کمرے پر تالہ لگا ہوا پایا تو آس پاس کے لوگ بتا دیں گے کہ خاں صاحب اس وقت کہاں ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ اگر آپ گیٹ پر بیٹھے چوکیدار ہی سے خاں صاحب کے بارے میں پوچھ لیں تو وہی بتا دے گا کہ خاں صاحب نکل چکے ہیں یا ابھی نہیں نکلے ہیں۔ خاں صاحب کے معمولات یہ ہوتے تھے کہ صبح ساڑھے سات بجے تک ڈائننگ ہال پہنچ جاتے۔ ڈائننگ ہال میں ان کی نشست مخصوص تھی ہمیشہ وہیں بیٹھتے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر آٹھ بجے ڈائننگ ہال سے نکل کر کمرے پر واپس نہیں جاتے تھے بلکہ سیدھے دہلی اسکول آف اکنامکس کے کافی ہاؤس کا رخ کرتے۔ یہاں بھی ان کی میز مخصوص تھی جہاں وہ ایک گھنٹہ بیٹھتے۔ کافی ہاؤس کے بیرے ان کے مزاج اور مذاق سے بخوبی واقف تھے۔ ان سے صرف مسکراہٹ کی زبان میں گفتگو ہوتی۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے کافی ہاؤس کے بعد کی اگلی منزل شعبۂ اردو ہوا کرتا تھا جہاں سے ایک بجے سے کچھ پہلے لنچ کے لیے اٹھ جایا کرتے تھے اس دوران کبھی کبھی اگر میں مل گیا تو مجھے بھی لنچ کی دعوت دے کر ساتھ

گوائر ہال لیتے گئے۔ گوائر ہال کے باہر ایک کارندہ میز بچھا کر بیٹھتا ہے جو گیسٹ ٹکٹ کاٹتا ہے۔ ہال کے ممبر یہاں پہلے پیسے دے کر اپنے مہمان کا ٹکٹ لیتے ہیں پھر مہمان کے ساتھ کھانے کے لیے ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کارندہ بخوبی جانتا ہے کہ خاں صاحب کی اپنے مہمان کو کھانا کھلانے کی تہذیب کیا ہے۔ خاں صاحب اپنے مہمان کو لے کر سیدھے کھانے کی میز پر پہنچتے تھے۔ مہمان کے ساتھ مزے مزے کی باتیں ہو رہی ہیں کھانا بھی چل رہا ہے اور اسی دوران نہ جانے کب بحسن و خوبی گیسٹ ٹکٹ والا معاملہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ شام کو خاں صاحب کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں بھی اسی انداز سے رونق افروز ہوتے تھے۔ خاں صاحب اپنے زمانے میں ہاکی کے کھلاڑی تھے اس لیے دہلی کے شیواجی اسٹیڈیم میں ہونے والے ہاکی کے میچ بھی وہ اتنی ہی پابندی سے دیکھتے تھے اِدھر کچھ برسوں سے ان کا یہ شوق ختم ہو گیا ہے۔

مجھے جب کبھی خاں صاحب سے کوئی صلاح مشورہ کرنا ہوتا تو میں صبح ساڑھے سات بجے سے کچھ پہلے گوائر ہال پہنچ جاتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ مجھے گوائر ہال پہنچتے پہنچتے ساڑھے سات سے کچھ اوپر ہو گئے۔ دیکھا تو خاں صاحب کے کمرے پر تالا پڑا ہے۔ میں سمجھ گیا ڈائننگ ہال گئے ہیں آٹھ بجے تک آجائیں گے۔ میں انتظار میں کمرے کے آگے ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے آٹھ بجے پھر آٹھ بج کر پانچ منٹ ہو گئے لیکن خاں صاحب نہیں لوٹے۔ کچھ دیر اور انتظار کر کے ڈائننگ ہال کے سامنے پہنچا۔ بیرے سے پوچھا تو پتا چلا آٹھ بجے نکل چکے ناشتہ کر کے۔ دوڑ کر گیٹ پر آیا تو چوکیدار نے بتایا خاں صاحب تو گئے باہر۔ اب میں دوڑتا بھاگتا اسکول آف اکنامکس کے کافی ہاؤس پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں خاں صاحب مزے سے بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے آؤ برادر۔ اسی کے ساتھ بیرے کو کافی کا اشارہ ہوا۔ میں نے کہا خاں صاحب مجھے پانچ منٹ کی دیر ہو گئی تھی۔ آپ کے کمرے کے آگے ٹہلتا رہا کہ آپ ناشتے سے فارغ ہو کر ادھر آئیں گے اور آپ سیدھے نکل آئے۔ خاں صاحب نے کہا جب آپ وقت مقررہ پر نہیں آئے تو میں نے سمجھا آج آپ گول ہو گئے۔ میں بھی اپنے رستے ہو لیا۔ ایک دو بار اور میرے ساتھ یہی ہوا۔ پھر خاں صاحب کے ساتھ یہ طے ہوا کہ اگر میں آپ کے ناشتے پر جانے سے پہلے نہ پہنچ پاؤں تو سمجھ لیجیے لیٹ ہو گیا ہوں اب ناشتے کے بعد آپ سے ملاقات ہو گی اس لیے آپ ناشتے سے فارغ ہو کر اسکول آف کنامکس جانے کے بجائے کمرے پر ہی واپس

آئیں۔ اس پر خاں صاحب نے فرمایا کہ اگر کسی روز سرے سے آپ آئے ہی نہیں تو میرا تو سارا معمول درہم برہم ہوجائے گا۔ میں نے یقین دلایا کہ ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔

خاں صاحب لباس کے بارے میں بھی وضع کے پابند ہیں۔ گرمیوں میں بش شرٹ، پتلون اور چمڑے کے براؤن رنگ کے سینڈل پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں پوری آستین کی قمیص، پتلون اور وہی براؤن رنگ کا لیس والا جوتا۔ بش شرٹ اور قمیص ہمیشہ چیک کی ہوتی ہے۔ ہاتھ پر ویسٹ اینڈ کمپنی کی گھڑی۔ خاں صاحب کے کمرے پر جائیے تو ان کی میز پر چمک دار سکوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگی ہوئی ملیں گی۔ پوچھنے پر پتا چلے گا کہ یہ بس کے لیے ہیں۔ خاں صاحب بس میں کنڈکٹر کو کبھی بڑا نوٹ نہیں دیتے ہمیشہ پورے پورے پیسے دیے اور جلد سے جلد اس سے خلاصی حاصل کی۔ وہ کنڈکٹر کو نوٹ دے کر اس جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتے کہ وہ یہ کہے کہ ٹھہریے باقی پیسے بعد میں دوں گا یا اگر دے تو پھٹے پرانے نوٹ پکڑا دے جس سے اس کے ساتھ ایک اور جھک جھک میں پڑنا پڑے گا۔

رشید حسن خاں یاروں کے یار ہیں۔ منافقت سے انھیں سخت نفرت ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ ان کی بے تکلفی ہے ان سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ لیکن عام طور پر وہ کم آمیز ہیں۔ اس لیے کس و ناکس کے ساتھ ہنسی مذاق تو کیا بات بھی احتیاط سے اور مختصر کرتے ہیں، بعض دوستوں کے ساتھ گاہے گاہے جاکر خود ملاقات کرنا بھی ان کی وضع میں شامل ہے۔ ان میں ایک تو غلام ربانی تاباں مرحوم تھے ان کے علاوہ بیگم ممتاز مرزا اور مخمور سعیدی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چوں کہ خاں صاحب ادب کے قدیم سرمایے پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ تنہا اس سمندر کے تمام موتی نہیں چن سکتے اس لیے وہ اپنے ذہن میں طرح طرح کے موضوعات سوچتے رہتے ہیں۔ یہ موضوعات وہ ان نوجوانوں کو تجویز کرتے ہیں جو تحقیق کے میدان میں نئے نئے وارد ہورہے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کی وہ رہ نمائی بھی کرتے ہیں۔ ایسے طلبہ جنھوں نے مدرسے کی تعلیم بھی حاصل کی ہے انھیں تو خاص طور پر وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کلاسیکی ادب سے متعلق موضوعات پر ریسرچ کریں خاص طور پر اس لیے بھی کہ آج کے زمانے کا ہر طالب علم اس طرح کے موضوعات پر تحقیق کرنے کا اہل نہیں۔

میں نے اس مضمون کے آغاز میں رشید حسن خاں کو روایت کا امین کہا تھا اور اس حیثیت سے انھیں روایت پرستوں سے ممتاز قرار دیا تھا۔ لہٰذا اپنی اب تک کی تمام گفتگو میں برابر

یہی کہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ رشید حسن خاں کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے ہاں روایت کے عرفان اور احترام کے ساتھ اس کی توسیع اور بقا کا جذبہ بھی ہے۔ یہ اجداد کی رہنمائی میں اخلاف کو قیادت سونپنے کا عمل ہے۔ روایت کے عرفان اور احترام کے لیے عقل و ادراک ضروری ہے اور اس کی توسیع اور بقا کے لیے قوتِ عمل اور جوش کی۔ یعنی یہ دیوانگیِ عقل کا وہ سودا ہے جسے میرؔ نے شعور سے جنوں کرنے کا نام دیا ہے۔ اور اس بات کو یوں بھی کہا ہے:

ہم کو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے
دشت میں قیس رہو، کوہ میں فرہاد رہو

یہی شعورِ جنوں اور روایت و جدت کا خوش گوار امتزاج ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ تاب ناک جوہر ہے۔

○○○

ڈاکٹر علی احمد فاطمی

رشید حسن خاں......شجرِ سایہ دار

اپنی تیس برس کی طالب علمانہ اور مدرسانہ زندگی میں متعدد اکابرینِ ادب کی خدمت میں حاضر ہونے، ان سے گفتگو کرنے اور بہت کچھ سیکھنے کے مواقع ملے۔ ابتدا میں رشید احمد صدیقی، مسعود حسن رضوی ادیب، کلیم الدین احمد، عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالودود، میکش اکبرآبادی جیسے بزرگ و عظیم شاعروں و ادیبوں کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا لیکن ان پر لکھنے کا حوصلہ کبھی نہ ہوسکا۔ اول تو ان سے ملاقاتیں بہت کم ہوئیں، پھر ان حضرات کی شخصیت کا غیر معمولی جلال اور رعب بھی لکھنے نہ دیتا۔ اس کے بعد کی نسل میں بھی کچھ ایسے بزرگ ہیں جن سے بہت بار ملاقاتیں رہیں، قربتیں بھی تھیں، ان سے بہت کچھ سیکھا بھی لیکن لکھنے کی ہمت پھر بھی نہ ہوئی۔ ایسی اہم و برگزیدہ شخصیتوں میں محترم رشید حسن خاں بھی ایک ہیں۔

خاں صاحب کے بارے میں میں نے کئی بار لکھنا چاہا۔ اس وقت جب وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے، اس وقت جب انھیں ایک نہیں یکے بعد دیگرے کئی بڑے انعامات و اعزازات ملے، اس وقت جب وہ دہلی چھوڑ کر اپنے وطن شاہجہانپور چلے گئے۔ لیکن ہر بار، کئی کئی بار دل نے ہچکولے کھائے۔ دماغ نے گرم گرم سانسیں لیں، آنکھیں بھی نم ہوئیں اور قلم بھی سرنگوں ہوا لیکن ان سب پر احترام کی ایسی دبیز چادر چڑھی ہوئی تھی جو کم وبیش تیس سال سے میرے سر پر سایۂ عاطفت کا کام کر رہی تھی۔ خاں صاحب کی زندگی میں ہر ملاقات پر میں سوچتا تھا کہ اس عزت و احترام کی کوئی حد ہوگی لیکن ہر بار خاں صاحب اس حد میں اضافہ کر دیتے اور میرے لیے یہ مشکل ہوتی کہ اس حد کو میں کن سرحدوں میں سمیٹوں پھر تھک ہار اور غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا کہ علم میں اپنے آپ وہ طاقت نہیں

ہوتی جو صداقت اور جرأت کے ساتھ اظہارِ علم میں ہوتی ہے۔ مصلحت آمیز نرمی میں بھی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو شفقت آمیز کھرے پن میں ہوتی ہے اور صداقت و حقیقت کی اپنی نفسیات اور جمالیات ہوتی ہے جس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو بذاتِ خود سچے اور اچھے ہوتے ہیں۔ کسی فلسفی نے کہا بھی ہے کہ حسن کی انتہا خوف پر ہوتی ہے اور حسن حقیقی صداقت میں ہوتا ہے اور اسی لیے صداقت میں بھی خوف ہوتا ہے اور صداقت اکثر حقیقت کے مختلف لبادے اوڑھ لیا کرتی ہے۔ یہاں یہ بات اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ رشید حسن خاں زندگی بھر حقیقت کی تلاش میں رہے اس لیے ادبی اصطلاح میں محقق کہلائے۔ نہایت معتبر و مخدوم محقق۔ لیکن تلاشِ حقیقت اور اظہارِ حقیقت کا رویہ صرف ادب تک محدود نہ تھا بلکہ زندگی کے معاملات، معمولات اور تعلقات میں بھی تھا۔ بالکل سچا اور کھرا جیسے سورج کی شعاعیں جن میں حرارت بھی ہوتی ہے اور سخاوت بھی۔

۱۹۷۴ء میں ایم.اے. کرنے کے بعد میں نے عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں پر تحقیقی مقالہ برائے ڈی.فل لکھنے کا کام شروع کیا۔ وظیفہ ملتا تھا اس لیے مختلف شہروں اور لائبریریوں کو دیکھنے کے اتفاقات ہوئے۔ علی گڑھ، دہلی کچھ زیادہ ہی آنا جانا ہوا۔ دہلی میں قمر رئیس صاحب جو فکشن کے بڑے ناقد اور میرے استاد (پروفیسر سیّد محمد عقیل) کے دوست ہیں، ان سے ملاقاتوں کے سلسلے پہلے قائم ہوئے۔ محمد حسن، شارب ردولوی، ظہیر احمد صدیقی، خلیق انجم، شریف احمد، معین الدین فریدی وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں اور خوب ہوئیں۔ انھیں دنوں انھیں لوگوں میں سے کسی کے یہاں خاں صاحب کی بھاری بھرکم کتاب 'اردو املا' دیکھی۔ بس دیکھی، چھونے تک کی ہمت نہ کر سکا۔ ان دنوں اس کتاب کے بڑے چرچے تھے اور املا کے نئے نئے زاویے اور رشتے پر تذکرے تھے۔ میں ان سب سے ناواقف تھا اس لیے کہ بچپن سے ہی میری ہر طرح کی گرامر غلط رہی ہے۔ اس کے باوجود خاں صاحب نے مجھے شفقت دی۔ یہ ان کی گرامر کا معاملہ تھا۔

کسی نے کہا کہ رشید حسن خاں سے ضرور ملو۔ انھوں نے شرر کی کتاب 'گذشتہ لکھنؤ' پر بہت معرکے کا مقدمہ لکھا ہے۔ پھر وہ تحقیق کے آداب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیق سے وابستہ تھے اور گوائر ہال میں رہتے تھے۔ میں ان سے ملنے ان کے کمرے پر گیا۔ تعارف ہوا۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ تحقیق کا موضوع سنا تو گرم ہوئے لیکن جب نگراں کا نام سنا تو نرم ہوئے۔ شفقت سے بولے:

''میاں آپ کو معلوم ہے کہ شرر نے کتنے ناول لکھے ہیں؟''

''غالباً پینتیس (۳۵)!''

''یہ غالباً کیا ہوتا ہے...... تحقیق کا یہ مزاج نہیں......''

''پھر کیا مزاج ہوتا ہے؟'' میں نے جسارت کی۔ کس طرح کی یہ خود مجھے نہیں معلوم۔ مسکرائے ...... ''اچھا سوال ہے لیکن طالب علمانہ...... ٹھیک ہے اسی طرح طالب علم بنے رہیے کبھی استاد نہ بننا......'' پھر مڑے اور فرمایا:

''تحقیق کا مزاج حقیقت کی تلاش ہے اور یہ بھی کہ ہر حقیقت کو شک کی نگاہ سے دیکھو جب تک کہ وہ ہر اعتبار سے مکمل و معتبر نہ ہو جائے......''

بس یہی جملہ یاد رہا حالاں کہ وہ خاصا زیادہ بولے تھے، کچھ اتنا زیادہ کہ میں خود انھیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا لیکن خاں صاحب ایک زندہ حقیقت تھے جس پر سیکڑوں شک پلک جھپکتے قربان ہو جاتے۔ پھر اچانک بولے:

''تم نے کھانا کھایا......؟''

''جی نہیں!''

''چلیے میرے ساتھ ہاسٹل کے ڈرائنگ ہال کی طرف، شاید آپ کا بھی کھانا مل جائے''۔

پھر وہ مجھے لے کر گوائر ہال کی طرف چل پڑے۔ کھانا مل گیا۔ خالص شاکاہاری۔ کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے کمرے کی طرف لے گئے...... اسے دکھایا اور پھر باہر ہی سے لوٹا دیا اور کہا:

''یہ میرے آرام کا وقت ہے۔ آپ چار بجے آیئے گا......''

میں بیرنگ واپس لوٹ آیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ خاں صاحب کس قسم کی شخصیت ہیں لیکن پھر بھی مسرت کا ایک بے نام جذبہ طاری تھا کہ آج ایک بڑے محقق سے ملاقات ہو گئی۔ اب میری تحقیق کی راہیں تو آسان ہوں گی شاید زندگی کی راہیں بھی۔

میں نے چار بجے حاضری دی، وہ تیار تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے لے کر یونیورسٹی کافی ہاؤس گئے جہاں انھوں نے نہایت کالی سی کافی پی اور میں نے نسبتاً گوری، لیکن جو گفتگو کی اس سے ان کی شخصیت کا اجلاپن مجھ پر ظاہر ہونے لگا اور میں گوری کافی پی کر بھی من کی سیاہی دور نہ کر سکا۔ کافی ہاؤس میں انھوں نے ادب و تحقیق کے بارے میں

کوئی گفتگو نہیں کی۔ وہ فٹ بال کے بارے میں بتاتے رہے۔ میں حیران تھا کہ ادب کا اتنا بڑا اسکالر فٹ بال کے میدان کا گول کیپر۔ مجھے فٹ بال سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ یہ بات ان کو پسند نہ آئی اس لیے کافی ہاؤس سے نکلنے کے بعد وہ فٹ بال میچ دیکھنے چلے گئے اور مجھ سے رسماً بھی نہیں کہا۔ کیوں کہتے، مجھے فٹ بال پسند جو نہ تھا۔ وہ رسمیات کے قائل نہ تھے، کوئی دوسرا رسمی باتیں کرے یہ بھی انھیں پسند نہ تھا فوراً ٹوک دیتے، ذرا بھی مروت نہ کرتے۔ عجیب انسان تھے خاں صاحب، کم از کم عام اردو والوں سے بالکل عجیب اور آج کے اردو والوں سے بالکل غریب۔ اس زمانے میں اردو دنیا میں خواجہ احمد فاروقی، آل احمد سرور، خورشید الاسلام کا طوطی بول رہا تھا اور بڑے بڑوں پر (حالاں کہ وہ لوگ چھوٹے تھے) ان کا رعب طاری تھا لیکن خاں صاحب ان چیزوں سے بے نیاز تھے بلکہ یہ بزرگ حضرات خائف رہتے کہ کب شاہ جہانی پٹھان دہلی علی گڑھ کی طرف رخ کر لے۔ کبھی کبھی وہ کر بھی لیتے تھے جس کی اپنی کچھ نفسیاتی وجہیں بھی تھیں اس لیے کہ وہ ایک انسان بھی تھے۔ وہ پروفیسر نہ تھے۔ کسی ادارے کے ڈائرکٹر بھی نہ تھے لیکن وہ اسکالر تھے۔ بہت بڑے اسکالر جس کی گردن خم تھی اور ٹوپی ترچھی ...... وہ جانتے تھے کہ علم و ادب کا رشتہ پروفیسر اور ڈائرکٹر سے بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ اکثر کہتے اور ایک بار انھوں نے مجھے ایک خط میں بھی لکھا تھا......

> ''میاں! جو گھر کے اندر سر جھکا کر کام کرتا ہے وہ گھر کے باہر سر اٹھا کر چلتا ہے۔ ذرا اردو کے پروفیسروں کو دیکھو زیادہ تر کی نظریں جھکیں اور کمر خمیدہ رہتی ہے''۔
>
> ''یہ علم کا بوجھ بھی ہوسکتا ہے......''
>
> ''نہیں یہ جہالت کا بوجھ ہے۔ جہالت کا بھی اپنا بوجھ ہوتا ہے جو علم کے مقابلے از خود زیادہ اظہار کے راستے اختیار کر لیتا ہے ...... کیوں کہ علم بردباری اور سنجیدگی لاتا ہے اور جہل شوخی اور بے حجابی......''

کچھ اور باتیں ہوئیں۔ حق کے بندوں پر حق کا فضل نازل ہوتا رہا۔ شریفوں پر بھی بوچھار رہی۔ کچھ اس انداز سے کہ ہم سرور میں آ گئے ...... اب اس کی تفصیل کیا بیان کروں کیوں کہ ان میں بیشتر لوگ اب اس دنیا میں نہیں رہے اور اب تو خاں صاحب بھی نہیں رہے۔

انھیں ملاقاتوں میں ایک دن انھوں نے اپنی ترقی پسندی اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی کا ذکر کیا اور پھر علاحدگی کا۔ وہ جو اسباب بتاتے تھے اس سے میں کبھی متفق نہ ہو سکا اور میں یہی نتیجہ نکالتا تھا کہ خدا نے خاں صاحب کو کچھ دوسرے کاموں کے لیے بنایا تھا اور وہ کام انھوں نے کیے اگر چہ کافی بعد میں کیے لیکن بلاشک وہ غیر معمولی اور یادگار کام ہیں جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اس ضمن میں خلیق انجم صاحب کی بھی تعریف کرنی ہوگی کہ انھوں نے خاں صاحب سے کچھ اہم اور بڑے کام کروالیے۔ وہ خود بہت اچھے ادیب، محقق اور خاں صاحب کی غیر معمولی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف۔

شرر پر کام کرتے وقت خاں صاحب نے مجھے بھی تحقیق کے آداب سکھائے اور ساتھ ہی زندگی کے بھی (جو میں ٹھیک سے سیکھ نہ سکا) لیکن آدابِ تحقیق تو اس وقت بہت کام آئے۔ مسعود حسن رضوی ادیب سے ملنے کی ہدایت کی۔ لکھنؤ میں ناولوں کی تلاش کرنے کے مناسب مقامات بتائے پھر اچانک سوال کیا:

''آپ کو معلوم ہے کہ شرر کی جائے پیدائش کیا ہے؟''

''لکھنؤ ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ وہ لکھنؤ کے جھوانوائی ٹولہ میں پیدا ہوئے''۔ میں نے عرض کیا۔

''نہیں، وہ لکھنؤ میں نہیں پیدا ہوئے، وہ بارہ بنکی کے قصبہ کرسی میں پیدا ہوئے چوں کہ کرسی بے وقوفوں کے لیے مشہور تھا اس لیے انھوں نے یہ بات چھپائی......''

''لیکن آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟''

''پھر کی حماقت کی بات ...... تحقیق میں یہی سب تو معلوم کرنا پڑتا ہے۔ آپ بھی کرسی جائیے ان کی نواسی کی اولادیں ہیں، ان سے ملیے کچھ اور تفصیل لے کر آیئے''۔

چناں چہ خاں صاحب نے ہی مجھے کرسی بھیجا اور میں گیا۔ کرسی میں مجھ پر کیا گزری یہ ایک الگ داستان ہے جس کا ذکر پھر کبھی...... وہاں مجھے کچھ ہاتھ نہ آیا سوائے شرر کا ایک گھریلو قسم کا معمولی سا خط جو انھوں نے لندن سے اپنی نواسی کو لکھا تھا۔ لیکن شرر کی تحریر دیکھ کر ضرور خوشی ہوئی۔ میں نے اپنے مقالے میں شرر کی پیدائش کرسی ہی میں بتائی اور ثبوت کے طور پر رشید حسن خاں کا نام لکھ دیا، ظاہر ہے کہ اتنے بڑے محقق کا کہہ دینا ہی میرے لیے کافی تھا۔ پھر انھوں نے اس کی بھی ہدایت کی کہ لکھنؤ کے حکیموں کے محلے میں جاکر میں شرر کا مزار تلاش کروں۔ مجھے فکر ہوئی کہ کہیں وہ بھی کرسی میں نہ ہو لیکن وہ مجھے اسی محلے

کے قبرستان میں ملا جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میری آنکھیں نم ہوگئیں ...... کیسے کیسے بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے کام کر کے اب زمین کے نیچے دفن ہیں۔ سچ ہے کہ انسان کا کام زندہ رہتا ہے، اس کی نیکیاں زندہ رہتی ہیں۔ اس مضمون کو لکھتے وقت کم و بیش یہی جذبہ خاں صاحب کے لیے اُمڈ رہا ہے کہ انھوں نے مجھے کیسے کیسے مشورے دیے، کیسی راہ دکھائی۔ اگر وہ نہ ملے ہوتے تو میں تحقیق کی خاردار راہ کس طرح طے کر پاتا۔ یہی نہیں، وہ زندگی کی نرم و نازک باتیں بھی سکھاتے۔ ایک بار ایک اور ایسی بات کہی جو میرے دل میں نقش ہوگئی۔ استاد محترم سیّد محمد عقیل کے تئیں میری عقیدت دہلی کے سمیناروں میں ان کے ساتھ آمد و رفت اور تھوڑی بہت خدمت کو دیکھ کر ایک بار بڑی محبت اور سنجیدگی سے بولے:

> ''آپ اپنے استاد کی اتنی عزت و خدمت کرتے ہیں، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی اس دور میں استاد اور شاگرد کے ایسے رشتے اب کہاں ...... آپ ان کی خوب عزت کیجیے۔ عقیل صاحب لائق اور شریف انسان ہیں ...... لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اگر آپ کو اپنی پہچان بنانی ہے تو برگد کے سایے سے نکلنے کی بھی کوشش کیجیے......''

اس سلسلے میں وہ اکثر مجھے سمجھاتے، ہدایتیں دیتے، اکثر ڈانٹتے بھی تھے۔ مضامین کی کمزوریوں اور بالخصوص زبان کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے۔ آج مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ میری زبان کو درست کرنے اور نفسِ مضمون کو خاص ڈھنگ سے پیش کرنے کا ہنر جیسا مجھے خاں صاحب نے سکھایا کسی اور نے نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نالائق اتنا سیکھ نہ سیکھ سکا جتنا کہ سیکھ لینا چاہیے تھا۔

ڈی.فل کی ڈگری ملنے کے بعد جب مجھے پہلی ملازمت سینٹ جانس کالج آگرہ میں ملی تو وہ بہت خوش ہوئے اور بتایا کہ یہ کالج اور اس کا اردو شعبہ بڑا تاریخی ہے۔ یہاں مولانا حامد حسن قادری اردو کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے اس شعبے کو زندہ کیا جسے بعد میں فریدی نے ڈبو دیا۔ اب تم اسے زندہ کرو اور میکش صاحب کی خدمت میں حاضری دو۔ شعبہ بہت کمزور تھا طلبہ ندارد اس لیے جوائن کرنے کے بعد میں نے چاہا کہ اسے متحرک کروں۔ میں نے پہلے ہی سال اکبر آباد کے شاعروں پر ایک سمینار اور مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں بھی خاں صاحب نے میری بڑی مدد کی، وہ اس وقت یوپی اردو اکادمی کے مجلس انتظامیہ کے اہم رکن تھے اور علی جواد زیدی صدر تھے جو خاں صاحب کو بہت

مانتے تھے۔ دونوں حضرات نے اکادمی سے دس ہزار روپے دلوائے جو اس وقت اچھی رقم تھی اور دونوں حضرات تشریف بھی لائے، اس سمینار میں کافی لوگ آئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، سیّد محمد عقیل، شبیہ الحسن، عنوان چشتی وغیرہ۔ شعرا میں جذبی، واقف، تاباں اور میکش وغیرہ۔ بعد میں کسی اور تقریب میں آل احمد سرور بھی آئے، وہ بھی اسی کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ بہرحال وہ پروگرام نہایت کامیاب رہا جس سے شعبۂ اردو کو بڑی تقویت پہنچی۔ اس پروگرام میں جس قدر خاں صاحب نے دلچسپی لی میں نے اس کے بعد کہیں نہیں دیکھا۔ اس کامیابی کے بعد انھوں نے ہی مجھے اکادمی کا ممبر بنوایا۔

پروگرام کے بعد عقیل صاحب اور خاں صاحب نے دو ایک دن اور قیام کیا۔ میرے کرایے کے مکان پر بھی تشریف لائے۔ دعوت قبول کی، بیوی اور بیٹی سے ملاقاتیں کیں۔ بیٹی کو گود میں لیے رہتے۔ چوں کہ میں وہاں اکیلا تھا اور کوئی بزرگ ساتھ نہ تھا چناں چہ میری بیٹی دونوں بزرگوں سے گھل مل گئی اور ہر وقت دادا کہتی رہتی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ وہ ایک بڑے محقق اور دانشور ہیں بلکہ خاندان کے ہی ایک بزرگ چچا بابا کی طرح کچھ یہ بھی کہ کھرا انسان باہر سے جتنا محنتی اور بے باک ہوتا ہے اندر سے اتنا ہی نرم، شفیق اور پیارا۔ اس کا دل آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس میں دور دور تک غبار کا نام نہیں۔ شاد عظیم آبادی کا شعر ہے:

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شاد پیری میں
کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

خاں صاحب نہ منھ دکھانے پر یقین رکھتے تھے اور نہ ہی پیری پر...... تاہم کدورت سے پاکیزگی ان کے ایمان و ایقان کا بنیادی حصہ تھا۔ ان معنوں میں وہ بالکل صوفی کی طرح تھے جہاں سے پاکیزگی کے سبق سیکھے جاسکتے تھے۔ میں آگرہ میں تقریباً تین سال رہا، اس مدت میں میں نے دو بڑے مذاکرے اور مشاعرے کیے۔ اس درمیان میں نہ جانے کتنی بار دہلی گیا اور ان سے ملا۔ اس کا کوئی حساب کتاب نہیں۔ وہ ایک بار اور آگرہ آئے بالکل اکیلے۔ وہ اکیلے آنا بھی چاہتے تھے۔ مقصد آگرے کا تاج محل دیکھنا نہ تھا بلکہ ادب کے قطب مینار میکش اکبرآبادی سے ملاقات کرنا اور تنہائی و سکون کے چند دن گزارنا۔ جو دہلی میں الگ تھلگ زندگی گزارنے کے باوجود ممکن نہ تھا کچھ وہ حساس بھی زیادہ تھے اور بے باک تو تھے ہی لیکن بحیثیت مجموعی طبیعت اس قدر نفیس اور شفاف پائی تھی کہ علم و ادب کی ذرا سی پراگندگی انھیں جلد کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ حالات بھی کچھ ایسے بن گئے تھے

کہ علمی و اخلاقی معیار و اقدار روز بہ روز گرتا ہی جارہا تھا۔ یونیورسٹیوں میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالوں سے تو وہ سخت نالاں رہتے جس انداز سے ان مقالات کے محققین اپنی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے یہ خاں صاحب کیا کسی بھی شریف النفس اور ذی علم انسان کے لیے اذیت ناک ہوسکتا ہے۔ مجھے ہدایت کرتے کہ ''تم اپنا مقالہ شائع ضرور کرو لیکن اس پر نظرِ ثانی ضرور کرنا اس کے بعد ہی شائع کرنا''۔ افسوس کہ اس وقت آگرہ میں میرے پاس مقالہ نہ تھا ورنہ وہ دو چار دن جو انھوں نے میرے ساتھ یا میں نے ان کے ساتھ آگرے میں گزارے اس پر مزید اصلاح لے لیتا، وہ کچھ اور معتبر ہوجاتا۔ اس قیام کے درمیان انھوں نے سیماب اکبرآبادی کا محلہ و مکان دیکھا جہاں وہ اور شاعر پیدا ہوئے۔ میکش صاحب کے آستانے پر کئی بار گئے جہاں فانی، جوشؔ وغیرہ کی خوب خوب باتیں ہوئیں۔ حیرت انگیز انکشافات ہوئے مثلاً فانیؔ کی دلچسپی رمل سے اور جوشؔ کی تصوف سے، ان سے متعلق واقعات۔ میکش صاحب نے بتائے انھوں نے اخفر اور سیماب کی رقابتیں جذبی اور مجاز کی شرارتیں، فانی اور مانی کے ادارے۔ صبا اکبرآبادی کے مرثیے۔ اخفر اکبرآبادی کے گھر والوں سے ملاقاتیں اور اس دور میں بھی اکبرآباد کے شعرا کی گھاتیں یہ سب کی سب میرے سامنے آئیں اور میں ان سب سے بے نیاز سلسلۂ قادریہ کو مضبوط کرنے میں مصروف رہا۔ اسی درمیان میں نے تحقیقی نوعیت کے کئی مضامین نظیر اکبرآبادی پر لکھے جو میں نے پہلے خاں صاحب کو دکھائے اور جو انھیں قدرے پسند آئے اور چھپوائے۔ اسی سلسلے میں نظیر پر میرے ایک مضمون میں میں نے قیاساً نظیر کو غالب کا استاد ثابت کیا تھا۔ خاں صاحب تحقیق میں قیاس کے قائل نہ تھے۔ ایک خط میں صاف طور پر لکھا:

> ''غالب کے تلمذ نظیر سے متعلق کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بہ ظاہر یہ گپ باطن کی اڑائی ہوئی ہے۔ نظیر کا سالِ پیدائش بھی صحیح طور پر معلوم نہیں۔ شہباز نے جو کچھ لکھا ہے محض قیاس آرائی ہے اور کچھ نہیں۔ بعض اور لوگوں کی طرح نظیر کا سالِ ولادت اب تک معلوم نہیں ہوسکا''۔

ڈھائی تین سال آگرے میں گزارنے کے بعد امکانات ہوئے کہ میں علی گڑھ یا الٰہ آباد چلا جاؤں۔ خاں صاحب نے سختی سے علی گڑھ جانے کو روکا اور الٰہ آباد جانے کو کہا۔ علی گڑھ کی ڈھیر ساری برائیاں کیں۔ آل احمد سرور کی کچھ زیادہ، پھر جب میرا تقرر الٰہ آباد یونیورسٹی میں ہوگیا تو مبارک باد کا پہلا خط خاں صاحب کا آیا:

''یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ کا انتخاب الٰہ آباد کے لیے ہوگیا۔ اب اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ عقیل صاحب کو آپ جیسے مخلص کی واقعتاً شدید ضرورت محسوس ہوگی ...... لیکن اب اصل مسئلہ آپ کے جانشین کا ہے اس کے لیے کچھ کیجیے ورنہ بڑا نقصان ہوگا''۔

جہاں ان کو یہ فکر تھی کہ سینٹ جانس کالج کے شعبۂ اردو کا کیا ہوگا وہاں وہ اس بات پر خوش تھے کہ الٰہ آباد میں مجھے آسانیاں ہوں گی اور پڑھنے لکھنے کے مواقع زیادہ ملیں گے۔ اب ملاقاتیں کم ہوئیں، خط و کتابت زیادہ تھی۔ میں زیادہ لکھتا، ان کے جواب میں اکثر تاخیر ہوجاتی لیکن جب جواب آتا تو اس میں روکھی پھیکی تحقیق نہ ہوتی پیار بھرے دلچسپ جملے ہوتے، محبت وشفقت ہوتی جو بڑا مزہ دیتی۔ ایک خط کے یہ جملے دیکھیے:

''میاں! میں تمھارا گنہ گار ہوں کہ خط کا جواب اب لکھ رہا ہوں حالاں کہ خط بہت پہلے ملا تھا۔ معذرت کیا طلب کروں تاخیر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تم اگر ناراض ہو تو اس کا حق پہنچتا ہے لیکن چوں کہ ہو بہت مہذب اور وضع دار اس لیے دل یہ کہتا ہے کہ جلد ہی من جاؤ گے۔ یہ دیکھ اس قدر اور اس طرح کا اعتماد ہر ایک پر تو نہیں ہوتا ...... توقع کرتا ہوں کہ بیگم اب بہ خیریت ہوں گی۔ عقیل صاحب سے خیریت معلوم ہوگئی تھی۔ مقالے کی کتابت غالباً شروع ہوچکی ہوگی اور توقع کرتا ہوں کہ جلد ہی آنکھیں اس سے روشن ہوسکیں گی۔ بھائی! کبھی کبھی خط ضرور لکھا کرو۔ میں ہر اک سے دل نہیں لگاتا۔ نہ توقع قائم کرتا ہوں اور نہ فرمائش کرتا ہوں جب خط ملتا ہے تو کچھ دیر کے لیے جی خوش ہوجاتا ہے اور اب یہ نعمت کم یاب ہے۔

بھائی! وہ آگرے میں کتب خانہ محمدیہ قائم کب ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ جب تم ادھر آؤ تو میں بھی آجاؤں۔ اب تو سردی شباب پر ہے۔ اگر ممکن ہو تو اواخر فروری میں اس کام کو کرڈالو ثواب ملے گا اور کیا کہوں ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تھوڑا سا پیٹھا کھانے کو مل جائے گا۔

بہت سی دعاؤں کے ساتھ

رشید حسن خاں (دستخط)

29-12-1983''

ایک اور خط کی زبان اور لہجہ ملاحظہ کیجیے۔ الٰہ آباد کے کسی سمینار میں میں نے مدعو کیا تو جواب آیا:

''عزیز!

تم تو آرام جاں تھے، یہ دشمن عافیت کیسے ہوگئے؟ بوڑھا بیمار شخص اس کو زمین کا گز بنانا چاہتے ہو اور اس عالم میں جب کہ یہاں کوئی قاعدے کی ٹرین نہیں گزرتی۔ اب میں دہلی جاؤں، وہاں کسی کو لکھ کر رزرویشن کرواؤں وہ صاحب بھی اس ناروا زحمت کو گوارا کرلیں۔ تب الٰہ آباد کی گاڑی میں بیٹھوں۔ کتنے اگر مگر ہیں اس میں ...... اچھے بچے اچھی باتیں کیا کرتے ہیں تم بھی ویسی ہی باتیں کیا کرو ...... وہاں مجھ سے کہیں بہتر لوگ آئیں گے جو واقعی روشن خیال ہوں گے اور زمانہ شناس (شاید زمانہ ساز بھی ہوں) ایسے میں میری ضرورت نہ گنجائش اور پھر غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ میاں! میری معذرت قبول کرو۔ خدا (جس کے متعلق یہ نہیں معلوم کہ وہ ہے تو کہاں ہے) تم کو جنت دے گا اور بہت سی حوریں۔ اگر اچھے دل سے مان لوگے یہ بات۔ برے دل سے مانوگے تو وہاں حوروں کی جگہ غلمان ملیں گے۔ یہ یادرکھو۔

نئے شمارے کا منتظر ہوں۔

رشید حسن خاں

۲۳؍مارچ ۱۹۹۸ء''

ان تحریروں کو ملاحظہ کیجیے۔ کیا یہ وہی خاں صاحب ہیں جو اپنی خاں صاحبیت کے لیے دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔ ان جملوں میں غیر معمولی شفقت واپنائیت جھلکی پڑتی ہے۔ مجھے خیال آرہا ہے کہ سمینار کا موضوع سماجی اور سیاسی نوعیت کا تھا جس سے ان کو اتنا لگاؤ نہ تھا۔ حالاں کہ خط کے آخری جملے میں مذہب سے بے نیازی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے ان سے مذہب کے موضوع پر گفتگو نہیں کی لیکن اتنا یقین تھا کہ وہ مذہب دل پر یقین رکھتے تھے۔ ایک بار انھوں نے مجروح کی ایک غزل کی بہت تعریف کی اور اس شعر کی بطور خاص:

ہم سے کہا جبرئیل جنوں نے یہ بھی وحیِ الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہب دل ہے باقی سب گمراہی ہے

وہ بڑی دیر تک جبرئیل جنوں کی ترکیب کی تعریف کرتے رہے حالاں کہ وہ تعریف بہت کم کرتے تھے خاص طور پر ترقی پسندوں کی لیکن وہ تعریف سننا بھی بہت پسند نہ کرتے تھے۔ میں نے خاں صاحب کو اپنی تعریف کرتے کبھی نہیں سنا بلکہ کوئی دوسرا بھی ہوتا تو ٹال جاتے اور کوئی مذاق بھرا جملہ نکال کر بات کا رخ موڑ دیتے۔ میں نے کبھی انھیں غیر سنجیدہ نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی غیر سنجیدہ سے کوئی سنجیدہ گفتگو کرتے دیکھا۔ ان کے اپنے اصول تھے اور اصولوں سے بھرا رویہ جس کی وجہ سے وہ 'چوزی' (Choosy) تھے جیسا کہ اس خط کی تحریر سے بھی اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۸۶ء میں میرا تحقیقی مقالہ 'عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار' نصرت پبلشرز لکھنؤ سے عابد سہیل صاحب نے شائع کر دیا۔ مقالہ اچھا نہ چھپا تھا اس لیے خاں صاحب نے جب دیکھا تو اس کی اشاعت پر تو خوش ہوئے لیکن خراب طباعت پر ناراض بھی ہوئے۔ پیچھے میری تصویر تھی اور عابد سہیل کا لکھا ہوا تعارف اور تھوڑی سی تعریف۔ یہ بھی خاں صاحب کو ناگوار گزرا۔ میں نے دہلی جا کر مقالے کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ بولے:

''یہ تصویر اور تعارف کیوں ہے؟''

اب میں کیا جواب دیتا۔ چپ رہا۔ پھر فرمایا:

> ''یہ تعریف۔ یہ نمائش انسان کو بے ضمیر بناتی ہے۔ سنجیدہ لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ تمھارا کام خود تعارف کرائے گا اور شہرت بھی دے گا......''

اس کے بعد میں نے عہد کیا کہ آئندہ کتابوں میں ان باتوں سے پرہیز کروں گا۔

اس درمیان ان سے کئی سمیناروں میں ملاقاتیں ہوئیں۔ اگر وہ سمینار تحقیق لسانیات یا اسی قسم کے ملتے جلتے موضوع پر ہوتے تو خاں صاحب کے آگے کسی کا چراغ روشن نہ ہو پاتا لیکن اگر خالص ادبی یا شعری موضوع پر ہوتا تو بات ذرا کچھ الگ سی ہو جاتی۔ کسی سمینار میں فیضؔ پر مقالہ پڑھا جو فیضؔ کے خلاف چلا گیا۔ لوگوں نے خوب بحث کی۔ اسی طرح فانیؔ، فراقؔ پر پڑھے گئے مقالات میں وہ بات نہ تھی جس کے لیے خاں صاحب شہرت رکھتے تھے۔ دراصل ان کا میدان ہی مختلف تھا۔ متن، زبان اور املا پر ان کی گہری نظر تھی، ان سب پر وہ غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ کلاسیکی ادب اور کلاسیکی زبان، اس کی نوک پلک، لفظیات، محاورات اور لب و لہجے پر ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ جس شخص نے 'باغ و بہار'، 'سحرالبیان'، 'گلزارِ نسیم'، 'زہرِ عشق' وغیرہ کی تدوین کا کام کیا ہو اس کے بارے میں کیا کہا

جاسکتا ہے۔ یہ کام ہی الگ نوعیت کے ہیں اور شاعری کے رجحانات، میلانات، جمالیات ونفسیات کے معاملات کی دنیا الگ ہوا کرتی ہے۔

شرر والی کتاب کی اشاعت کے کئی سال بعد میں نے شرر پر ایک مونوگراف پڑھا جسے ساہتیہ اکادمی، دہلی نے شائع کیا تھا اور جو ہمارے شہر الہ آباد کے ہی ایک ادیب کے ذریعے لکھا گیا تھا۔ میں اس کو پڑھ کر حیران ہوگیا۔ اس مونوگراف میں جا بہ جا میری کتاب سے اقتباسات لیے گئے تھے اور اس کا کہیں کوئی حوالہ نہیں اور کتابیات میں بھی میری کتاب کا ذکر تک نہیں۔ میں نے یہ تکلیف دہ بات خاں صاحب کو لکھی، فرمایا دونوں کتابیں لے کر دہلی آجاؤ، میں بغیر دیکھے کوئی فیصلہ نہیں لے سکتا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد میرا دہلی جانا ہوا تو میں نے خاں صاحب کو دونوں کتابیں دکھائیں۔ انھوں نے بغور دیکھا تو حیران رہ گئے۔ چہرہ تمتمایا، کہا ’’آپ دونوں کے اقتباسات کا ایک خاکہ تیار کیجیے اور بتائیے کہ کس صفحے پر آپ کی کیا تحریر ہے اسی کے سامنے اس کی تحریر بھی پیش کیجیے۔ دہلی سے واپس آنے کے بعد میں نے یہ ناپسندیدہ کام انجام دیا۔ ایسے نشانات کی تعداد تقریباً بیس تھی جہاں میری کتاب سے سرقہ کیا گیا تھا۔ مضمون خاصا طویل ہوگیا تھا تاہم میں نے اسے خاں صاحب کو بھیجا، انھوں نے پورے غور وخوض کے بعد اسے خلیق انجم صاحب کو برائے اشاعت دے دیا۔ جلد ہی وہ تین قسطوں میں ’ہماری زبان‘ میں شائع ہوا۔ لوگوں نے مجھے داد دی اور سرقہ بردار نے بیداد، جو ہونا ہی تھا۔ کچھ مقامی لوگوں نے یہ بات بھی کہی کہ یہ سراسر چوری ہے اور غیر دیانت داری۔ آپ مقدمہ دائر کیجیے۔ میں نے پھر خاں صاحب سے مشورہ کیا۔ ڈانٹا کہ بس ہوگیا مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ادبی معاملات عدالتوں میں طے نہیں ہوتے۔ بس خاموش ہوجایئے۔ اور میں خاموش ہوگیا۔

اس درمیان خاں صاحب ریٹائر ہوگئے تو کام کی بھیڑ اور زیادہ ہوگئی۔ ہمہ تن مصروف ان دنوں خاں صاحب کے نام کا طوطی بول رہا تھا۔ ہند و پاک میں ان کے نام کی غیر معمولی شہرت وعزت تھی۔ احترام وادب سے ذکر ہوتا۔ جا بجا بلائے بھی جاتے لیکن وہ ہر جگہ کہاں جانے کو تیار ہوتے۔ یہی وہ مقام ہے جب خلیق انجم صاحب نے انھیں بڑا سہارا دیا اور انجمن ترقی اردو (ہند) سے وابستہ کر کے ان سے بہت اچھے اور بڑے کام کروائے۔ میں تحقیق کا آدمی نہ تھا اور نہ ہوں لیکن نظیر سے متعلق مضامین اور شرر والی کتاب نے نہ جانے کیا تاثر دے رکھا تھا کہ وہ اکثر مجھے تحقیقی نوعیت کا کام سونپتے اور رائے

مشورے بھی کرتے۔ 'زہرِ عشق' سے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

''عزیزم!

ایک ضروری بات اور:

میں نے نواب مرزا شوق لکھنوی کی تین مثنویوں (فریبِ عشق، زہرِ عشق، بہارِ عشق) کو مرتب کرنے کا خاکہ بنایا ہے۔ کام بھی شروع کردیا ہے۔ مجھے ان مثنویوں کے قدیم اڈیشن کی ضرورت ہے یعنی ۱۲۶۰ھ سے لے کر ۱۲۸۰ھ تک کے چھپے ہوئے۔ ذرا میرے کرم فرما عقیل صاحب سے پوچھو ان کو کسی نہ کسی نسخے یا نسخوں کا احوال ضرور معلوم ہوگا اصل نسخے کی ضرورت نہیں، اس کا عکس بہ آسانی بن سکتا ہے اور وہاں لائبریری میں ضرور ہونا چاہیے۔ میری خاطر ایک دن خراب کرڈالو اور لائبریری میں تلاش کرلو میں بہت شکر گزار رہوں گا۔

'گلزارِ نسیم' چھپنے چلی گئی دس بارہ دن میں چھپ کر آجائے گی (۷۲۴) صفحے بنے ہیں۔ اس میں چکبست و شرر کے پورے معرکے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چوں کہ اس کے بعض مباحث کا تعلق شرر سے یعنی تم سے ہے اس لیے یہ ارادہ ہے کہ ایک جلد بھیج دوں گا تمھارے لیے اگر تم کو اس قدر ضخیم کتاب سے وحشت نہ ہو۔ انتساب کی بشارت سے خوش ہونا قدرتی بات ہے مجھے بھی مسرت ہوگی۔ شکریہ پیشگی۔

رشید حسن خاں

۱۲ر مارچ ۱۹۹۵ء''

میرے پاس 'زہرِ عشق' کا ایک پرانا نسخہ تھا جو مصور تھا، میں نے آگرہ سے حاصل کیا تھا وہ پورا بھیج دیا ظاہر ہے کہ اس بات پر وہ خوش ہی ہوئے لیکن اس سے زیادہ میں خوش تھا کہ خاں صاحب کی خدمت کرنا میرے لیے عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ خوب دعائیں ملتی تھیں۔ چند ماہ کے بعد ڈاک سے ایک موٹی سی کتاب ملی یہ 'گلزارِ نسیم' کا جدید ترین اڈیشن تھا جسے ترتیب دیا خاں صاحب نے اور شائع کیا انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے۔ اس کے پہلے ورق پر لکھا تھا: عزیز فاطمی کے لیے ...... اسی طرح بعد میں انھوں نے 'مثنویاتِ شوق' والی کتاب بھی بھیجی اس میں بھی یہی لکھا۔ یہی نہیں انھوں نے اپنی اس زمانے (۱۹۷۸ء) کی

کتاب 'ادبی تحقیق' بھی اس شفقت اور جملوں کے ساتھ عنایت کی تھی، 'گزشتہ لکھنؤ' کا نسخہ بھی ان کی دستخط کے ساتھ موجود اور محفوظ ہے۔ گاہے بگاہے ان کتابوں کو، اس مضمون کو لکھتے ہوئے بطور خاص جب میں نے ان کتابوں کو الٹا پلٹا، ان کے قلم سے اپنا نام لکھا دیکھا تو آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ آج خاں صاحب ہم میں نہیں لیکن مجھے ہمیشہ یہ فخر رہے گا کہ اتنا بڑا محقق عظیم ادیب میرا محسن رہا ہے اور مجھے اس نے بے پناہ شفقتوں سے نوازا ہے۔ اولاد کی طرح چاہا مانا ہے۔ ۱۹۹۹ء کے کسی ماہ میں مجھے خاں صاحب کا ایک خط بمبئی سے ملا جس میں علالت و علاج کا تفصیلی ذکر تھا۔ مجھے تشویش ہوئی کہ وہ بار بار بمبئی کیوں جا رہے ہیں۔ ایک بار جب وہ بمبئی میں تھے تو اتفاق سے میرا بمبئی جانا ہو گیا۔ فون پر بات کی۔ وہ اپنے کسی غیر مسلم دوست کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے جو سانتا کروز میں تھا۔ میں اپنے دوست الیاس شوقی کے ساتھ ان سے ملنے گیا۔ وہ ہم لوگوں کو پاکر بہت خوش ہوئے لیکن میں ان کی صحت دیکھ کر بجھ سا گیا۔ وہ کمزور سے لگے، ان کے چہرے پر نقاہت تھی بہر حال ہم لوگوں کو پا کر جیسے ان میں جان آ گئی ہو۔ بمبئی میں کالی داس گپتا رضا، دلوی اور ان دونوں سے زیادہ ذہنی طور پر باقر مہدی سے بہت قریب تھے۔ دونوں کا قارورہ ملتا تھا کھرے پن کا قارورہ۔ خاں صاحب ذات کے پٹھان تھے تو باقر مہدی ادبی پٹھان، کسی سے خوف نہیں کھاتے جب جس کو چاہیں علم کی قلابازی سے ادب کے دنگل میں چت کر دیتے۔ جھوٹ اور مکر و فریب کو دونوں سخت ناپسند کرتے تھے۔ اسی لیے دونوں میں خوب پٹتی تھی۔ خاں صاحب نے اپنی کوئی کتاب باقر مہدی کے نام معنون کی تھی شاید باقر مہدی نے بھی۔ اب یاد نہیں۔ بمبئی اور شاہجہانپور کے کئی چکر لگے تو مجھے کچھ زیادہ ہی فکر ہوئی۔ ہر بار بمبئی جانا ممکن نہ تھا اس لیے شاہجہانپور جانے اور ملنے کی خواہش ہوئی۔ عقیل صاحب بھی تیار ہوئے۔ فون کیا تو کمزور سی آواز آئی۔ شاہجہانپور آنے کو منع کر دیا۔ دہلی کے غالب سمینار میں ملاقات ہوگی اور دہلی کے غالب سمینار میں ملاقات ہوئی۔ کچھ بہتر لگے شاید اسی لیے سمینار میں شرکت کر سکے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز کے یہاں پرانی دہلی میں ٹھہرے تھے۔ اس زمانے میں پتا نہیں یہاں سے مجھ پر یہ جنون سوار ہوا کہ میں کلیاتِ نظیر اکبر آبادی ترتیب دوں۔ جب یہ خواہش میں نے قومی اردو کونسل دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کے سامنے رکھی تو وہ تیار ہو گئے۔ میں نے جب اس کا ذکر خاں صاحب سے کیا تو وہ سوچتے رہے پھر بولے ...... ''یہاں نہیں گھر آیئے وہاں اطمینان سے باتیں ہوں گی''۔ شام کو میں

اسلم پرویز صاحب کے گھر گیا، وہ میرے منتظر تھے۔ جب اس منصوبے پر گفتگو ہوئی تو صاف طور پر کہا:

''یہ کام تم نہ کرسکوگے۔ کسی دیوان یا کلیات کی ترتیب معمولی کام نہیں اگر آپ سیدھے طریقے سے ایک مقدمہ کے ساتھ کلیات شائع کرنا چاہتے ہیں تو کرلیجیے لیکن یہ کام بڑا نہ ہوگا ...... لیکن اگر آپ پورے متن، لفظیات اور حواشی کے ساتھ کریں گے تو یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔ یہ کام کوئی آگرہ یا برج کا ہی کرسکتا ہے۔ ایسے کام میں ہاتھ مت لگایئے جسے آپ کر ہی نہ سکیں......''

خاں صاحب کے اس سچائی سے بھرے مشورے سے وقتی طور پر میرے جوش و جذبے پر اوس ضرور پڑی لیکن سچ یہ ہے کہ انھوں نے بالکل سچی اور کھری رائے دی تھی جس کا احساس مجھے بعد میں ہوا۔ پھر میں نے اس کام سے توبہ کرلیا اور بھٹ صاحب سے معذرت کرلی۔ وہ خوش ہوئے اور کہا کہ آپ میں اتنی جرأت تو ہے یہ سچ بات محسوس کرسکے۔ یہاں اردو کا ہر کام ہر ادیب کرنے کو تیار رہتا ہے۔ کام بعد میں کرتا ہے معاوضے کا مطالبہ پہلے کرتا ہے۔آپ کی ایمانداری مجھے پسند آئی اس لیے آپ میرے لیے ضرور کوئی کام کریں۔ کونسل اردو کے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتگان کا کلیات شائع کرنے کا منصوبہ بنارہی ہے۔ اس میں ایک نام علی سردار جعفری کا ہے۔ آپ تو ترقی پسند ہیں۔ جعفری کا کلیات آپ ہی ترتیب دیجیے، نظم ونثر سب۔ سلطانہ جعفری سے اجازت دلوانے کا کام بھی آپ کو کرنا ہوگا۔ اجازت بھی مل گئی۔ دو جلدیں بھی چھپ گئیں باقی زیرِ طبع یا زیرِ ترتیب ہیں ...... غور کیجیے کیا ان کاموں کا سہرا خاں صاحب کے صحیح مشوروں سے جاکر نہیں ملتا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو کچھ دوسرے ہی مشورے دیتا۔ یہ تھے ہمارے خاں صاحب۔ جس کو چاہتے ٹوٹ کر چاہتے۔ سچے مشوروں و ہدایات سے نوازتے۔ ان کے مشورے، ان کی باتیں سونے میں تولی جانے والی ہوتیں، ان کا صداقت بھرا اظہار، ان کا عاجزانہ اعتراف، ان کی عرق ریزی، ان کی ایمانداری، ان کی حق گوئی، زریں حروف میں لکھے جانے والے واقعات ہیں جو اس دور میں کمیاب ہی نہیں نایاب ہیں۔ اس دور میں سچی کھری اور ایماندارانہ باتیں اب کہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

غالب صدی کے موقعے پر میں نے 'نیا سفر' کا غالب گوشہ نکالنے کا ارادہ کیا۔ خاں

صاحب سے گزارش کی، جواب آیا:

’’غالب پر مضمون ضرور لکھوں گا۔ وعدہ کیا ہے تم سے۔ مگر جب تم غالب پر نمبر نکالو گے یا وہاں کسی مذاکرے کا انتظام کرو گے۔ اب کچھ لکھنے کے لیے کسی تقریب یا بہانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سارا وقت تو اصل کام یعنی ’سحرالبیان‘ کی تدوین میں لگ جاتا ہے۔ بمبئی میں بھی اسی کام میں لگا رہا۔ دو سال ہو گئے ہیں اور ابھی شاید ڈیڑھ سال اور لگے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا اس کا احوال معلوم نہیں۔ شاید پھر کچھ نہ ہو۔ عقیل صاحب سے میرا سلام کہو۔ ان کو کبھی کبھی ضرور یاد کرتا ہوں۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔

رشید حسن خاں

۱۱ر مارچ ۱۹۹۸ء‘‘

ان کا مضمون نہیں مل سکا بہر حال گوشہ نکلا تو اس میں میرا مضمون تھا ’غالب اور سیکولرزم‘ جس کے عنوان پر ہی چونکے پورا مضمون پڑھ کر دو تین جملوں کا ایک خط لکھا:

’’اس عنوان کے تحت تم نے حیرانی میں ڈال دیا۔ یہ نیا گوشہ نکالا تم نے مضمون اچھا ہے۔ مبارک باد قبول کرو۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے‘‘۔

بلاشبہ خاں صاحب ایک بڑے محقق تھے۔ بڑے ادیب تھے۔ میں ان کے معیارِ تحقیق کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا یہ میرا میدان نہیں ہے۔ پتا نہیں کیسے ایک بار جانے کس رو میں ایک مضمون ’تحقیق کی محرومیاں‘ لکھ گیا، مضمون ’نیا دور‘ لکھنؤ میں شائع ہوا۔ مضمون پڑھنے کے بعد خاصے ناراض ہوئے۔ ناراض تو خلیق انجم بھی ہوئے اور آئندہ اس نوع کے مضامین نہ لکھنے کی تاکید کی۔ کوئی اور ہوتا تو ان حضرات کی ناراضگی سے ناراض ہو جاتا لیکن میرے ناراض ہونے کا سوال ہی نہ تھا وہ بھی خاں صاحب سے جن کی شفقتوں، مہربانیوں تلے میں دبا ہوا ہوں اور تازندگی دبا رہوں گا۔ خوش نصیب ہیں وہ خود جنھیں ایسے بزرگوں کی صحبتیں ہی نہیں دعائیں بھی ملی ہوں۔

میرے لکچرر سے ریڈر بننے میں دیر ہو رہی تھی۔ دیر کی وجہ ’ہماری زبان‘ میں تین قسطوں والا مضمون تھا۔ خاں صاحب کو میری ترقی کی بے حد فکر تھی لیکن وہ یہ کہتے تھے کہ حق بات کہنے میں خسارہ تو ہوگا اس کی پروا نہ کرو تم بہت جلد پروفیسر بھی ہو گے۔ جب فلاں

فلاں ہوسکتا ہے تو تم کیوں نہیں۔ جب میں ریڈر ہو گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ بات بھی میں نے دہلی میں بتائی تو گلے سے لگالیا۔ لیکن جب پروفیسر ہوا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ کاش کہ وہ کچھ دن اور جی لیتے۔ میرا پروفیسر ہونا یا اب کسی کا پروفیسر ہونا کوئی ادبی واقعہ نہیں ہوتا لیکن ذاتی طور پر خاں صاحب کے حوالے سے میرے لیے ضرور تھا، کیوں کہ وہ میرے لیے ایسے ہی تھے جیسے اپنے خاندان کا کوئی چچا بالکل اپنا، ترقی سے خوش ہونے والا، دعائیں دینے والا، بات بات پر 'جیتے رہیے' کہنے والا۔ انھوں نے بعض معاملات میں میری بڑی تربیت کی۔ معاونت کی جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ ان سے ہر بار ملنا ایک خوش گوار احساس اور تجربہ ہوتا تھا اور اپنائیت و توانائی کا احساس ہوتا۔ ان کے چلے جانے سے ادبی دنیا میں ایک محقق، ادیب و دانشور کا جانا تو ہے ہی، میرے لیے ایک مشفق، مہربان بزرگ اور رہنما کا چلا جانا ہے۔ میرا ذاتی نقصان ہے۔

انھوں نے داستانیں دیں، انھوں نے مثنویاں ترتیب دیں جہاں تکلف، تصنع، مبالغہ اور جھوٹ ہوا کرتا ہے لیکن خاں صاحب ان سب سے کوسوں دور تھے۔ وہ ایک زندہ حقیقت تھے ایک بڑی صداقت اور میرے لیے ایک بہت بڑی طاقت اور ایک شجر سایہ دار:

رہتے تھے داستانوں کے ماحول میں مگر
کیا لوگ تھے کہ جھوٹ کبھی بولتے نہ تھے

○○○

ارجمند آرا

رشید حسن خاں کی شخصیت کے چند پہلو

بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد

میرا یہ منصب نہیں کہ محقق، نقاد اور بہترین استاد، رشید حسن خاں کی علمی بصیرت اور ادبی فتوحات پر مضمون لکھوں۔ البتہ اپنے طالب علمی کے دور میں اور بعد میں بھی، ان سے جو رہنمائی، توجہ اور شفقت ملی اس کی طرف کچھ واقعات اور کچھ خطوط کی مدد سے اشارہ کر کے ان کی شخصیت کے چند پہلوؤں کا عکس اتارنے کی کوشش کروں گی۔ اس کے علاوہ میں نے ان کے تئیں اپنے شعبے کے رفقائے کار کے جو رویے دیکھے، دوسرے لوگوں سے ان کے بارے میں جو کچھ سنا اس کی بنیاد پر یہ دیکھنے کی بھی کوشش کروں گی کہ اردو دنیا کے اُس 'علمی' حلقے میں خاں صاحب کی امیج کیا ہے جسے یونی ورسٹی کی دنیا کہتے ہیں۔ خاں صاحب کے ساتھ میرا رشتہ استاد شاگرد کا سا رہا ہے، حالانکہ رسمی طور پر وہ میرے استاد نہیں تھے۔ لیکن یہ رشتہ اس سے بھی بڑھ کر تھا اور وہ میرا اتنا ہی خیال کرتے تھے جتنا اپنے بچوں کا کرتے رہے ہوں گے۔ اس لیے یہ میرا فرض بھی ہے اور مجھ پر ان کا قرض بھی کہ خاں صاحب کی شخصیت کے بارے میں اپنے محسوسات اور تاثرات میں ان کے مداحوں کو بھی شریک کروں۔ اس کوشش میں اگر کوئی کمی رہے تو اس کو میرا عجزِ بیان سمجھا جائے، خاں صاحب کی شخصیت کا سقم نہیں۔

اس عالمِ رنگ و بو سے رشید حسن خاں کو رخصت ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا (جس میں انھوں نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ، اپنی زندگی میں بھرپور دلچسپی لی اور اسی طرح بسر کی جس طرح غالب نے کی تھی) لیکن ان کے دبدبے کا آج بھی یہ عالم

ہے کہ ہر ہر لفظ پر قلم رک رہا ہے کہ اب گرفت ہوئی، بس اب گرفت ہوئی۔ اچھی طرح معلوم ہے کہ خاں صاحب کا نہ تو اب کوئی خط آنے والا ہے، نہ فون پر رابطے کا امکان ہے اور نہ ہی ملاقات کا — اور یوں میرا ہر لفظ ان کی گرفت سے آزاد ہے، مگر پھر بھی......!

خاں صاحب سے ملاقات سے پہلے میں نے ان کی چند کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ 'ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ' لفظ بہ لفظ، 'تلاش و تعبیر' کے چند مضامین، 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کا ان کا مرتب کردہ پورا متن۔ حواشی اور ضمیمے لغت کی طرح سے حسبِ ضرورت دیکھے تھے۔ ان کی علمی بحثوں کو مکمل طور پر پڑھنے اور سمجھنے کا نہ تو مجھ میں صبر تھا اور نہ استطاعت۔ 1992 میں جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ایم اے کی طالب علم کے طور پر داخلے سے پہلے میں ان کی کئی کتابیں پڑھ چکی تھی۔ غالباً دوسرے سیمسٹر میں ہم کو ایک ٹرم پیپر لکھنے کے لیے دیا گیا تھا جس میں سبھی طالب علموں کو فیض کے مجموعۂ کلام 'سرِ وادیِ سینا' پر تبصرہ لکھنا تھا۔ فیض کی شاعری مجھے یوں تو بہت پسند تھی لیکن شاعری پر لکھنے کے لیے اس کا صرف پسند یا ناپسند ہونا کافی نہیں ہوتا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ میرے پاس شاعری کو پرکھنے کے کچھ اصول اور کچھ معقول دلیلیں ہوں۔ چنانچہ تبصرہ کرنے سے پہلے سوچا کہ فیض کی شاعری پر چند مضامین پڑھ لیے جائیں تاکہ ذہن میں ایک خاکہ مرتب کیا جاسکے۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ کون کون سے مضامین پڑھے تھے لیکن ان میں خان صاحب کا وہ مضمون بھی شامل تھا جس میں انھوں نے فیض پر بڑھ بڑھ کر حملے کیے ہیں۔ یہ مضمون میرے نزدیک جرأت مندانہ بھی تھا اور مدلل بھی۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میرے ذہن میں مضمون نویسی کا جو ایک دقیانوسی تصور تھا کہ پہلے خوبیاں گنواؤ، پھر خامیوں کی طرف اشارہ کرو، اس کے لیے مجھے لائن مل گئی۔ میں نے خاں صاحب سے تحریک پاکر انھی کے سے انداز میں 'سرِ وادیِ سینا' میں نامانوس الفاظ، اجنبی تراکیب، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی فہرست بنا ڈالی اور فیض کی زبان میں خوب مین میخ نکالی۔ ٹرم پیپر خورشید انور نے چیک کیا جو ان دنوں جے این یو میں عارضی طور پر اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ خورشید نے جے این یو ہی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی، ڈاکٹر اسلم پرویز کی نگرانی میں۔ وہ سی پی آئی کی طلبہ تنظیم آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بڑے سرگرم رکن تھے اور پارٹی ممبر بھی تھے۔ یوں ان کی بنیادی تربیت میں طلبہ سے فاصلہ بنانا شامل ہی نہیں تھا اور ہم طالب علموں کے ساتھ وہ اور ان کی بیگم، بینا کشی سوندریال خاصے گھل مل کر رہتے تھے (بینا کشی جے این یو ہی میں ہسپانوی زبان پڑھاتی

ہیں)۔ ایک دن گوداوری ہوسٹل کے بس اسٹاپ سے 615 نمبر کی بس میں چڑھتے ہی خورشید سے ملاقات ہوگئی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھنے لگے، فیض کی شاعری پر کس کس کے مضمون پڑھے تھے؟ میں ان کا منشا سمجھ گئی اور پہلے ہی جملے میں اقرار کرلیا کہ رشید حسن خاں صاحب کا مضمون بھی پڑھا تھا۔ ''ہوں!'' ایک لمبی سی ہنکار، اور پھر، ''اتنی damaging چیزیں پڑھنے کی ابھی تمھاری عمر نہیں ہے، اور اتنی قطعیت کے ساتھ دعوے کرنا تو بالکل مناسب نہیں۔'' میں شرمندہ سی ہوگئی۔ واقعی رشید حسن خاں کی نقل کرنا، جو علم کا سمندر ہیں، مجھ ایسی طالب علم کو کہاں زیب دیتا تھا۔ میں نے پڑھا ہی کیا تھا؟

انھی دنوں (ایم اے کے دوسرے سال میں) ہمارے شعبے (ہندستانی زبانوں کا مرکز) نے خاں صاحب کے تین خصوصی لیکچر علمِ بیان پر رکھے۔ اس سے قبل میں ان سے ان کی رہائش گاہ پر مل چکی تھی، اپنے دوست اطہر فاروقی کی وساطت سے۔ اطہر کا ان کے ساتھ نیازمندانہ رشتہ برسوں پرانا تھا۔ خیر جے این یو میں ان کے لکچر ہوئے۔ تین دن میں تین گھنٹے کی یہ کلاسیں مجھے کم از کم تین برسوں کے مطالعے کا نچوڑ لگیں۔ ایم فل کے زمانے میں بھی انھوں نے تحقیق اور تدوین متن پر بھی لکچر دیے۔ ان کے یہ لکچر میرے ذہن پر ایک ایسے استاد کا نقش مرتسم کر گئے جس سے تعلیم حاصل کرنے کی بس حسرت ہی رہ جاتی ہے۔ بہت تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، ان کی تدریس سے فیض اٹھانے والے طلبہ زندگی بھر ان کے ممنونِ کرم رہیں گے۔

ایک بار جو خاں صاحب سے شاگردی کا رشتہ استوار ہوا تو گویا عمر بھر کے لیے میں ان کی دست نگر ہوگئی۔ ایم فل کا موضوع انھوں نے طے کرایا اور بنیادی مواد فراہم کیا۔ میرے نگراں، مشفق استاد ڈاکٹر اسلم پرویز تھے۔ ان دونوں نے مل کر گویا طے کردیا کہ مجھے کس موضوع پر اور کن خطوط پر کام کرنا ہے۔ یہی طریقہ پی ایچ ڈی کے لیے بھی اختیار کیا گیا۔ کون کون سی کتابیں پڑھنی ہیں، کون کون سی لائبریاں مفید ہوں گی، نوٹس کس طرح لینے ہیں۔ مہینے دو مہینے میں خاں صاحب سے ضرور ملتی۔ وہ کام کی رفتار کا جائزہ لیتے اور مشورے دیتے۔ اچھا کام کرنے کے لیے حوصلہ بڑھاتے اور نصیحتیں کرتے۔ میں ان سے ملنے کے لیے اکثر دہلی یونی ورسٹی کے گائر ہال جاتی تھی۔ گائر ہال ویسے تو ریسرچ کے طالب علموں کا ہاسٹل ہے لیکن اس کا ایک حصہ انیکسی کی طرح ہے جس کے دس کمرے اساتذہ اور ریسرچ ایسوسی ایٹس کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ حصہ ٹیچرز کورٹ کہلاتا ہے۔ جن

دنوں میں نے گائر ہال جانا شروع کیا، خاں اسی کے نو نمبر کمرے میں رہتے تھے۔ بعد میں (غالباً 1995 میں) جب وہ اپنے آبائی وطن شاہ جہاں پور چلے گئے تو ایک عرصے تک یہ سلسلہ رہا کہ وہ جب بھی دہلی آتے، اسی کمرے میں ٹھہرتے رہے۔ ان دنوں یہ کمرہ دہلی یونی ورسٹی میں تاریخ کے استاد سید ظہیر حسین جعفری کے تصرف میں تھا۔ وہ روایت کے ایسے پاسدار تھے اور اس قدر محتاط رہتے کہ خاں صاحب کے پرانے معمولات میں کسی طرح سے مخل نہ ہوتے۔ رشید صاحب کے آنے کے بعد جعفری صاحب اپنے ہی گھر سے ایسے غائب ہو جاتے گویا وہی عارضی منتظمِ خانہ ہوں اور اب صاحب خانہ کے آنے کے بعد وہاں ان کا کوئی عمل دخل نہ رہا ہو۔ اس طرح خاں صاحب غالباً سنہ 1999 یا 2000 تک گائر ہال ہی میں ٹھہرتے رہے۔ جب اسلم پرویز صاحب نے اپنے مکان میں ایک مہمان خانہ تعمیر کرالیا تو خاں صاحب ان کے مکان واقع ترکمان گیٹ ٹھہرنے لگے۔ اسلم صاحب نے یہ مہمان خانہ بطورِ خاص، خاں صاحب کی پریشانیوں اور سہولتوں کے مدنظر بنوایا تھا۔

خیر، یہ تفصیلات ضمنی تو تھیں لیکن بتانی بھی ضروری تھیں۔ ذکر تھا گائر ہال کا۔ خاں صاحب عموماً صبح کے وقت ملاقات کے لیے بلاتے تھے۔ اکثر اطہر فاروقی کو بھی بلاتے۔ ہم دونوں نو بجے تک وہاں پہنچ جاتے۔ خاں صاحب نہائے دھوئے، پینٹ بش شرٹ میں ملبوس، سینڈل یا جوتا پہنے بالکل تیار ملتے۔ ناشتے کے لیے اپنے ساتھ میس میں لے جاتے۔ میس میں ان کی کرسی پر کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ اپنی مخصوص جگہ جا بیٹھتے اور بیرر فوراً ہی پورے احترام کے ساتھ آ موجود ہوتا۔ جتنی دیر تک خاں صاحب میس میں ہوتے مجھ کو ایک مخصوص رعبیلی فضا کا احساس رہتا۔ ناشتے سے لوٹ کر کام کی باتیں ہوتیں۔ اسی ملاقات میں اگلی ملاقات کا وقت بھی طے کر دیتے یا پھر کبھی اسلم صاحب کی وساطت سے یا اطہر فاروقی کے ذریعے کہلوا دیتے کہ آئندہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت ملو اور کام دکھاؤ۔ گویا مقالہ لکھنا میری ذمے داری نہ ہو بلکہ خاں صاحب خود ریسرچ کر رہے ہوں۔

خاں صاحب کا کام کرنے کا اپنا انداز اور مزاج، بلکہ سخت ڈسپلن اور محنتِ شاقہ کے عادی، اور میں عام سی طالب علم جس کی ریسرچ میں بس واجبی ہی سی دل چسپی تھی۔ سو جھمیلے جو تھے زندگی کے۔ مجھے کیمپس کی اسٹوڈنس پالٹکس میں بھی دل چسپی تھی، احتجاجی اور سیاسی مظاہروں میں نعرے بھی لگانے ہوتے تھے، سیاسی جلسوں میں شرکت بھی ضروری سمجھتی تھی، یونین کے الیکشن میں پوسٹر بھی چپکانے ہوتے تھے، اپنی تنظیم کے امیدواروں

کے لیے ہر ہوسٹل اور ہر میس میں جا کر ووٹ مانگنی بھی ہوتی تھی اور دوستوں اور دوستیوں کے مطالبات بھی اپنی جگہ تھے۔ ایسے میں ریسرچ ویسرچ کا کام کتنی سنجیدگی سے ہو سکتا تھا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حال یہ تھا کہ خاں صاحب میرے پیچھے پیچھے — کبھی یاد دہانی، کبھی تنبیہہ، کبھی حوصلہ افزائی، کبھی ناراضگی۔ خاں صاحب جب شاہ جہاں پور چلے گئے تو ان سے ملاقاتیں تو کم ہو گئیں لیکن اب باقاعدہ خط وکتابت کے ذریعے وہ میری رہنمائی کرنے لگے، بلکہ گارجین کی طرح ہر وقت میرے کام کا حساب رکھنے لگے۔ چنانچہ اس زمانے کے ان کے جو خطوط میرے پاس محفوظ ہیں (جو تعداد میں کم از کم پچاس ساٹھ ہیں)، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کام کے معقول رفتار سے آگے نہ بڑھنے کے نئے جواز میں ان کو لکھتی رہتی تھی۔ وہ کچھ دن صبر کرتے، برداشت سے کام لیتے اور پھر سخت جھلا جاتے۔ لیکن پھر سنبھلتے اور سمجھاتے کہ دیکھو ہانڈی چولہا تمھارے بس کا رہا نہیں، اس کے مقابلے میں تحقیق آسان کام ہے، سو وقت گنوائے بغیر کر ڈالو۔ میں سعادت مندی سے اور سچے دل سے ڈسپلن قائم کرنے کا وعدہ کرتی، اس پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کا عزم بھی کرتی لیکن غالباً کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہوگی جو گاڑی پھر سے پٹری سے اتر جاتی تھی۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ مسلسل کام نہ کرنے کی کیا وجہیں میں ان کو لکھتی تھی لیکن ان کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں نے ان کو پریشان بہت کیا۔ پھر سچ یہ ہے کہ وہ جس رفتار سے مجھ سے کام لینا چاہتے تھے، وہ ہماری نسل کے طالب علموں کی استطاعت سے باہر تھا۔ اس ضمن میں چند خطوط سے کچھ اقتباسات پیش کروں گی جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس کسی طالب علم میں وہ ذرا بھی صلاحیت محسوس کرتے، اس کو پڑھنے لکھنے کی راہ پر لگانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ علم وادب کے فروغ سے ایسی دل چسپی رکھنے والا استاذ اور اردو کے سرمایے کو محفوظ کرنے کی ایسی لگن اور اردو کی بقا کے لیے ایسا درد رکھنے والا مجاہد اب شاید ہی کوئی پیدا ہو۔ 11 ستمبر 1996 کے خط میں لکھتے ہیں:

> تمھارا خط ملا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ اب تک بہت کچھ کرتی رہی ہو، یعنی کچھ کام نہیں کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم کو کام نہ کرنا آتا ہے۔ یہ بڑی صفت ہے، سب کو نہیں ملتی..... میں 16 ستمبر کو دہلی میں ہوں گا مگر اسی دن بمبئی روانہ ہو جاؤں گا.... بمبئی سے واپس آکر اپنے حاضری کے رجسٹر سے تمھارا نام کاٹنے پر غور کروں گا۔ اسلم صاحب سے دہلی میں میں نے

6/ستمبر کو فون پر بات کی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ تمھارا خانہ اب تک خالی ہے کام کے لحاظ سے۔ یوں مجھے صورتِ حال کا زیادہ علم ہو سکا۔

میں نے اس خط کا جواب گھبرا کر لشتم پشتم دیا ہوگا، بمبئی کے پتے پر۔ ڈسپلن میں رہنے کا وعدہ بھی کیا ہوگا اور کچھ مجبوریاں بھی بتائی ہوں گی کیونکہ اس کے جواب میں جو خط انھوں نے بمبئی سے 30/ستمبر کو بھیجا اس کا موڈ مختلف ہے، اس میں انھوں نے پی ایچ ڈی کے ایک باب کے لیے بہت سی کتب کے حوالے لکھے، اس کی نہج کا تعین کیا اور وقت بھی طے کر دیا کہ ایک مہینے میں یہ باب ختم کر لو۔ مگر میرے مزاج کو جتنا جانتے تھے، اسی حساب سے آخر میں نصیحتیں بھی کر ڈالیں:

> ایک بات سمجھ لو۔ اس بار کاہلی یا مصروفیت کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہو سکے گا۔ رات تھوڑی ہے اور سوانگ بہت۔ دل لگا کر کام کرو اور پیر توڑ کر بیٹھو۔ آنکھوں کا تیل ٹپکائے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ باقی فرائض ادا کرنے کی عمر پڑی ہے۔ مثل مشہور ہے: موچی کو عرش پر بھی بیگار ہی کرنا ہوگی۔ وہی احوال ان سب مسلمان لڑکیوں کا ہے جن کا تعلق چھوٹے شہروں یا علاقوں سے ہے؛ مشقِ سخن بھی اور چکی کی مشقت بھی؛ اسی لیے اس سلسلے میں مناجاتِ بیوہ قسم کی فریاد بیکار ہے۔ اس کا کچھ حاصل نہیں۔

اس کے جواب میں میں نے ان کو مقالے کا خاکہ اور غالباً کچھ صفحات روانہ کر دیے تھے۔ خاں صاحب بمبئی سے 25/اکتوبر کو دہلی لوٹے تھے اور 26 کی صبح انھوں نے مجھے گائر ہال بلایا تھا۔ اس کے بعد ان سے اگلی ملاقات 5/دسمبر کو اردو گھر میں ہوئی اور پھر دسمبر ہی کے آخری عشرے میں بھی جب وہ غالب سیمینار کے موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ آئے۔ اس دوران میں نے کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا ہوگا کیونکہ اپریل 1997 تک ان کا کوئی تنبیہی خط مجھے نہیں ملا۔ ان دنوں ویسے خاں صاحب بھی بیمار تھے اور میرے والد بھی، جس کی وجہ سے میں تقریباً ہر ہفتے یا دو ہفتے میں، دو دن کے لیے گھر چلی جاتی تھی۔ خاں صاحب کے ٹسٹ بمبئی میں ہو رہے تھے اور علاج بھی، جس کے لیے انھیں بار بار بمبئی جانا پڑتا تھا۔ جولائی 96 میں وہ بمبئی میں تھے، پھر ستمبر میں گئے اور اکتوبر میں لوٹے۔ ڈاکٹر نے دواؤں کا چھ مہینے کا کورس تجویز کیا تھا۔ مئی یا جون 1997 میں ان کو پھر جانا پڑا۔ فروری، مارچ 1998 کا عرصہ انھوں نے بمبئی میں گزارا اور پھر اگست، ستمبر 1998 میں ایک بار پھر ان کے بہت سے

چک اپ ہوئے۔ ریڈیو گرافی، سی اے ٹی اسکین، خون کے کئی طرح کے ٹسٹ اور نہ جانے کیا کیا الم غلم جس میں ان کے ہزاروں روپے خرچ ہوئے۔ 19 اپریل 1997 کو شاہ جہاں پور سے لکھا:

...تمھاری قدر تمھاری ذہانت کی بنا پر کرتا ہوں۔ تمھاری جذباتیت کی یوں قدر کرتا ہوں کہ ایسا شخص اور جو بھی ہو، منافق نہیں ہو سکتا اور یہ صفت اب کم یاب ہے... بس ذرا سی بات یہ ہے کہ تم میں استقامت کی کمی ہے۔ اگر تم ایک بار اس صفت کو پیدا کرلو تو تمھارا کام بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ عارضی طور پر سہی، دل کو ذرا سخت کرلو اور آنکھوں کو بے نم۔ رونا محرم زدہ لوگوں کو راس آتا ہے، تم کو کیوں راس آئے... میرا دہلی آنا اب ذرا سا دقت طلب ہے۔ آؤں گا تو ضرور مگر ایک دو ماہ کے بعد، جب تم یہ لکھو گی کہ تم نے سو صفحے مکمل کر لیے ہیں۔ جب تک یہ نہیں لکھو گی، ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔ اگر آؤں گا بھی تو تم کو مطلع نہیں کروں گا۔ جب تم میری بات نہیں مانتی ہو تو میں تمھاری بات کیوں سنوں اور کیوں مانوں۔ جب تم خط لکھو گی، تو خواہ وہاں کوئی کام ہو یا نہ ہو، میں دو چار دن کے لیے آ جاؤں گا، ضرور آؤں گا... تم اگر یہ چاہتی ہو کہ مجھے تمھاری طرف سے تکلیف پہنچے اور میرا دل دکھے، تو ٹھیک ہے کام نہ کرو۔ اگر نہیں چاہتی ہو تو کام میں لگ جاؤ۔

یہ وہ دن تھے جب میرے والد زیادہ ہی بیمار تھے۔ چنانچہ کام پھر رکا رہا۔ کچھ اپنی الجھنوں کے سبب اور کچھ خوف کے مارے میں نے خاں صاحب کو خط لکھنا بھی چھوڑ دیا۔ غالباً اسی سے پریشان ہو کر انھوں نے 30 جون 1997 کو لکھا: ''تم کہاں کھو گئی ہو؟ کیا پولیس میں گم شدگی کی رپورٹ لکھانا ہی ہوگی۔ کام نہ کرو، خط تو لکھو۔'' خدا خدا کر کے اپریل 1998 تک میں نے دیوان بیان کی تدوین خاصا کام نمٹا لیا اور مقدمے کے تین ابواب خاں صاحب کے ملاحظے کے لیے بھیج دیے۔ دیوانِ بیان کا تصحیح شدہ متن بھی اگست تک بھیج دیا جو چار خطی نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ ایک بہت ہی ناقص مطبوعہ نسخہ بھی عبرت کے لیے میرے سامنے تھا۔ ثاقب رضوی ک مرتبہ یہ نسخہ تدوین متن کی بدترین مثال تھا اور رشید صاحب کا خیال تھا اگر یہ کام سوویت یونین میں ہوا ہوتا تو اس کے مرتب کو ضرور سائبیریا بھیج دیا جاتا۔ اگست میں خاں صاحب بمبئی میں قیام پذیر تھے۔ وہیں انھوں نے یہ تمام کام

چک کیا اور ستمبر کے پہلے ہفتے میں واپس بھیج دیا۔ لیکن انھی دنوں ایک بڑا سانحہ یہ ہوا کہ میرے والد 17 ستمبر 1998 کو فوت کر گئے اور اس غم نے پھر سے میرے دل کو ریسرچ کے کام سے اچاٹ دیا۔ والد کے انتقال کے چند مہینے بعد، فروری 1999 میں مجھے قومی اردو کونسل میں ماہنامہ 'اردو دنیا' کی ادارت کا کام مل گیا اور ایک بار پھر زندگی معمول کی طرف لوٹنے لگی۔ میں نے نوکری کی اطلاع دیتے ہوئے خاں صاحب کو دفتر کے کام کاج میں زیادہ مصروف ہو جانے کے بارے میں ضرور لکھا ہوگا کیونکہ 25 فروری 1999 کے اپنے خط میں انھوں لکھا: ''آج ہی تمھارا خط ملا۔ یہ پڑھ کر اطمینان ہوا اور مسرت بھی کہ تم کو زیادہ کام دیا گیا ہے۔ یہ قاعدہ ہے سدا کا کہ گریز پا قیدی کو ہتکڑیوں کے ساتھ بیڑیاں بھی پنھائی جاتی ہیں۔'' بہرحال خاں صاحب نے مزید ابواب کا تقاضا نہیں کیا۔ میں بھی دفتری کام کاج سیکھنے میں بے طرح مصروف ہوگئی۔ مارچ میں خاں صاحب نے دو خط لکھے، میں نے جواب نہیں دیا، وجہ یاد نہیں۔ انھوں نے پریشان ہوکر تیسرا خط لکھا 25 مارچ کو۔ ان کا اگلا خط یکم مئی کو بمبئی سے ملا جس میں 21 مئی کو دہلی پہنچنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اسی دن ان کو شاہ جہاں پور کے لیے دوسری ٹرین سے روانہ ہونا تھا۔ میں ملنے کے لیے ضرور گئی ہوں گی کیونکہ یہ معمول بن گیا تھا کہ اگر خاں صاحب دہلی سے گزریں اور چند گھنٹے کا وقت ان کے پاس ریلوے اسٹیشن پر گزارنے کے لیے ہوتو میں ان سے ملنے ضرور چلی جاتی تھی۔ اپنے آنے کی اطلاع وہ خواہ اطہر کو دیں یا مجھے۔ خیر پی ایچ ڈی کے کچھ ابواب میں نے ان کو ستمبر 1999 میں، کچھ جنوری 2000 میں اور آخری باب جون تک بھیج دیا۔ 24 جنوری کے اپنے خط میں انھوں نے لکھا: ''آج تمھارا پیکٹ ملا۔ تم نے بہت اچھی عبارت لکھی ہے۔ میرا جی خوش ہوا۔ سب کام کی باتیں ہیں، فضول بات کوئی نہیں۔ حوالے بھی سب مناسب ہیں۔ اب جلدی سے اس کا دوسرا حصہ بھیجو، جو آخری حصہ ہوگا۔'' 28 جنوری تک ان کو دوسرا پیکٹ بھی مل چکا تھا۔ انھوں نے خوش ہوکر لکھا: ''تم تو اب واقعی کام کرنے لگی ہو۔ خدا برکت دے اور مزید توفیق بھی کہ تم 'اجے چند نامہ' بھی اسی طرح مکمل کرلو۔ تین بار آمین کہو''۔ اور اس طرح خدا خدا کر کے پی ایچ ڈی کا کام ختم ہوا۔ سارا کام ٹائپ کرا کے ہی بھیجتی تھی، یوں تصحیح کرا کے اسلم صاحب کو دکھانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ کام میں جو کمزوری اور کمیاں رہ گئی تھیں انھیں اسلم صاحب کے مشوروں کے مطابق درست کر کے ڈگری کے لیے جمع کردیا۔

اس کے بعد میں نے تدوین کے کسی کام کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں کی۔ خاں صاحب مشورے دیتے رہے کہ فلاں کام کرلو یا پھر فلاں کام، آسانی سے ہوجائے گا، سارے سورسز لکھ بھیجوں گا، وغیرہ۔ مگر اب میں کہاں ان کے جھانسے میں آنے والی تھی، سو نسبتاً آسان کام پکڑ لیا یعنی ترجموں کی طرف متوجہ ہوئی۔ خط وکتابت بھی بس واجبی سی رہ گئی کیونکہ اس کی جگہ اب فون لے چکا تھا۔ فون کا کوئی رکارڈ تو ہوتا نہیں، باتیں بھی یاد نہیں رہتیں۔ سو ان دنوں کی یادیں بڑی دھندلی سی ہیں۔ اردو کونسل کی نوکری چھوڑ کر جب نومبر 2002 میں دہلی یونی ورسٹی میں اردو پڑھانے کا کام ملا تو اس کی اطلاح بھی فون پر ہی دی۔ جے این یو کے اپنے سابق استاد، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کی عیادت کے لیے جب دسمبر میں لکھنؤ گئی تو پھر خاں صاحب سے ملنے کے لیے شاہ جہاں پور کا بھی پروگرام بنا لیا۔ ان دنوں خاں صاحب زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) مرتب کر رہے تھے اور غالب کی فرہنگ پر بھی کام کر رہے تھے۔ ان کے گھر پر دو دن کے قیام کی یادیں آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ ان کی دونوں بہوئیں بے حد محبت سے ملیں۔ انھوں نے ہر طرح سے آرام کا خیال رکھا۔ شام کو ہم لوگ خاں صاحب کی اجازت سے شاہ جہاں پور کے ایک معروف پارک (نام تھا غالباً شہید پارک) گھومنے گئے۔ اجازت لینے کا کام ان کے پوتے سعود کو سونپا گیا جو اس وقت چھے سات برس کا بڑا ہی شریر قسم کا پیارا سا بچہ تھا۔ خوب چاٹ پکوڑے کھائے گئے۔ بچے اپنے جیب خرچ سے میری تواضع کرنا چاہتے تھے، سو کی۔ بڑا لطف آیا، اور یہ سوچ کر اور زیادہ مزہ آیا کہ خاں صاحب نے بچوں پر بھی ویسے ہی رعب جما رکھا ہے جیسے وہ ہم جیسے نیازمندوں پر جماتے ہیں۔ لیکن میں نے گھر میں دیکھا کہ وہ اپنی بیٹھک میں بیٹھ کر کام کرتے ہوئے ہر بات سے بے نیاز ہونے کا بہانہ ضرور کرتے ہیں، بچوں کی شرارتوں سے چشم پوشی کرتے نظر آتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ انھیں اپنے علمی کاموں کے علاوہ کسی چیز سے کوئی دل چسپی نہیں۔ لیکن اپنی بے نیازی اور لاپرواہی کے پیچھے میں نے ان کو چپکے سے مسکراتے ہوئے دیکھا، اپنی پوتیوں اور پوتے کے لیے ان کی آنکھوں میں بے پناہ محبت دیکھی اور فخر اور خوشی کا احساس۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ سعد یہ اور صدف اپنے دادا کی اس قدر کیوں گرویدہ ہیں، سعود کیوں اس قدر خودسر اور شرارتی ہے اور ساری ضدیں دادا سے پوری کراتا ہے، ان کی بہوئیں کیوں پاپا کے آگے پیچھے گھومتی ہیں اور ان کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنا چاہتی ہیں۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ

اپنی آل اولاد سے خاں صاحب کو بہت محبت ہے لیکن اس کی شدت اور رشتوں کی مضبوطی کا احساس ان کے گھر میں رہ کر ہی ہوا۔ خیر شاہ جہاں پور سے بہت سی محبتیں سمیٹ کر میں دہلی واپس لوٹی۔ خاں صاحب سے زٹل نامے کے پروف بھی لے کر آ گئی کہ پہلا پروف میں پڑھ دوں گی تاکہ وہ اتنے دنوں میں کوئی دوسرا کام کر لیں۔ ان دنوں خاں صاحب غالب کی فرہنگ پر کام کر رہے تھے۔ ہزار ہا کارڈ تیار تھے۔ یہ سب کام بھی انھوں نے مجھے دکھایا۔ ان کے سامنے جتنے منصوبے تھے، اتنی عمر نہیں تھی، اور اس کا انھیں اچھی طرح احساس تھا۔ اس لیے وہ اپنے وقت کا ہر لمحہ صرف اور صرف اہم ترین کاموں کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے۔ شاہ جہاں پور سے میرے واپس آنے کے کچھ دن بعد خاں صاحب نے 14 جنوری 2003 کو جو خط بھیجا اس میں لکھا: ''یہاں بچے بڑے سب تم کو پوچھ رہے ہیں۔ تم خوب آئیں کہ دن بھر میں سب کو جادو کی چھڑی سے اپنا والہ وشیدا بنا لیا۔ یہ کام تو میں ستر برس میں نہیں کر سکا۔ جیتی رہو اور خوش رہو اور فون کرتی رہو۔'' میں واقعی بھابھیوں اور بچوں کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتے میں بندھ گئی تھی۔ آج خاں صاحب نہیں ہیں، لیکن اس چھوٹی سی ملاقات کے سبب ان کا گھر آج بھی میرا اپنا گھر ہے، اس کی یادوں میں آج بھی محبت کی وہی پرانی حرارت ہے۔

اس سفر کے بعد کے خاں صاحب کے صرف چھے خط میرے پاس محفوظ ہیں۔ زیادہ تر باتیں فون پر ہی طے ہو جاتی تھیں۔ جب میں رالف رسل کی آپ بیتی کے ترجمے کو فائنل کر کے جولائی 2004 میں لندن سے لوٹی تو خاں صاحب کو طویل خط لکھا تھا 21 جولائی کو، پورے پانچ صفحے، فل اسکیپ۔ اس میں رالف کے ساتھ قیام کی تفصیلات لکھی تھیں۔ خط کے خاتمے تک آتے آتے مجھے اپنی محنت کا خیال آیا اور خط کو فوٹو کاپی کرا لیا۔ یوں یہ خط محفوظ رہ گیا۔ اسی کی بنیاد پر میں نے رالف رسل پر ایک مضمون لکھا جو ان کی آپ بیتی کے ترجمے 'جوئندہ یابندہ' کے ساتھ کراچی سے اجمل کمال نے شائع کیا ہے۔ خاں صاحب بہت خوش ہوئے تھے خط پڑھ کر اور 26 جولائی کو جواب میں لکھا تھا کہ پچھلا کفارہ ادا ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی اطلاع دی تھی کہ وائرل نے بری طرح پکڑ لیا تھا، ساری طاقت نچوڑ لی اور نقاہت بیان سے باہر ہے۔ خاں صاحب کا 10 اگست 2005 کا خط ایسا تھا جس نے مجھے اداس کر دیا تھا اور مضطرب بھی۔ شاید دل کے کسی گوشے میں کسی خدشے نے سر ابھارا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

عزیزہ ارجمند! دن ہو گئے کہ نہ تمھاری آواز سنی اور نہ تحریر دیکھی؛ یعنی کان بھی محروم اور آنکھیں بھی شکوہ گزار۔ میں بھی ان دنوں بس یوں ہی سا رہا اور مرزا صاحب کے اس شعر کو دہراتا رہا:

اب اپنے ختمِ سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں
جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی

مگر قلم ہے کہ کسی آواز کو سنتا ہی نہیں، چلے جاتا ہے۔

تم کیسی ہو؟ 'آج' کے دونوں شمارے مل گئے تھے، رسید نہیں بھیج سکا، اس کی معذرت۔ ترجمہ (رالف رسل کی آپ بیتی کا) دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور دل سے دعائیں نکلیں۔ جیتی رہو اور خوش رہو۔

اس کے بعد کا خط 8 ستمبر کا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیماری اپنی جگہ، موسم کی زیادتی، شدید گرمی اور بجلی کی کٹوتی نے خاں صاحب کو بے حال کر رکھا تھا، لیکن پریشانیوں کے باوجود خاں صاحب کی شگفتگی ویسے ہی برقرار تھی۔ پورا خط نقل کرتی ہوں:

شاہ جہاں پور، ۸ ستمبر (ستمگر) ۲۰۰۵ء

ارجمند! دعائیں (با اثر ہوں گی یا بے اثر، اس کا احوال مجھے نہیں معلوم)۔ فارم اور پاس بک بھیج رہا ہوں۔ انھیں احتیاط سے رکھ لو اور اکتوبر میں فارم جمع کر دینا اور تبھی پاس بک مکمل کرا لینا اور رجسٹری سے موٹے لفافے میں رکھ کر بھیجنا۔

۱۴ گھنٹے کی بجلی کی کٹوتی نے چین آرام کو حرام بنا دیا ہے۔ کس کو کیا کہا جائے، بھی اللہ میاں کے بندے ہیں اور انھی کی طرح بے نیاز۔ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ کسی دن فون کر لینا تو اطمینان ہو جائے گا کہ میرا لفافہ تم کو مل گیا— رشید حسن خاں

اپنی پنشن کے سلسلے میں ایک فارم ہر سال اکتوبر کے مہینے میں بنک میں جمع کرانا ہوتا تھا جو اس بات کا ثبوت ہوتا تھا کہ پنشنر ابھی زندہ ہے۔ مندرجہ بالا خط میں اسی فارم کا ذکر ہے۔ پاس بک جب پُر کرا کے بھیجی تو گھبرا کر انھوں نے فون کیا کہ شاید کوئی غلط اینٹری ہو گئی ہے اس میں تقریباً تیرہ ہزار روپے زیادہ جمع ہو گئے ہیں، اور اتنے روپے تو میرے کھاتے میں کبھی جمع نہیں رہے۔ مجھے ہنسی بھی آئی اور دکھ بھی ہوا۔ تیرہ ہزار روپے کیا واقعی اتنی بڑی رقم

ہے کہ یکمشت ان کے ہاتھ میں نہ رہے۔ میں نے یونی ورسٹی جاکر معلوم کیا تو پتا چلا کہ arriers جمع ہو گئے تھے۔ خاں صاحب کو بتایا تو بڑے خوش ہوئے کہ روپوں کی بڑی ضرورت تھی، اور یہ غیبی مدد کی طرح پہنچے۔

خاں صاحب کو دہلی سے اپنا کھاتہ چلانے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ پنشن اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی دہلی یونی ورسٹی شاخ میں آتی تھی۔ اگر خاں صاحب ہر مہینے شاہ جہاں پور کے اپنے بنک میں چک ڈالتے تو اس کے کلیر ہونے میں ہفتہ بھر سے زیادہ لگ جاتا اور گھر کا نظام بگڑ جاتا۔ گزشتہ کئی برسوں سے اس کا علاج یہ کیا گیا تھا کہ میں مہینے کے آخر تک تین ہزار روپے کا ڈرافٹ ان کو بھیج دیتی تھی تا کہ پہلی تاریخ تک انھیں پیسا مل جائے، خاں صاحب سال بھر کے اڈوانس چک مجھے بھیج دیتے تھے اور میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو یا اس کے بعد ایک چک اپنے کھاتے میں جمع کرا دیتی تھی۔ اس سے پہلے ان کے لیے یہ کام حبیب خاں کرتے تھے جو انجمن ترقی اردو ہند میں کتاب دار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تھا تو میں بخوشی اس خدمت کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ غالباً 2001 تک یہ سلسلہ چلا تھا، پھر انھوں نے کوئی اور انتظام کر لیا۔ کچھ عرصے سے میں نے انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اے ٹی ایم کارڈ بنوا لیں تا کہ بنک جانے کی جھنجھٹ سے نجات ملے۔ ویسے بھی اے ٹی ایم مشینیں اب سب شہروں اور قصبوں میں آتی جا رہی تھیں۔ آخری خط جو انھوں نے مجھے 17 فروری 2006 کو لکھا، انھی سب معاملات سے متعلق ہے۔ لیکن یہ چونکہ ان کا آخری خط ہے اس لیے تبرک کے طور پر پورا نقل کرتی ہوں:

عزیزہ ارجمند! بہت سی دعائیں۔

ATM کے کاغذ اور کارڈ بھیج رہا ہوں۔ احتیاطاً انھیں متعلقہ فرد کو دے دینا۔ بنک کی پاس بک اکتوبر میں بھیجوں گا، اسی وقت ''ابھی زندہ ہوں'' والا فارم بھی بھیجوں گا۔ مگر وہ فارم میرے پاس نہیں؛ جلدی نہیں، اکتوبر تک کسی وقت بھیج دینا۔ ہاں بس یہ ضرور کرنا کہ بیلنس معلوم کر کے مجھے فون پر بتا دینا۔ DA کی کوئی زائد قسط شاید ملی ہو مجھے بھی۔ اگر ملی ہو گی تو کام آ جائے گی۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم وہاں نہ ہوتیں تو میرا کیا احوال ہوتا! کبھی ماننا ہی پڑتا ہے کہ کوئی ان دیکھی طاقت کہیں ہے ضرور جو مجھ جیسے ناکارہ لوگوں

کے کام بنانے کے لیے ایسے وسیلے پیدا کر دیتی ہے۔ ہاے یگانہ، کیا بات کہی ہے:

شش جہت میں ہے ترے جلوۂ بے فیض کی دھوم
کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہ گار نہیں

جیتی رہو اور شاد کام رہو — رشید حسن خاں

یہ خط مجھے غالباً بائیس تئیس فروری کو ملا ہوگا۔ چھبیس فروری کی صبح پانچ بجے خاں صاحب کے بیٹے، خالد حسن خاں کا فون آ گیا کہ پاپا نہیں رہے۔ رات کے تیسرے پہر، دو بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ ایک دن پہلے تک ٹھیک تھے، بلکہ اس دن، دن میں اطہر فاروقی سے دیر تک فون پر بات چیت بھی ہوئی تھی۔

دہلی یونیورسٹی کے اردو شعبے میں تعزیتی جلسہ ہوا، مجھ سے بھی اظہارِ خیال کے لیے کہا گیا۔ مجھے یاد آیا کہ ہفتہ بھر ہی گزرا ہوگا جب خاں صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی اور وہ اپنے بنک کے کھاتے میں تیرہ ہزار کی اس رقم پر بوکھلاے ہوئے تھے جو ان کے خیال میں غلطی سے کہیں سے آ گئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ان کی باتوں میں جو کھرا پن تھا، جو عالمانہ دبدبہ تھا، جو قطعیت تھی، جو اعتماد تھا وہ بس ایسے ہی ذی علم اور اپنے کام سے ایسے ہی والہانہ وابستگی رکھنے والے شخص میں ہو سکتا تھا جیسے خاں صاحب تھے۔ علم کی دیوی جس کے قدموں کی باندی ہو اسے بھلا روپوں سے کیا غرض اور کیوں غرض ہو؟ میں نے اس جلسے میں ان کی شخصیت کے حوالے سے تھوڑی سی باتیں کیں، ان کی نوازشوں اور شفقتوں کا ذکر کیا اور فون پر ان سے آخری بات چیت کا ذکر کر کے بیٹھ گئی۔ جتنی باتیں کیں ان سے زیادہ پر غور کرتی رہی، دیر تک غور کرتی رہی۔ کیسی ستم ظریفی تھی ہمارے سماجی نظام کی، تہذیبی قدروں کے زوال کی — ایک پروفیسر ہر مہینے چالیس ہزار کی تنخواہ اپنے ضمیر پر شمہ بھر یہ بوجھ ڈالے بغیر اٹھا سکتا ہے کہ اس نے اس مہینے میں کوئی ایک کلاس بھی پڑھائی، کوئی ایک مضمون لکھا، یا کوئی اور علمی کام کیا یا نہیں۔ ترتیب دی ہوئی غیر معیاری کتابوں کے ڈھیر، سیمیناروں میں بے سر پیر کی تقریریں اور کئی کئی سال پرانے پرچے اسے علم و فضل کے منصب پر بٹھا دیتے ہیں۔ اس کا عہدہ، اس کی پوزیشن، اس کی تنخواہ اسے ہر قسم کے احتساب سے مبرا کر دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں رشید حسن خاں جیسے آدمی کی کیا حیثیت؟ ان 'اعلا حیثیت' لوگوں کے درمیان ایک حقیر سا شخص، اردو شعبے کا ایک معمولی سا

ریسرچ اسسٹنٹ۔ پروفیسر صاحبان کے ساتھ بھلا ایسے شخص کا نام کیسے لیا جاسکتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ اردو شعبے کے کئی لوگ ان کا نام تحقیر سے لیتے ہیں اور ان کا ذکر آنے پر ہمیشہ یاد دلاتے ہیں کہ وہ یہاں ایک معمولی عہدے پر تھے، ہم میں سے نہیں تھے۔ میں دل میں سوچتی ہوں، خوش قسمت تھے جو اِن میں سے نہیں تھے۔ اگر اُن میں سے ہوتے تو سارے برصغیر میں ان کی علمیت کا ڈنکا نہ بج رہا ہوتا۔

اس جلسے میں شعبے کے ایک سابق استاد ڈاکٹر شریف احمد بھی تشریف لائے تھے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے اس زمانے کی بہت سی یادوں کا ذکر کیا جب وہ شعبے میں ساتھ ساتھ تھے، ان کی دوٹوک رائے سے شعبے کے بہت سے لوگ انھیں ناپسند کرنے لگے تھے اور یہ بھی افسوس کے ساتھ بتایا کہ جب خاں صاحب رٹائر ہوئے تو ان سے گائڈ ہال والا کمرہ خالی کرانے کے لیے باقاعدہ محاذ بن گیا، ان کے خلاف یونیورسٹی انتظامیہ کو خطوط بھیجے گئے تاکہ کمرہ خالی کرایا جاسکے۔ یہ بغض غالباً اس لیے تھا کہ خاں صاحب ان کی علمیت کا صحیح صحیح تجزیہ اکثر علی الاعلان کردیتے تھے۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے پروجیکٹ کو اپنے تبصرے کے سبب ضبط کرادینے والے خاں صاحب سے اب یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی تھی کہ اپنے شعبے کے معاملے میں منافقانہ رویہ اختیار کرتے۔ ایسے میں اگر ان سے اکثر اساتذہ کو شکایت پیدا ہوگئی تھی تو وہ اس میں حق بجانب تھے۔ قصور تو خاں صاحب ہی کا تھا کہ اپنی 'حیثیت' سے بڑھ کر وہ 'باحیثیت' لوگوں کے ساتھ جھگڑے مول لیتے تھے۔ اس کے بعد خاں صاحب کو اپنے شعبے کا افتخار سمجھنے کے بجائے یہ صاحبان اگر ان کو نکلوانے کے درپے تھے، اور اس طرح ذلت اور کم نصیبی کا داغ یہاں کے اساتذہ کو ملنا تھا تو اس کو وقت کی ستم ظریفی ہی کہیں گے۔ بھلا فرعون کو اور نمرود کو کب معلوم تھا کہ خدائی کے تمام تر دعووں کے باوجود تاریخ ان کے نصیب میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں لکھے گی!

جولائی 2004 میں کراچی سے اجمل کمال کا ایک ای میل مجھے ملا تھا جس میں انھوں نے پوچھا تھا کہ خاں صاحب کا ای میل ایڈریس لکھ بھیجوں تاکہ ان سے مراسلت کا کچھ سلسلہ چل نکلے۔ اجمل کمال اچھے لکھنے والوں کے قدردان ہیں اور کوشش کرتے ہیں کسی نہ کسی طور ان سے رابطہ رکھیں اور ان کی تحریریں اپنے سہ ماہی جریدے 'آج' میں چھاپیں۔ اجمل کے استفسار پر مجھے ہنسی آگئی۔ خاں صاحب جیسا صوفی منش آدمی جس نے اپنی پوری زندگی ہاسٹل کے ایک کمرے میں کتابوں کی رفاقت میں گزار دی، نہ وہاں فون لگوایا نہ گھر پر

شاہ جہاں پور میں۔ اتنی آمدنی بھی نہیں تھی، ہوتی بھی تو دوسری ضرورتوں کو ترجیح حاصل ہوتی۔ ایسا بے نیاز بوریا نشین اور ای میل؟ میں نے اجمل کو جواب میں حقیقتِ حال سے واقف کرایا تو انھوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ وہ ان حالات سے بالکل بھی واقف نہیں تھے، خاں صاحب کے علمی کاموں کے قدردان تھے، بس۔ میرا خط پڑھ کر لکھا کہ اب میرے دل میں ان کی قدر و منزلت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

رشید حسن خاں نے خود تو بے نیازی کی زندگی گزاری لیکن اپنے نیاز مند طالب علموں کے روزگار کی فکر میں خوب گھلتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ ان کے روزگار کے لیے کوئی جوڑتوڑ کرنے کے بجائے ہمیشہ یہی تلقین کرتے کہ محنت سے پڑھو لکھو اور اپنے لیے مقام بناؤ۔ غالباً اپنی زندگی کو اپنے نیاز مندوں کے لیے بھی آئیڈیل مانتے تھے۔ رٹائرمنٹ تک وہ گائر ہال کے دو کمروں پر مشتمل TC-9 میں رہے۔ ان کی بنیادی ضرورتوں کی اشیاء تھیں ــــ دیوار سے دیوار تک لگے کتابوں کے شیلف، پڑھنے لکھنے کے لیے ایک میز کرسی، ملاقاتیوں کے لیے چند کرسیاں۔ اندر والے کمرے میں ایک بستر اور چائے بنانے کے لیے ایک پرکیولیٹر۔ اس سادہ سی زندگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ زندگی سے خاں صاحب کے کچھ مطالبات ہی نہ تھے۔ اچھے معیارِ زندگی کا ان کا تصور تھا جس پر وہ کوئی مفاہمت نہیں کر سکتے تھے۔ آپ کو ان کی میز پر کوئی عام فاؤنٹین پین یا کوئی بال پین نظر نہ آ سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ شیفر یا پارکر سے لکھتے تھے۔ خصوصاً ان دو برانڈوں کے پین ان کے پاس اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ ان کے تمام دوستوں اور نیاز مندوں کی ان کے شوق معلوم تھے۔ چنانچہ جو کوئی بھی یوروپ و امریکہ کے سفر سے لوٹتا ایک اچھا پین خاں صاحب کے لیے خریدنا نہ بھولتا۔ خراب پینوں کی مرمت فتح پوری کی مسجد کے پاس، چاندنی چوک میں واقع Coronation والے کی دکان پر کراتے تھے۔ غیر ملکی برانڈ کے پینوں کی مرمت کے لیے بس یہی ایک مشہور دکان تھی۔

ایسا ہی شوق اچھی چائے پینے کا بھی تھا۔ ہمیشہ گولڈن اورنج پیکو استعمال کرتے۔ اگر یہ برانڈ نہ ملے تو اورنج پیکو سے کام چلاتے۔ اس کے سوا کوئی دوسری چائے نہیں پیتے تھے۔ کناٹ پلیس میں پالیکا بازار سے بائیں جانب والے وِنگ میں واقع جانکی داس ڈپارٹمنٹل اسٹور میں یہ چائے ملتی تھی۔ ایک ہی دکان تھی۔ جب بھی دہلی آنا ہوتا اور وقت کم ہوتا تو پہلے ہی خط لکھ دیتے کہ چائے بھی خریدنی ہے۔ جب ملنے کے لیے آؤ تو خریدتی ہوئی آؤ، آدھا

دن بچ جائے گا۔ آدھا کلو کا پیکٹ 144 روپے کا ملے گا، فوراً ہی قیمت ادا کر دوں گا۔

خاں صاحب لباس کے معاملے میں بھی بڑے خوش مذاق تھے۔ نہایت سادہ مگر خوش وضع، اور رنگوں کے انتخاب میں بھی باذوق۔ یہی سلیقہ ان کی زندگی کے ہر پہلو میں دیکھنے کو ملتا تھا۔ سچے اسپورٹس مین کی طرح بڑے ڈسپلن میں رہتے۔ فٹ بال کے اچھے کھلاڑی اور میچ دیکھنے کے شوقین تھے۔ یہی ذوق وشوق اور سخت ضابطہ ان کی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نظر آتا تھا۔ اسی لیے وقت لیے بغیر، بلا اجازت اور بلا ضرورت ان سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔ خاں صاحب کتنے بجے ناشتے کی میز پر ہوں گے، کب سے کب تک ٹیوٹوریل بلڈنگ میں اپنے آفس میں ہوں گے، کتنے بجے کافی پیتے ملیں گے، کتنے بجے کھانا کھائیں گے، کب سے کب تک آرام کریں گے، کب کافی ہاؤس جائیں گے، غرض ہر بات کا وقت مقرر تھا۔ آپ انھیں دیکھ کر گھڑی ملا سکتے تھے۔ خوشامد پسندی طبیعت میں نام کو نہ تھی۔ انھیں بالکل پسند نہیں تھا کہ کوئی بلا وجہ بات چیت کے لیے تعریفیں شروع کر دے، جیسا کہ اکثر ادبی محفلوں اور سیمیناروں میں ہوتا ہے۔ مجھے ایک بار کا واقعہ یاد ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے غالب سیمنار میں اپنا پرچہ پڑھ کر خاں صاحب نے اپنے چند احباب کے ساتھ کافی پینے جانے کا پلان بنایا۔ طے ہوا کہ بہادر شاہ ظفر مارگ پر اخباروں کے دفاتر کے سامنے والی سڑک پر جو سب وے ہے، اس میں واقع ریستراں میں کافی پی جائے۔ جب باہر آ کر رکشہ پر سوار ہونے کو تھے تو ایک صاحب آگے بڑھ کر ان سے بڑی نیاز مندی سے ملے اور پوچھ بیٹھے کہ حضرت اب دوبارہ کب دہلی تشریف لائیں گے۔ خاں صاحب نے پوچھا، کیوں؟ فرمانے لگے کہ اگر معلوم ہو جایا کرے کہ آپ تشریف لانے والے ہیں تو ہم ایسے طالب علم استفادے کے لیے حاضر ہو جایا کریں۔ خاں صاحب کے چہرے پر درشتی ظاہر ہوئی۔ کہنے لگے، میں ساری زندگی گائر ہال میں مقیم رہا، آپ کتنی بار استفادے کے لیے گائر ہال تشریف لائے؟ اس پر وہ صاحب سٹپٹا گئے اور خاں صاحب نے رکشہ والے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔ ایسا کئی بار ہوا جب خاں صاحب کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ ان کو جو بات کہنی ہوتی ہے کمالِ سادگی اور صاف گوئی سے کہہ دیتے ہیں، چاہے بات کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو، ان کے لہجے میں معمولی سی بھی لغزش نہیں آتی، ان کے تیور ذرا نہیں بدلتے۔ جس طرح ان کے لکھے ہوئے الفاظ حق وصداقت کا اعلان کرتے ہیں، اسی طرح وہ آمنے سامنے کی گفتگو میں بھی بے باک تھے۔ یہ ایسا وصف ہے جو بہت کم

لوگوں میں ہوتا ہے، خصوصاً اردو کی دنیا میں تو اس کی مثال شاذ ہی ملے گی۔

اب سوچتی ہوں کہ مجھ ایسی کاہل الوجود، کام چوروں کی سچی جانشین نے خاں صاحب پر مضمون کیوں لکھا۔ پلان ایک سال سے کر رہی تھی لیکن پریشر کوئی نہیں تھا اس لیے قلم اٹھاتی ہی نہیں تھی۔ اب جاوید رحمانی نے (جو خاں صاحب پر کوئی کتاب مرتب کررہے ہیں) ہر ہفتے دو ہفتے میں یاد دلانے کی ذمے داری لے لی تو بس دوسرے غیر ضروری کاموں کو پس پشت ڈالنا پڑا۔ اس سے قبل ایک مضمون رالف رسل پر لکھا تھا۔ سوچتی ہوں کیسا عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں حضرات جن پر قلم اٹھانے کو میں نے اپنے دل کو آمادہ پایا، کچھ نہ کچھ ایسی مشترک قدروں کے حامل ہیں جن کو میں بھی سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہوں۔ یہ مشترک اقدار ہیں — ان کا کھرا پن۔ بغیر لاگ لپیٹ کے سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنے کا حوصلہ۔ اپنے کام کے لیے بے پناہ لگن۔ زندگی پر اعتماد اور انسان دوستی پر کامل یقین۔ کاش ان جوہروں کا عشر عشیر بھی ہماری سرشت کا حصہ بن جائے تاکہ اردو دنیا سانس لینے کی ایک بہتر جگہ بن سکے۔

☆☆☆

انور خاں

رشید حسن خاں کا تنقیدی رویہ اور شخصیت

جب تک آخری سانس ہے تبدیلی و تغیر کی گنجائش ہے۔ آدمی کا نقطۂ نظر بدلتا ہے۔ واقعات بدلتے ہیں پھر ایک بات اور کہ سچائیاں اور حقیقتیں اپنے آپ کو ایک دم نمایاں نہیں کرتیں بالترتیب سامنے آتی ہیں۔

(رشید حسن خاں)

اپنی زندگی میں مجھے ایک بار ہر چیز کو رد کرنا پڑا۔ آج میرا ذہن ہر طرح سے آزاد ہے۔ میں بالکل اکیلا ہوں اس سوچ میں شک کرنا، سمجھنا، تصدیق کرنا، انکار کرنا، ارادہ کرنا، انحراف کرنا، محسوس کرنا سب شامل ہیں۔ یہ انسانی وجود کی ضروریات ہیں۔

(دیکارت)

شب و روز کے اندھیرے اجالے سے گزرتے ہوئے کبھی کبھی اچانک احساس ہوتا ہے کہ جینے کا انداز ہی بدل گیا ہے۔ وہ اسالیب جو ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اچانک پرانے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن چند اسالیب ان میں ایسے ہوتے ہیں جن کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ رشید حسن خاں ایسے ہی خوش اسلوب انسانوں میں سے ہیں جن کے اسلوب کی کشش کبھی ماند نہیں پڑی۔ معاصر بزرگ اُن کی علمیت کے معترف ہیں اور نوجوان علمیت کے ساتھ اُن کی صاف گوئی کے مداح۔ زبان و قواعد، املا اور انشا پر گفتگو اور تحریروں سے عموماً دلچسپی کم ہی ہوتی ہے لیکن ان موضوعات پر رشید حسن خاں مخاطب ہوں "تو وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" والی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ دس سال قبل ممبئی یونیورسٹی میں اُن کے لکچر ہوئے تو ابتدا میں طلبہ صدر شعبۂ اردو کے ڈر سے لکچر سننے کے لیے جمع

ہوئے تھے۔ لیکن اپنے موضوع سے خاں صاحب کی دلچسپی، انہماک اور عبور اُن پر کچھ ایسے اثر انداز ہوئے کہ رفتہ رفتہ املا اور تدوین کے خشک مسائل پر لکچروں میں بھی ہال میں جگہ ملنی دشوار ہونے لگی۔ اس کی ایک وجہ ان کا دلکش اندازِ تقریر بھی کہا جاسکتا ہے۔ کہیں ذرا جارحانہ انداز، کبھی خوبصورت سا برجستہ کوئی شعر کہ ہال میں جابجا تبسم کے پھول کھل اُٹھیں۔ یونیورسٹی کے دلکش سر سبز پس منظر میں طلبہ و طالبات کے ہجوم میں تدوین کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے جب وہ غالبؔ کا یہ شعر سناتے ہیں:

اسدؔ، اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدن مضمونِ عالی ہے

تو ذہن تدوین کے مسائل کے ساتھ ساتھ شعر کے بصری پیکروں سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ یا پھر جیسے یہ شعر:

اسدؔ! بند قبائے یار، ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو، تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

سنتے ہوئے آپ یک عالمِ گلستاں کے تصور میں کھو جاتے ہیں اور پورے ہال میں تازگی اور بشاشت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ گھٹتی ہوئی توجہ بحال ہوجاتی ہے۔ اس سے خاں صاحب کی خوش ذوقی اور نفاست کا اندازہ ہوتا ہے اور مہارت کا بھی۔ وہ جانتے ہیں کہ خشک سے خشک موضوع کس طرح بیان کیا جائے کہ سامعین بے کیف نہ ہوں اور مطالب سہولت سے ذہن نشیں ہوجائیں۔ دبی دبی مسکراہٹوں کے ساتھ کمرہ کچھ اور روشن، فضا ذی جان سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

لکچر کے اختتام پر اساتذہ، طلبہ اور اُدبا و شعرا اور شائقینِ ادب انھیں گھیر لیتے ہیں اور متعلقہ موضوع کے علاوہ زبان و قواعد یا ادبی نکات پر اپنی الجھنیں گوش گزار کر کے مشوروں کے خواستگار ہوتے ہیں۔ خاں صاحب تحمل و بردباری کے ساتھ بہ خندۂ جبیں مشفقانہ انداز میں دل جمعی کے ساتھ انھیں اس طرح سمجھاتے ہیں کہ پوری تسلی ہوجائے۔ گاہ ادبی نکات ذہن نشیں کراتے ہیں۔ گاہ بنیادی اصول بیان کرتے ہیں۔ بار بار مثالیں دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کبھی کبھی لکچر سے زیادہ طویل ہوجاتا ہے۔ ان کی ممبئی آمد یہاں کے طلبہ و اساتذہ بلکہ خوش نویسوں، ادیبوں اور شاعروں کے لیے بھی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نئی نسل زبان و ادب کے مسائل سے اتنی باخبر نہیں۔ فیضؔ و مجازؔ اور ساحرؔ

لدھیانوی، مجروحؔ اور سردارؔ جعفری پر رشید حسن خاں کی تنقید بھی وہ ان شعرا کے پورے احترام کے ساتھ ساتھ خالص علمی دلچسپی سے پڑھتی ہے۔

تمام تر شہرت کے باوجود خاں صاحب میں وہ روکھا پن نہیں جو طلبہ کو پروفیسروں کے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ انھیں کسی سوال پر چاہے وہ کتنا ہی بچکانہ ہو استہزا کے ساتھ جواب دیتے یا چیں بہ جبیں ہوتے میں نے نہیں دیکھا۔ انتہائی شفقت اور پیار سے بسا اوقات ایسے شگفتہ انداز میں جواب دیتے ہیں کہ فضا زعفران زار ہو جاتی ہے اور مخاطب خود بھی ان قہقہوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ طبیعت کا یہ پہلو میرے خیال میں کلاسیکی شاعروں کے مطالعے کے ساتھ ساتھ کھیل کے میدانوں کی کھلی فضا اور کافی ہاؤس کی بے تکلف صحبتوں کی دین ہے۔ اسپورٹس مین اسپرٹ اور کھیل کے قواعد کے ساتھ ساتھ کھلاڑی شکست و فتح کو بھی فراخ دلی سے قبول کرتا ہے اور زندگی کے نشیب و فراز کو بھی اسی کھلے ذہن سے دیکھتا ہے۔ کافی ہاؤس کی صحبتیں مختلف المزاج شخصیتوں کے نقطہ ہائے نظر کو برداشت کرنے کی عادی بناتی ہیں۔ وسیع النظری اور رواداری پیدا کرتی ہیں۔ رشید حسن خاں نے خود بھی ہاکی کھیلی ہے اور ہاکی اور باسکٹ بال کے میچ برابر دیکھتے رہتے ہیں۔ کھیلوں سے مجھے بھی دلچسپی ہے اس لیے جب کوئی بین الاقوامی ہاکی ٹورنامنٹ ہوتا ہے، گفتگو کا ایک موضوع ہاتھ آجاتا ہے۔ ادھر دو تین سال سے آنکھوں کے آپریشن کی وجہ سے وہ یہ مقابلے نہیں دیکھ پا رہے ہیں جس کی کمی وہ یقیناً محسوس کرتے ہوں گے۔ یہاں اُن کے خطوط سے ایک اقتباس پیش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس سے ان کے ہاکی سے لگاؤ اور انہماک کا پتا چلتا ہے۔ ایک خط میں انھوں نے مجھے لکھا:

> ''ایک مشکل یہ بڑھ گئی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اس وقت اعلا درجے کا سنٹر ہاف موجود نہیں۔ یہاں اجیت سنگھ کے بعد اور وہاں اختر رسول کے بعد ان دونوں کی سطح کا کوئی سنٹر ہاف نہیں نکلا۔ یہ بڑی اہم پوزیشن ہوتی ہے۔ سارا کھیل اصل میں اسی محور پر گردش کرتا ہے۔ اجیت پال میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ بیک وقت ڈسٹری بیوٹر بھی تھا اور ڈفنڈر بھی۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ اس وقت اسے کہاں ہونا ہے۔ پوزیشن لینے کا یہ احساس اب کم یاب ہے۔ یہی خوبی اختر رسول میں تھی۔ اب جو سنٹر ہاف ہیں دونوں جگہ وہ جتنے اچھے ڈفنس کرنے والے ہیں اتنے

اچھے تقسیم کار نہیں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اچھا رائٹ آؤٹ کوئی نہیں ہمارے پاس۔ جلال الدین یا کوئی اور سب اوسط درجے کے ہیں۔ رائٹ آؤٹ کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پچیس گز کی لائن سے ذرا نیچے اُتر کر جب گیند پھینکتا ہے تو سارا ڈفنس ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ لفٹ ہاف بے کار ہوکر رہ جاتا ہے۔ اور لفٹ ہاف کسی ٹیم میں بڑی ظالم چیز ہوتا ہے۔ رائٹ اِن اور رائٹ آؤٹ کو کمبائن نہیں ہونے دیتا۔ اب ایسے رائٹ آؤٹ نظر نہیں آتے جو مخالف لفٹ ہاف کو اس طرح بے کار کرکے رکھ دیں اور ایسی گیندیں سنٹر میں پھینکیں کہ دونوں فل بیک گھبرانے لگیں۔ یہ خوبی ہمارے لفٹ آؤٹ ظفر اقبال میں تھی مگر ان میں ایک خوبی ذرا سی یہ تھی کہ وہ اکثر لفٹ اِن سے کمبی نیشن نہیں بنا پاتے تھے۔ خود بھی گیند لے کر نکلنا اور گول کرنا چاہتے تھے۔ پھر بھی اور سب سے بہتر تھے"۔

کلاسیکی موسیقی سے بھی انھیں ایسا ہی لگاؤ ہے جیسا تحقیق وتدوین اور ہاکی سے۔ خوش مذاقی رشید حسن خاں کی شخصیت کا ایک ایسا وصف ہے جو بہت چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ لباس، گفتگو، غذا ہر بات میں اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایک سادہ سا بش شرٹ پہنے وہ آپ کے سامنے آتے ہیں تو خیال گزرتا ہے بلکہ اُس کی وضع قطع اور سلائی دیکھ کر آپ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ یونہی نہیں خرید لیا گیا۔ کپڑا کسی خاص دکان سے اپنے مذاق کے مطابق خریدا گیا ہے اور کسی خاص سلیقہ مند درزی سے سلوایا گیا ہے۔ کسی ریستوران میں داخل ہونے سے پہلے وہ تشفی کرلیتے ہیں کہ ریستوراں قرینے کا ہے۔ ریستوان میں چائے پر کافی کو ترجیح دیں گے۔ اگر فلٹر کافی دستیاب ہو تو کیا کہنا! غذا تھوڑی ہو مگر اچھی ہو۔ (یونیورسٹی کے میس کا اجتماعی طعام بھی البتہ برسوں وہ اسی صبر وشکر سے کھاتے رہے کہ اس کے بغیر تحقیق کا حق ادا نہیں ہوسکتا) کسی کے گھر جانا ہوا تو خواتین اور بچوں سے مخاطب ہوں گے۔ ان کی روزمرہ مصروفیات اور دلچسپیوں پر گفتگو کریں گے۔ ایک شفیق بزرگ کو اس قدر توجہ سے بات چیت کرتے دیکھ کر وہ بھی خوش ہوتے ہیں اور انسیت محسوس کرتے ہیں۔ خطوں میں یہ ضرور لکھتے ہیں کہ گھر کی، دفتر کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھائیں۔ کسی بھی حالت میں اُن سے دست کش نہ ہوں۔

اپنے ماحول سے دلچسپی لینا، اُس سے نباہ کرنا اور مکروہات کو خاطر میں لائے بغیر اُس سے مقدور بھر ہم آہنگی پیدا کرنا ایک خوش مذاق شخصیت کا ایسا وصف ہے جس کی کمی شخصیت میں ادھورے پن کا تاثر دیتی ہے۔ یہ احساس مجھے رشید حسن خاں سے مل کر کبھی نہیں ہوا۔ تحقیق جیسے خشک کام میں پتہ مارنے کے باوجود وہ مردم بیزار نہیں۔ ہاں دوستوں اور شناساؤں کے انتخاب میں احتیاط ضرور برتتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ اگر آپ کی نظر سے گزرے تو آپ دیکھیں گے کہ دو الفاظ کے درمیان مناسب فاصلہ نظر آتا ہے۔ قلم میں ہمواری ہے اور کاٹ چھانٹ برائے نام، ظاہر ہے یہ وہ ڈرافٹ ہے جو کئی مسودوں کے بعد فائنل ہوا ہے۔ یہی سلیقہ اُن کی تحریر میں ہے۔ ایک ایک لفظ چنا ہوا، خیالات واضح، اظہار کی خوش سلیقگی، موضوع کی خشکی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ تحریر ایسی پُر لطف کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہے۔ اُن کے ایسے مضامین بھی جن سے عام قاری کو دلچسپی نہیں ہوتی انسان دلچسپی سے پڑھ لیتا ہے۔ ان کا اسلوب ادبی، تحقیقی مضامین کے لیے بہت مناسب ہے۔ اس میں شبلی کی نثر کی چاشنی ہے۔ اسے اپنانے کو جی چاہتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کیوں کہ اس میں ان کی شخصیت کی پوری کیمیا شامل ہے جس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ کبھی لگی لپٹی گفتگو نہیں کرتے۔ بے جا تعریف وہ کر نہیں سکتے۔ اب تو لوگ من ترا حاجی بگویم والے رویے کے عادی سے ہو گئے ہیں اور اسے اردو کلچر کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن رشید حسن خاں ان باتوں سے اس طرح بچتے ہیں گویا خار دار جھاڑیوں سے گزر رہے ہوں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ''تنقید میں انشائیہ اسلوب ادا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایسی وضاحت کی نوبت آہی نہیں پاتی جس سے قطعیت کے ساتھ ذمہ داری کا انتساب کیا جاسکے۔ ہر بات کو ایسے پہلودار انداز سے کہا جاسکتا ہے کہ مختلف اوقات میں اس کی مختلف تعبیریں کی جاسکیں۔ ذہن کی آوارہ خرام موجیں، تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کے نظر فریب رنگوں میں آمیز ہو کر رواں دواں رہتی ہیں۔ جو نہ خود ٹھہرتی ہیں نہ نظر کو ٹھہرنے کی مہلت دیتی ہیں۔ ہر بات کو اس ڈھنگ سے کہا جاسکتا ہے کہ کہنے والے پر کوئی حتمی ذمہ داری عائد نہ ہو سکے۔ مطالعے کی کمی، ایمان داری کی کمی، صُلح سمجھوتے کی ضرورت اور کسی واضح ذمہ داری سے محفوظ رہنے کی اہمیت ان سب کا حق ادا ہو جاتا ہے''۔

جو لوگ خاں صاحب کی تنقید کی زد میں آئے انھوں نے کہا یہ منفی تنقید ہے۔ انتظار حسین کہتے ہیں کہ لفظ منفی سیاست سے لیا گیا ہے اور ترقی پسند حضرات جب کسی کو سولی پر

چڑھاتے ہیں تو یہی کہہ کر چڑھاتے ہیں کہ اس کا زندگی کے بارے میں منفی رویہ ہے۔ (اوراق سالنامہ دسمبر ۱۹۶۹ء)۔ رشید حسن خاں نے مجروح کے شعری مجموعے 'غزل' پر تبصرہ کیا۔ فیضؔ کی نظموں کا تجزیہ کیا۔ ایک عام مضمون ان عمومی غلطیوں پر لکھا جو ترقی پسند شاعروں کے یہاں سطح پر نظر آتی تھیں۔ یہ شاعر اپنے عہد کے مقبول شاعر تھے۔ اگر ان کی شاعری میں زبان و بیان کی خامیوں پر توجہ نہ دلائی جاتی تو بعد کے ادیبوں کے لیے وہ غلطیاں سند مان لی جاتیں۔ ان خامیوں کی وجہ سے ان شاعروں کے مرتبے پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان مضامین میں خاں صاحب کا لہجہ کہیں زیادہ سخت ہوگیا ہے جو ایک پیورٹن (بے لچک) مزاج کا خاصہ ہے۔ ادیب و شاعر عموماً ایسی تنقیدیں پسند نہیں کرتے، انھیں خیال ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت پر روک لگائی جارہی ہے۔ ہمارے یہاں زبان و بیان کا حربہ اچھے ادیبوں کی تنقیص کے لیے ہمیشہ سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس بات سے قطع نظر یہ بھی سچ ہے کہ زبان کی خامیوں اور نقائص کی نشان دہی بھی بے حد ضروری ہے۔ ورنہ ادب میں نراج پھیل سکتا ہے۔ ایسا نہیں کہ اس ضمن میں رشید حسن خاں کو صرف ترقی پسند ادب سے ہی یہ شکایت رہی ہو۔ اپنے ایک مضمون ''مشرقی شعریات اور نیاز فتح پوری'' (مطبوعہ 'ایوانِ اردو' اکتوبر ۱۹۹۲ء) میں وہ لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ کلاسیکی ادبی روایت کو کم توجہی کی نظر کردیا گیا اور زبان و بیان پر گفتگو کرنا تو گویا بورژوا ہونے کا اعلان کرنا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ اس تحریک کا شیرازہ بکھرنے کے بعد جدیدیت کی جو لہر اٹھی اُس میں بھی سب سے زیادہ شامت آئی زبان و بیان کی۔ علامت نگاری اور تجرید کا ایسا شور اٹھا کہ کچھ دنوں کے لیے دوسری آوازیں دب کر رہ گئیں۔ شعری روایت سے بے تعلقی ہی نہیں بیزاری بڑھنے لگی۔ ان سب محرکات سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ پوری ایک نسل زبان کے نکات اور بیان کے محاسن کے عرفان سے محروم سی ہوکر رہ گئی۔ زبان کا جو رچا ہوا شعور ہونا چاہیے اور شعری روایت سے جو شناسائی ہونا چاہیے اُس سے محرومی نے بہت سے گل کھلائے ہیں''۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو ذریعۂ تعلیم نہ رہی۔ اب اکثر طلبہ ہندی اور انگریزی میڈیم اسکولوں سے پڑھ کر نکلتے ہیں۔ وہ اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ اچھی اردو بولنا اور لکھنا چاہتے ہیں۔ ہر اچھے طالب علم اور تخلیق کار کو اس بات کا احساس بخوبی ہوتا ہے کہ زبان و بیان پر

قابو پائے بغیر بعض حضرات ایسی معنی آفرینیوں کے نمونے پیش کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں رشید حسن خاں اپنے ایک مضمون میں ۱۹۲۰ء کے دیوانِ غالب کے ایڈیشن میں ڈاکٹر سیّد محمود کے مقدمے کی مثال دیتے ہیں۔ اس مقدمے کے بارے میں شیخ اکرام 'غالب نامہ' میں لکھتے ہیں: ''مرزا کے چند مداحوں نے اُن کے بعض اشعار سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان میں حبِ وطن کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ حقیقتاً یہ خیال مرزا کے حالاتِ زندگی اور اُن کے فارسی کلام سے واقفیت کی وجہ سے نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ مرزا کی اُفتادِ طبیعت کے غلط اندازے پر مبنی ہے''۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے لکھا کہ ''اس طرح کی تنقیدوں سے اردو داں طبقے میں ایک بدذوقی پیدا ہو چکی ہے''۔ ایک اور مثال رشید حسن خاں نے لکھنؤ کے ریختی گو جاں صاحب کے دیوان پر آغا حیدر حسن دہلوی کے مقدمے کی دی ہے، جس پر مولوی عبدالحق نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''جاں صاحب کی شاعری جیسی کچھ ہے معلوم ہے۔ اُس پر آغا صاحب جو کچھ چاہتے لکھتے لیکن قیامت یہ ہے کہ اُسے اس کے کلام سے بہت بڑا محبِ وطن، قوم پرست اور تارک حوالات ثابت کیا ہے ...... یہ ذوقِ سلیم کا خون کرنا ہی نہیں بلکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنی ہے''۔ ان مثالوں کو پیش کرنے کے بعد خاں صاحب کہتے ہیں کہ اگر قاری سب کچھ ہے وہی اساسِ تنقید ہے تو آغا صاحب کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ آغا صاحب بھی قاری ہیں۔ نیز مصنف کے قاری ہزار در ہزار ہو سکتے ہیں اور ان میں ہر قماش اور ہر سطح کے لوگ ہوں گے۔ کسی مصنف کے مجموعۂ فکر و خیال کو غیر مشروط طور پر دوسروں کی قیاس آرائی کے حوالے کر دینا تحقیق اور تدوین میں کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا''۔

ظاہر ہے کہ یہ آج کی تنقید پر بھی ایک بنیادی اعتراض ہے۔ اب ایسی قیاس آرائیاں اتنی عام ہو چکی ہیں کہ قاری بھی اُن سے وحشت نہیں محسوس کرتا۔ یہ وبا افسانوں پر تحریروں میں اس قدر عام ہو چکی ہے اور ایسے افسانہ نگار آ گئے ہیں جو بے سر و پا افسانے لکھنے میں اتنے ماہر ہیں کہ ان کی من چاہی تعبیریں پیش کر کے ایک تجزیہ نگار اپنی عاقبت سنوار سکتا ہے۔

رشید حسن خاں نے تنقیدی مضامین زیادہ نہیں لکھے لیکن ان کا بے لاگ رویہ اور بے راہ رویوں پر سخت گرفت انھیں عصری تنقید میں بھی ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

❖❖❖

انتظار حسین

رشید حسن خاں — ایک تعمیری محقق

رشید حسن خاں کی تحقیق کا معاملہ کچھ غالبؔ کے قصیدے کا سا ہے۔ غالب نے اپنے ایک خط میں اپنے قصیدے کی کیفیت یوں بیان کی ہے کہ جس کی شان میں قصیدہ کہہ دیا وہ نہ جیا۔ جس کی مدح میں ایک سے زیادہ قصیدے کہہ دیے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ رشید حسن خاں کی تحقیق کی شہرت بھی کچھ اسی قسم کی ہے جس علمی تحقیقی منصوبے پر تبصرہ کرتے ہیں، اس کا بستر لپٹ جاتا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کا منصوبہ بنا۔ جب پہلی جلد شائع ہوئی تو رشید حسن خاں نے اس پر تبصرہ کر ڈالا اور اپنے زورِ تحقیق سے اس میں اتنی غلطیاں دریافت کیں کہ وہ پورا کام ہی اہلِ علم کی نظروں سے گر گیا۔ یونیورسٹی نے وہ جلد واپس لے لی۔ بس پھر وہ منصوبہ ہی لپیٹ دیا گیا۔

ویسے تو انھوں نے جمیل جالبی کی 'تاریخِ ادبِ اردو' کی پہلی جلد پر بھی زبردست تحقیقی حملہ کیا تھا مگر جمیل جالبی وار سہہ گئے البتہ ڈاکٹر ابواللیث کی نگرانی میں ترقی اردو بورڈ کراچی کے زیرِ اہتمام لغت کی جو جلدیں شائع ہوئیں ان پر رشید حسن خاں کی تحقیق بھاری پڑی۔ سنا ہے کہ ان کے تبصرے کی روشنی میں بورڈ کے طریقِ کار کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

کراچی میں یارانِ طریقت اِن کے اِس طریقۂ واردات پر تبصرہ کر رہے تھے، میں نے خاں صاحب سے کہا کہ آپ ایسا تحقیقی وار کیوں کرتے ہیں کہ اُس پر تخریبی تحقیق کا گمان ہونے لگتا ہے۔ خاں صاحب کہنے لگے کہ میرے خیال میں تو آج کل ہونے والے تحقیقی کاموں کی ایسی جانچ پرکھ بہت ضروری ہے۔

میں نے فوراً ان سے اتفاق کرلیا اور ٹکڑا لگایا کہ گرانٹ لینے والے ادارے جس طرح سے علمی منصوبے چلاتے ہیں ان پر ایسی تحقیق تعمیری تحقیق کی حیثیت رکھتی ہے۔

رشید حسن خاں کا کہنا یہ تھا کہ ان سے پہلے افراد ایسے کام انجام دیا کرتے تھے، پچھلی لغات دیکھیے، ہر لغت اور تاریخِ ادب ایک فردِ واحد کا کارنامہ ہے مگر اب ایسے کاموں کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ ہر کسی فرد کے لیے تنِ تنہا ایسا کام انجام دینا ممکن نہیں رہا۔ اب ایسے کاموں کے لیے بورڈ بنائے جاتے ہیں مگر ہمارے یہاں مل کر کام کرنے کا تجربہ ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔ ہمارے یہاں اہلِ علم مل کر کسی علمی منصوبے پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرسکے ہیں۔

پرانی اردو نثر کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ محمد حسن عسکری نے 'طلسم ہوش ربا' کا انتخاب کرکے بہت زیادتی کی ہے۔ میں نے پوچھا زیادتی کیسے ہوگئی۔ کہنے لگے 'طلسمِ ہوش ربا' کو تو کوئی پڑھتا نہیں۔ اس انتخاب کو پڑھ کر یار لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے 'طلسمِ ہوش ربا' پڑھ لی اور پھر اس کتاب پر محاکمے کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ فکشن کے اس دھوندل کاٹ کارنامے کو نہ پڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تو ہے کہ وہ دستیاب ہی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں تو کوئی ناشر کوئی گرانٹ پانے والا ادارہ اس کارِ خیر کو انجام دینے کے لیے تیار نہیں ہے، آپ کے یہاں کیا صورت ہے؟

رشید حسن خاں نے بتایا کہ اس کتاب کو شائع کرنے کا ایک منصوبہ تو بنایا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ دیکھیے رشید حسن خاں صاحب، تحقیق برحق، مگر کرنے والا کافر۔ وہ اس طرح سے کہ محقق حضرات توازن اور مدارج کے تو قائل ہی نہیں ہوتے۔ کوئی مخطوطہ ان کے ہاتھ پڑ جائے تو تحریر ادبی اعتبار سے وقیع نہ ہو مگر محقق اس پر اس شان سے بحث کرتا ہے کہ مجموعۂ کلام ہو تو دیوانِ غالب کے ہم پلّہ نظر آتا ہے۔ نثر ہو تو 'باغ و بہار' سے ٹکر لیتی دکھائی دیتی ہے۔

رشید حسن خاں گرم ہوکر بولے کہ آپ نے کسی تھرڈ کلاس محقق کی تحقیق پڑھی ہوگی۔ اچھا محقق کبھی یہ طور اختیار نہیں کرتا۔

لیجیے بات ہی ختم ہوگئی، میں نے اپنے طور پر طے کرلیا ہے کہ جو محقق ایسا طور اختیار کرتا ہے اس کا نام کتنا ہی بڑا ہو اُسے تھرڈ کلاس محقق سمجھوں گا۔

رشید حسن خاں ناسخ کے بہت بڑے وکیل ہیں، میں نے کہا کہ دیکھیے مجھے ناسخ کی

شاعری سے تو کچھ لینا نہیں۔ مجھے تو اس بزرگ پر یہ غصہ ہے کہ اس نے زبان کی صفائی کے نام پر اردو کو بہت سے لہجوں اور لفظوں سے محروم کردیا۔

رشید حسن خاں کہتے ہیں کہ ناسخ کو بلاوجہ بدنام کیا گیا ہے۔ انھوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ اُن کے بعض شاگردوں نے ان کا نام لے کر یہ تحریک چلائی تھی۔ خاص طور پر اس کے ایک شاگرد نے جس کا نام اوسط علی تھا۔

رشید حسن خاں سے باتیں تو اور بھی کرنی تھیں لیکن وہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ لاہور کو بس چھوا اور گزر گئے۔ بھاگتے دوڑتے ان سے ایک ڈیڑھ بات ہوئی۔

❖❖❖

خلیق انجم

ممتاز محقق اور متنی نقاد: رشید حسن خاں

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف تو بہت سے اہلِ علم نے کیا ہے لیکن اردو زبان و ادب کی ترقی و فروغ کے لیے انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اس کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی ہے۔ خواجہ صاحب کی زندگی کا ہر لمحہ اسی فکر میں گزرتا تھا کہ اردو زبان کی بقا، ترقی اور فروغ کے لیے وہ اور کیا کریں۔ اس سلسلے میں ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے دلّی یونیورسٹی میں اس زمانے میں شعبۂ اردو قائم کرایا جب اردو کا نام لینے والوں اور اردو کی ترقی کے خواہاں حضرات پر اچھے خاصے سنجیدہ لوگ بھی پاکستانی ہونے کا الزام لگاتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اس الزام کی کوئی فکر نہیں کی اور دن رات اردو کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے۔ جب وہ دہلی کالج میں ایک استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے تو دہلی یونیورسٹی میں عربی، فارسی اور اردو کا مشترکہ شعبہ تھا۔ خواجہ صاحب نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے کام لے کر وائس چانسلر کو اپنے حق میں کرلیا۔ نیز مجھے، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور دوسرے حضرات کو اپنے ساتھ اس کام میں لگایا۔ ہمارا کام یہ تھا کہ خواجہ صاحب کے خطوط لے کر مختلف اراکینِ پارلیمنٹ اور اس وقت کی مرکزی حکومت کے ذمہ داروں کے پاس لے کر جاتے۔ خواجہ صاحب ایک عظیم مقصد کے لیے کام کررہے تھے اس لیے انھیں ڈاک پر زیادہ بھروسہ نہیں تھا، متعلقہ حضرات کو خطوط بھیجتے تھے تو وہ ڈاک سے نہیں بلکہ ہمارے ہاتھ بھیجتے تھے۔ خواجہ صاحب کے خلوص، لگن اور زبان و ادب سے بے پناہ محبت اور کچھ کردکھانے کے جذبے سے ہی دہلی یونیورسٹی میں اردو کا ایک الگ شعبہ قائم ہوا۔ شعبہ قائم ہوتے ہی خواجہ صاحب نے اردو ادب کی ترقی کے لیے طرح طرح کے پروگرام بنائے مثلاً انھوں نے اردو - ہندی لغت کا ایک پروجیکٹ شروع کیا جس میں

ہمارے اس عہد کے بہت بڑے عالم اور فارسی داں مولانا ضیاء احمد بدایونی کا تقرر کیا، اس خیال سے کہ لغت میں اغلاط نہ رہ جائیں۔ خواجہ صاحب نے ہندی کے دو بڑے اسکالرز کو بھی اس پروجیکٹ میں شامل کرلیا۔ اس اردو ہندی لغت پر خاصا کام ہو چکا تھا کہ خواجہ صاحب ریٹائر ہوگئے اور یہ کام ہمیشہ کے لیے رُک گیا۔ انھوں نے اردو کے کلاسیکی ادب کی ترتیب و تدوین کے لیے بھی ایک پروجیکٹ شروع کیا۔ اس پروجیکٹ کے لیے انھیں ایک ایسے اسکالر کی ضرورت تھی جس میں تحقیقی کام کی صلاحیت اور جو اس پروجیکٹ کو صحیح طرح سے چلا سکے۔ اسی زمانے کی بات ہے، ایک دن خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا: ''آپ رشید حسن خاں صاحب کو جانتے ہیں۔ آپ نے ان کی کون سی تحریریں پڑھی ہیں''۔ میں نے کہا کتاب تو ابھی تک غالباً ان کی کوئی چھپی نہیں ہے لیکن ان کے چند مضامین شائع ہوئے ہیں اور ان کے وہ مضامین قابلِ ذکر ہیں جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے 'اردو ادب' میں شائع ہوئے ہیں۔

خواجہ صاحب نے دریافت کیا کہ ان کی کون سی تحریر آپ کو پسند آئی، میں نے کچھ مضامین کے نام بتائے اور عرض کیا کہ وہ دراصل اس میدان کے آدمی ہیں جس کی الف ب سے بھی میں واقف نہیں ہوں، یعنی عروض و قواعد۔ خواجہ صاحب نے پھر پوچھا آپ نے ان کا کوئی مضمون تو پڑھا ہوگا؟ عرض کیا کہ میں نے ان کا مقالہ 'ملائی بالائی' پڑھا ہے لیکن یہ پتھر اتنا بھاری تھا کہ میں نے اٹھا کر رکھ دیا۔ خواجہ صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی: ''خواجہ صاحب بہت کم ہنستے یا مسکراتے تھے''۔

کہنے لگے وہ ایک عالم آدمی ہیں۔ آپ کو ان کے تمام مضامین پڑھنے چاہئیں۔ میں خواجہ صاحب کے سنجیدہ لب و لہجے سے خائف ہوگیا اور بہت ہی سنجیدگی سے عرض کیا دراصل وہ جن موضوعات پر لکھتے ہیں ان میں میری دلچسپی نہیں ہے۔ میرے اس جواب سے خواجہ صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گیا۔ کہنے لگے کوئی اور یہ بات کہتا تو مجھے برا نہ لگتا، مگر آپ کا یہ کہنا مجھے پسند نہیں آیا، آپ ان چند لوگوں میں ہیں جن کے مستقبل سے مجھے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ میں خاموش ہوگیا اور جب خواجہ صاحب کے پاس سے آیا تو لائبریری جا کر رسالوں میں رشید حسن خاں کے جو دو چار مضامین ملے وہ پڑھ ڈالے۔ دراصل مجھے خوف تھا کہ جب بھی خواجہ صاحب سے ملاقات ہوگی وہ ان مضامین کے بارے میں ضرور پوچھیں گے۔

میں نے جو خاں صاحب کے مضامین پڑھے، وہ میرے بہت کم سمجھ میں آئے لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آگیا کہ خاں صاحب بہت عالم آدمی ہیں نیز میں اس موضوع پر خواجہ صاحب سے بات کرنے کے قابل ہوگیا۔ ایک دو ہفتے بعد خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے رشید حسن خاں کے مضامین کا ذکر کیا۔ میں نے اپنی معلومات بڑھا چڑھا کر اس طرح پیش کیں کہ خواجہ صاحب خاصے مطمئن ہوگئے۔

کچھ دن بعد میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز یونیورسٹی کے کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے، میں نے دیکھا کہ ہمارے محترم استاد پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ایک خوش شکل اور لباس کے اعتبار سے خوش سلیقہ نوجوان کے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوئے۔ ظہیر صاحب اس نوجوان کو لے کر ہماری میز پر آگئے۔ تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ رشید حسن خاں صاحب ہیں اور ہمارے شعبۂ اردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا ہے۔ دعا سلام کے بعد جب رشید حسن خاں صاحب بیٹھ گئے تو ظہیر صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ انھیں جانتے ہیں، میں نے بتایا کہ خوب جانتا ہوں بلکہ میں تو ان کا زبردست مداح ہوں اور میں نے ان کے سارے مضامین پڑھے ہیں۔ خواجہ صاحب کے خوف سے میں نے خاں صاحب کے مضامین پڑھ کر جو معلومات حاصل کی تھیں وہ ایک ہی سانس میں اُگل دیں۔ رشید حسن خاں صاحب مجھ سے متاثر ہوگئے اور اس دن سے میری ان کی ایسی دوستی شروع ہوئی کہ مرتے دم تک ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکتے رہے۔

اس مختصر سی ملاقات میں مَیں نے خاں صاحب کا دل جیت لیا۔ اگر چہ میں نے اُن کے مضامین پڑھے تھے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ لکھتے کیا ہیں، لیکن دہلی والا ہونے کی وجہ سے گفتگو کے فن پر قدرت حاصل تھی اور بات خاں صاحب سے اس طرح کی کہ خاں صاحب سمجھے کہ واقعی میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔ اُس دن سے لے کر اُن کی وفات تک خاں صاحب سے میرے تعلقات ہمیشہ انتہائی خوشگوار رہے۔ میرے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ انتہائی مخلصانہ رہا۔

اُن کے تقرر کے کچھ ہی دن بعد میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ کی دکان پر بیٹھے تھے۔ اس دکان کی ادبی اہمیت یہ تھی کہ وہاں بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر آتے تھے اور ہم جیسے نوجوانوں کی ایک تربیت گاہ بھی یہی دکان تھی۔ یہیں ایک دن میں نے خاں صاحب کو دیکھا، انھیں گوپال متّل یہاں لے کر آئے تھے۔ گوپال متّل اُن

دنوں 'تحریک' کے اڈیٹر تھے اور انھیں ہر وقت اہلِ علم حضرات کی ضرورت رہتی تھی۔ کسی محفل میں مثل صاحب کی ملاقات رشید حسن خاں صاحب سے ہوگئی اور پھر اُن کے دوستانہ مراسم ہمیشہ کے لیے قائم ہوگئے۔ خاں صاحب نے گوپال مثل صاحب کے ماہنامہ 'تحریک' میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ چوں کہ قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی سے خاں صاحب کے تعلقات بہت اچھے تھے اس لیے انھوں نے اپنے تعلقات کا استعمال کر کے اُن سے مضامین منگوائے جو 'تحریک' میں شائع ہوئے۔

میں ذکر کر رہا تھا مولانا سمیع اللہ کی دکان کا۔ وہاں ممتاز شاعر اور ادیب جمع ہوتے اور پھر چنڈو خانہ چلے جاتے۔ چنڈو خانہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک ایسا ریستوراں تھا جہاں ادیب اور شاعر شام کو اکٹھا ہوتے تھے۔ بعض وجوہ سے شاعروں نے اس چائے خانے کا نام چنڈو خانہ رکھ دیا تھا۔ حالاں کہ اس کا اصل نام تھا Friends Tea Stall اور ظہیر نام کے ایک صاحب اس کے مالک تھے۔ شروع شروع میں تو ظہیر صاحب اپنے ریستوراں کا نام چنڈو خانہ سن کر بھڑک اٹھتے لیکن آہستہ آہستہ اتنے عادی ہوگئے کہ خود بھی اسے چنڈو خانہ کہنے لگے۔

رشید حسن خاں صاحب نے اپنی نسل میں خود سے کم عمر لوگوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اُن میں غالباً ڈاکٹر اسلم پرویز اور میں سرِ فہرست تھے۔ خاں صاحب سے دنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔ ادبی، سیاسی اور سماجی مسائل پر گفتگو کرتے اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ خاں صاحب جو بالکل روایتی قسم کے محقق تھے، اپنے عہد کے مسائل سے کیسے واقف ہیں؟

اگر چہ ان کی تعلیم دینی مدارس میں ہوئی تھی جہاں استاد اور شاگرد دونوں روایت کے خول میں بند ہوتے ہیں لیکن خاں صاحب بہت زیادہ آزاد فکر، روشن خیال اور دور اندیش انسان تھے۔ وہ انگریزی اور اردو کے اخبارات بڑی پابندی سے پڑھ کر سیاسی حالات کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتے۔ اگر چنڈو خانے میں سیاست پر گفتگو ہوتی تو خاں صاحب اپنی رائے مدلل طریقے سے اس طرح پیش کرتے کہ دوسرے لوگوں کو کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہتی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں خاں صاحب کی ابتدائی زندگی کے کچھ حالات بیان کردوں۔ شاہجہانپور میں ایک صاحب تھے امیر حسن خاں، یہ خاں صاحب کے والد تھے۔ تعلیمی اسناد کے مطابق خاں صاحب ۱۰ر جنوری ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے مگر انھوں نے ہمیں بتایا

تھا کہ اُن کی تاریخِ ولادت میں سنہ غلط لکھا گیا ہے، یہ سنہ ۱۹۳۰ء نہیں، ۱۹۲۵ء تھا۔

خاں صاحب نے شاہجہانپور کے مشہور عربی مدرسے بحرالعلوم میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۹ء تک اس مدرسے میں تعلیم پاتے رہے لیکن گھر کے مالی حالات کچھ ایسے خراب ہوئے کہ انھیں تعلیم ترک کر کے ملازمت کرنی پڑی۔ انھوں نے شاہجہانپور میں قائم آرڈی ننس کلورنگ فیکٹری میں بہت ہی معمولی مشاہرے پر ملازمت کر لی۔ یہاں مزدوروں کا بڑے پیمانے پر استحصال کیا جاتا تھا۔ خاں صاحب نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر مزدوروں کی ایک یونین قائم کی، اس یونین کے جلسے میلاد شریف یا کیرتن کے بہانے فیکٹری کے ملازمین کے گھروں پر ہوتے اور پھر کچھ عرصے بعد یونین کی باقاعدہ سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ چند سال بعد یونین نے اس فیکٹری میں ہڑتال کر دی جو اپنی نوعیت کی پہلی ہڑتال تھی۔ اس ہڑتال کے محرکوں میں خاں صاحب بھی تھے۔ وہ اس وقت یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اس ہڑتال سے ناراض ہو کر فیکٹری کے ذمے داران نے کچھ مزدوروں کو برطرف کر دیا۔ چوں کہ خاں صاحب ہڑتال میں پیش پیش تھے اس لیے انھیں بھی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

خاں صاحب نے بحرالعلوم میں عربی کا جو علم حاصل کیا تھا وہ کام آیا اور خاں صاحب مدرسہ فیضِ عام میں عربی اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے ملازم رکھ لیے گئے۔

خاں صاحب پر الزام تھا کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔ ایک خدائی فوجدار مولوی صاحب نے شہر کی بڑی مسجد میں اپنے خطبے میں یہ اعلان کیا کہ جو شخص بے دینوں کے ساتھ رہتا ہے اور خود بھی بے دین ہے، اُسے اس مدرسے میں ملازمت نہیں ملنی چاہیے۔ مدرسے میں خاں صاحب کے کچھ ہمدرد بھی تھے، اُن کی وجہ سے خاں صاحب کو ملازمت سے تو نکالا نہیں گیا لیکن بڑی کلاسیں لے کر انھیں چھوٹے بچوں کو پڑھانے کا کام سونپ دیا گیا۔ اس کے بعد خاں صاحب اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول میں ملازم ہو گئے اور یہیں انھوں نے عروض اور قواعد پر کچھ مضامین لکھے، جن کی وجہ سے خواجہ احمد فاروقی کی اُن پر نظرِ انتخاب پڑی اور خواجہ صاحب انھیں دہلی یونیورسٹی کے اردو شعبے میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر لے آئے۔

یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سامنے ایک عمارت تھی جس کا نام تھا ٹیوٹوریل بلڈنگ۔ اس میں خاں صاحب کو ایک کشادہ کمرہ ملا، کمرے میں چند الماریاں تھیں جن میں اُن کی

کتابیں رکھی رہتی تھیں۔

رشید حسن خاں محقق ضرور تھے لیکن خشک آدمی نہیں تھے۔ اُن کی گل افشانی اس وقت ہوتی تھی جب صرف وہ دو چار لوگ موجود ہوتے جن سے بقول خود اُن کے 'اُن کی پٹری بیٹھتی تھی'۔ یعنی جو لوگ ان کے مزاج شناس تھے۔ ایسے موقعے پر خاں صاحب دل چسپ لطیفے سناتے اور دوسروں کے لطیفوں پر دل کھول کر قہقہے لگاتے۔ یہاں یہ بات بتانی ضروری ہے کہ خاں صاحب عام محفلوں میں بہت سنجیدہ رہتے، اگر کسی کی کوئی دل چسپ بات پسند آتی تو بس اُن کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی۔

خاں صاحب بعض محققوں سے بہت خوش تھے اور بعض کو وہ بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ جنھیں وہ پسند نہیں کرتے تھے ان میں عرصے تک مالک رام صاحب بھی شامل رہے۔ ایک واقعہ سنیے: ایک دفعہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں غالبؔ پر سمینار ہو رہا تھا۔ مالک رام صاحب نے مقالہ پڑھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ لیکن رشید حسن خاں صاحب نے کھڑے ہو کر دو تین اعتراضات کر دیے۔ مالک رام صاحب کو یہ بات ناگوار گزری، ہال کے برابر سکریٹری کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، مالک رام اٹھ کر اُس کمرے میں چلے گئے۔ میں ان کے پیچھے گیا انھیں پانی پلایا اور لٹا دیا۔ جب انھوں نے آنکھیں بند کرلیں اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ سو گئے ہیں تو میں سمینار ہال میں واپس آگیا۔ تھوڑی دیر میں مالک رام صاحب زور سے چیخے 'خلیق انجم'! میں بھاگا ہوا گیا، میں نے دیکھا کہ اُن کی حالت خاصی خراب ہے۔ انھیں دل کی شکایت تھی اور میں نے اکثر انھیں شیروانی کے اوپر کی جیب سے ایک شیشی نکال کر دوا کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک دفعہ میرے پوچھنے پر مالک رام صاحب نے بتایا تھا کہ وہ دوا 'سیبوٹاٹ' ہے، انھیں جب دل کی شکایت ہوتی ہے تو وہ آدھی گولی زبان کے نیچے رکھ لیتے ہیں۔ میں نے فوراً ہی ان کی جیب سے وہ شیشی نکالی، ایک ٹیبلٹ کو رومال میں رکھ کر توڑا اور آدھی گولی ان کی زبان کے نیچے رکھ دی، دس پندرہ منٹ میں انھیں سکون ہوگیا اور کار میں بٹھا کر میں انھیں ان کے گھر چھوڑ آیا۔

خاں صاحب میرے ساتھ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ میں نے غالبؔ کے خطوط مرتب کر کے اشاعت کے لیے غالب انسٹی ٹیوٹ کو پیش کیے۔ جب یہ مسودہ ادبی کمیٹی میں پہنچا تو ایک صاحب جو بظاہر میرے بڑے کرم فرما تھے لیکن اندر ہی اندر میرے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے، اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ انھوں نے میرے مسودے

کی طباعت کے خلاف ایک بہت لمبی تقریر کی، رشید حسن خاں بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے، انھیں ان صاحب کی باتیں ناگوار گزریں۔ جب وہ میرے خلاف اپنی پوری بات کہہ چکے تو رشید حسن خاں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، مجھے اس سے بالکل اتفاق ہے لیکن میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیا آپ نے پورا مسودہ دیکھ لیا ہے؟ انھوں نے کہا جی ہاں بالکل۔ خاں صاحب نے پوچھا کہ خلیق انجم کے اس مرتبہ اڈیشن میں غالبؔ کے خطوط کی کل تعداد کیا ہے۔ خلیق صاحب نے یہ خطوط کہاں کہاں سے لیے ہیں۔ کیا خلیق انجم نے ان خطوط پر مقدمہ بھی لکھا ہے، وغیرہ۔ وہ صاحب ان سوالوں کا کوئی جواب نہ دے سکے اور ہکلا کر کہنے لگے میں نے یہ مسودہ شروع سے آخر تک پڑھا ہے۔ خاں صاحب نے کہا کہ اور لوگ مانیں یا نہ مانیں میں آپ کو ولی اللہ مانتا ہوں کیوں کہ خلیق انجم صاحب نے یہ مسودہ کل صبح انسٹی ٹیوٹ میں داخل کیا تھا اور یہ مسودہ انسٹی ٹیوٹ سے باہر کہیں نہیں گیا، حیرت ہے کہ آپ نے پورا مسودہ پڑھ لیا۔ خاں صاحب کو غصہ کم آتا تھا اور جب آتا تھا تو وہ اپنے دل کی پوری بات کہے بغیر نہ رہتے تھے۔ انھوں نے ان صاحب سے کہا کہ کھایئے قسم کہ آپ کو اس مسودے کے خلاف خلیق انجم صاحب کے سب سے بڑے دشمن فلاں صاحب نے بہکایا تھا۔ خاں صاحب کے غصے اور اندازِ گفتگو سے وہ صاحب ڈر گئے۔ پروفیسر نذیر احمد نے کہا کہ کمیٹی یہ مسودہ رشید حسن خاں صاحب کو دیتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ وہ اسے پڑھ کر اپنی رائے دیں۔ جیسا کہ مجھے امید تھی کہ خاں صاحب نے کچھ دن بعد میرے حق میں رائے دی اور غالب کے خطوط کی پانچوں جلدیں غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوئیں۔

خاں صاحب بہت کم گو اور کم آمیز تھے۔ صرف ان ہی سے ملتے جن سے ان کا مزاج ملتا تھا اور ایسے لوگ بہت کم تھے۔ خاں صاحب سازشوں سے دامن بچاتے تھے اور یونیورسٹیوں کے شعبوں میں سازشوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا، اس لیے خاں صاحب کی زندگی ایک گوشہ گیر فقیر کی سی تھی۔ ہاں، خاں صاحب کو جو لوگ بہت زیادہ پسند تھے وہ تھے ایسے ریسرچ اسکالر جو سنجیدگی سے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ خاں صاحب ان کی ہر ممکن مدد کرتے۔ کتابوں کے حوالے دیتے، مسائل پیش کرتے، ادیب یا شاعر کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے وغیرہ وغیرہ۔ خاں صاحب کو ریسرچ اسکالرز سے اس حد تک قربت حاصل ہوگئی تھی کہ ان کے بارے میں بعض دشمنوں نے یہ مشہور کر دیا کہ دو چار

اسکالر کے تحقیقی مقالے اُن ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ایک نوجوان خاتون کو خاں صاحب سے بہت قربت حاصل تھی، اُن کے بارے میں کچھ سنجیدہ حضرات کو بھی یہی یقین تھا کہ اس خاتون کا پی ایچ ڈی کا مقالہ خاں صاحب کا لکھا ہوا ہے۔

خاں صاحب کی زندگی کے حالات اگر لکھنے بیٹھوں تو سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہوں گے۔ یہاں میں صرف خاں صاحب کی علمی خدمات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز عروض اور قواعد پر مضامین لکھ کر کیا، جو اُس زمانے کے مقتدر ادبی رسالوں اور خاص طور سے انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے 'اردو ادب' میں شائع ہوئے۔ خاں صاحب نے زبان اور قواعد پر بہت کچھ لکھا بلکہ اس موضوع پر ایک عالمانہ کتاب بھی لکھی۔ چوں کہ خاں صاحب کا موضوع زبان تھا، اس لیے ان کی کتابیں 'اردو املا'، 'زبان اور قواعد'، 'انشا اور تلفظ' وغیرہ بہت اہم کتابیں ہیں۔ انھوں نے بڑوں ہی کے لیے نہیں نوجوانوں اور چھوٹوں کے لیے بھی کئی کتابیں لکھیں مثلاً 'اردو کیسے لکھیں'، 'عبارت کیسے لکھیں' وغیرہ۔

خاں صاحب تحقیق کرتے کرتے تدوین کے میدان میں بھی آگئے۔ انھوں نے متنی تنقید کے بنیادی مسائل پر اہم کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس میدان میں ان کی پہلی کتاب 'فسانۂ عجائب' ہے جس کی طباعت میں میرا بھی دخل تھا اور انجمن ترقی اردو (ہند) نے اس عالمانہ کام کو شائع کیا تھا۔ اس کے بعد خاں صاحب نے 'باغ و بہار'، 'مثنوی گلزارِ نسیم'، 'مثنوی سحرالبیان' اور 'مثنویاتِ شوق' جیسی اہم کلاسیکل ادب کی کتابوں کے تنقیدی اڈیشن تیار کیے اور یہ سب مولوی عبدالحق سیریز کے تحت انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ خاں صاحب نے 'انتخابِ ناسخ'، 'انتخابِ سودا'، 'انتخابِ شبلی'، 'انتخابِ نظیر اکبرآبادی' اور 'انتخابِ مراثی انیس و دبیر' وغیرہ بھی مرتب کر کے شائع کیے۔

خاں صاحب کے جو تنقیدی اڈیشن انجمن سے شائع ہوئے ہیں وہ سب خاں صاحب نے میری درخواست پر تیار کیے تھے۔ اس سلسلے کی دو کتابیں اور ہیں 'مصطلحاتِ ٹھگی' اور 'زٹل نامہ'۔ انجمن بعض وجوہ سے یہ کتابیں شائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ سے 'مصطلحاتِ ٹھگی' کا ذکر کیا، انھوں نے ادبی کمیٹی سے اس کتاب کے لیے فوراً مالی تعاون منظور کرا دیا تو پھر میں نے خاں صاحب کی کتاب 'زٹل نامہ' کے لیے بھی بھٹ صاحب سے مالی تعاون حاصل کیا۔

میں بھٹ صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست قبول کر لی۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے مالی تعاون سے یہ کتابیں بھی شائع ہو گئیں۔

آج کل خاں صاحب 'گنجینۂ معنی کا طلسم' نام سے ایک کتاب تیار کر رہے تھے۔ 'گنجینۂ معنی کا طلسم' ایک قسم کی 'دیوانِ غالب' کی فرہنگ ہے، اس میں خاں صاحب نے بتایا ہے کہ غالبؔ نے کون سا لفظ کہاں پر اور کس شعر میں استعمال کیا ہے۔ اب تک اس کتاب کے ساڑھے آٹھ سو صفحات کمپوز ہو چکے ہیں اور ابھی اس کا کافی حصہ باقی ہے۔ میں خاں صاحب کے صاحبزادوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ باقی مسودہ بھی دے دیں، مگر انجمن کی ایک مشکل یہ ہے کہ کمپوزنگ خاں صاحب نے پڑھی تھی کیوں کہ وہ کسی اور کی پروف ریڈنگ سے کبھی مطمئن نہیں تھے۔ اب جو صفحات کمپوز ہوں گے انھیں کون پڑھے گا اور اگر پڑھے گا تو خاں صاحب کا علم کہاں سے لائے گا۔ پھر بھی میری کوشش ہے کہ یہ کتاب ضرور چھپ جائے اور انشاءاللہ ضرور چھپے گی۔

ایک دفعہ میں نے علامہ اقبالؔ سمینار کے لیے ایک مقالہ لکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اقبالؔ کا اردو کلیات ابھی تک صحیح طریقے سے مرتّب نہیں ہوا اور ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی عالم اور متنی نقاد اسے ترتیب دے۔ میں نے رشید حسن خاں صاحب سے درخواست کی۔ میں مرحوم کا شکر گزار ہوں کہ انھیں یہ کام پسند آیا اور انھوں نے کہا کہ میں رفیع الدین ہاشمی صاحب کو بھی تیار کر لوں تاکہ وہ دونوں مل کر یہ کام کر سکیں۔ رفیع الدین ہاشمی صاحب سے درخواست کی، انھوں نے بخوشی میری درخواست قبول کر لی۔ ابھی یہ کام ہو ہی رہا تھا، میں خاں صاحب کو اس سلسلے میں مواد فراہم کر رہا تھا اور رفیع الدین ہاشمی صاحب بھی خاں صاحب سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے اور دونوں یہ کام کر رہے تھے کہ ۲۶ رفروری ۲۰۰۶ء کو خاں صاحب خدا کو پیارے ہو گئے۔

○○○

تنویر احمد علوی

رشید حسن خاں — ایک منفرد محقق

پچھلی ربع صدی کے دوران ادبی تحقیق اور تحقیقی انتقادیات کے سلسلے میں چند اہم نام ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں رشید حسن خاں کا نام بہ وجوہ بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

رشید حسن خاں نے اگر چہ بعض اہم تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں لیکن بیشتر انھوں نے اپنے مختص علمی میلانات کے زیر اثر قلم اٹھایا ہے اور اپنے تحقیقی مطالعے کے لیے کچھ مخصوص موضوعات کو منتخب کر لیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے علمی نقطہ نظر اور طریق عیارگری کے مطابق کسی دوسرے درجے پر آ کر لکھنا نہیں چاہتے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے کم لکھا ہے۔

اردو املا رشید حسن خاں کے یہاں تحقیق و تجسیس کا خاص موضوع رہا ہے۔ ان کا زاویۂ نگاہ بہت وقیع ہے۔ جو مسائل و مباحث گزشتہ ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت میں سامنے آئے ہیں، رشید حسن خاں نے ان کا مطالعہ گہری نظر اور غیر معمولی دل چسپی کے ساتھ کیا ہے۔

اردو املا کی طرح زبان و قواعد کے مسائل بھی رشید حسن خاں کے لیے خصوصی توجہ اور علمی تحقیق و تجسیس کے مستحق رہے ہیں۔ اردو کی صفوں میں ایسے قابل استناد افراد اب کم ہوتے جا رہے ہیں جو ان مسائل سے پوری واقفیت اور کما حقہ دل چسپی رکھتے ہوں اور ان پر اظہارِ خیال کے بجا طور پر اہل ہوں۔ رشید حسن خاں نے ان پیچیدہ اور سلسلہ در سلسلہ مسائل پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور خلاصۂ بحث کے طور پر اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ اردو زبان میں لفظوں کی تراش خراش اور صورت گری کے عمل کی کسوٹی 'رواج عام' ہے اور اسی کو سند و برہان ماننا چاہیے۔

اس ضمن میں ان کے یہاں جو اہتمام تلاش جزئیات ملتا ہے، وہ زبان وقواعد کے مطالعے میں ان کی غیر معمولی تحقیق وتجسس کی نشان دہی کے لیے کافی ہے۔

رشید حسن خاں کا خاص موضوع ادبی تحقیق ہے۔ اپنی کتاب 'ادبی تحقیق' میں انھوں نے اپنے تحقیقی مطالعے کے فکری نتائج اور ان سے استنباط کردہ اصول ونظریات کو پیش کیا ہے۔ رشید حسن خاں کے مضامین کا مجموعہ جو کتابی شکل میں سامنے آیا ہے، اردو زبان کی تحقیق وادبیات میں بلا شبہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اسی کتاب میں وہ مضامین موجود ہیں جنھوں نے ہمیں 'چونکایا' ہے اور اس کا بار بار احساس دلایا ہے کہ تحقیق کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

رشید حسن خاں نے اس موضوع پر اپنی گفتگو بلکہ گفتگوؤں میں بار بار اس پر زور دیا ہے کہ تحقیق، تنقید سے الگ ہے اور تنقیدی تعبیرات سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ بات وہ غیر مبہم اور واشگاف لہجے میں اس لیے کہنا چاہتے ہیں کہ آج کل دانش گاہوں میں 'ریسرچ' کے نام پر ہر طرح ادبی کارگزاریوں کو 'تحقیق' کے دائرے میں داخل کر لیا گیا ہے اور جس نوعیت کا کام اس عنوان سے کیا جا رہا ہے، وہ تحقیق اور تنقید دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے اور اس سے خلط مبحث کے لیے بڑی گنجائشیں پیدا ہو گئی ہیں۔

تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

> ''ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بطورِ واقعہ اس صورت میں متعین ہوگا جب اصولِ تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات حاصل ہوں۔
>
> واقعے کا چھوٹا یا بڑا ہونا، اہم یا غیر اہم ہونا ادبی تحقیق میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ صفاتی الفاظ صرف اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اس واقعے سے کام لیا جا رہا ہے۔
>
> تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حجابات بتدریج اُٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک کی حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سے آیندہ کے امکانات کی نفی نہیں ہوتی لیکن محض آیندہ امکانات پر ان باتوں کو بطورِ واقعہ نہیں مانا جا سکتا جو اس وقت تک محض

قیاس آرائی کا کرشمہ ہوں۔"

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، ص 9)

اس ایک گونہ تفصیلی اظہارِ رائے کے ساتھ آخر جملے تک پہنچتے پہنچتے یہ بحث ایک نئے موضوعِ فکر ونظر سے جاملتی ہے اور وہ یہ کہ تحقیق کو صرف واضح شہادت اور استخراجی نتائج تک محدود سمجھنا چاہیے۔ استقرائی سطح پر اخذِ نتائج اور استنباط، اس سے الگ 'دیدودریافت' کا ایک عمل ہے جس کے دائرے میں تنقیدی فکر وفہم اور تعبیرات کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ رشید حسن خاں نے اس پہلو سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تعبیرات کو واقعات نہیں کہا جاسکتا اور تحقیق کا مقصود حقائق کی دریافت ہے۔ اس لیے ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل دخل ہو، تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ تنقیدی صداقت تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلے پر دو مختلف افراد دو مختلف رائیں رکھ سکتے ہیں جب کہ تحقیق میں اس طرح کے اختلاف کی گنجائش نہیں۔"

رشید حسن خاں کے نقطۂ نظر میں جو قطعیت ہے، اس کا تعلق تحقیق کی اس تعریف سے ہے جس میں واقعہ اور واقعیت کا تعین ان بدیہی شواہد اور استخراجی نتائج کے تحت کیا جاتا ہے جس کے بارے میں اختلافِ رائے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس سے آگے اور الگ جو طریق رسائی موجود ہے اور جن وسائل تفہیم کا سہارا لیا جاتا ہے ان کو غیر علمی تو نہیں کہا جاسکتا لیکن ان پر تحقیق اور تحقیقی طریق رسائی کا اطلاق بھی ممکن نہیں۔

اپنے نقطۂ نظر کی منطقی حدود میں زور دینے کے باوصف رشید حسن خاں کی نظر سے یہ نکتہ چھپا نہیں ہے کہ سادہ تحقیق کو خواہ اس کی بنیاد کتنے ہی منجمد اور ٹھوس حقائق پر ہو، اس وقت تک پُرمعنی اور نتیجہ خیز نہیں کہا جاسکتا جب تک کہ دوسرے حقائق اور مضمر سچائیوں سے اس کی معنویت کا رشتہ نہ قائم ہو جائے۔ ادبی صداقتوں کے ضمن میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ رشید حسن خاں جہاں اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ حقائق اور شواہد کا تعین تحقیق ہی کو کرنا چاہیے، وہاں انھوں نے اس سچائی کو بھی بغیر کسی تذبذب فی الرائے کے پیش کر دیا ہے کہ:

"تحقیق میں اعداد وشمار اور مطلق حقائق کا تعین بنیادی چیز ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ یہ اس کا ابتدائی حصہ ہے، بے حد ضروری لیکن اہم کام یہ

بھی ہے کہ جن حقائق کا تعین کیا گیا ہے، دیکھا جائے کہ ان سے کیا نتائج نکلتے ہیں اور ان سے علم وآگہی میں کس نوعیت کا اضافہ ہوتا ہے۔''

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، ص 103)

ظاہر ہے کہ علمی حقائق کے 'استنادی تعین' اور بازیافت کے 'مبنی بر حقائق' عمل کے بغیر اگر معنی آفرینی اور قیاس آرائی کی جائے گی تو وہ تعبیرات کا آرٹ تو ضرور ہوگا لیکن اس نوع کی رسائی فکر اور ذہنی اختراع کو 'سندِ اعتبار' سے محروم تصور کیا جائے گا۔ اس لیے رشید حسن خاں کا یہ خیال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ:

''اب سے پہلے اس بات کا یقین دلانا مشکل تھا کہ تحقیق کے فراہم کیے ہوئے مواد، اس سے نکالے ہوئے نتائج اور اس سے متعین کیے ہوئے حقائق کو سامنے رکھنا تنقید نگار کے لیے لازم ہوگا اور اس کے بغیر کچھ کہا جائے گا تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ حقائق اور شواہد کا تعین تحقیق ہی کرے گی اور ناقد کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ان کو ملحوظ رکھے۔''

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، ص 100)

تنقیدی فکر وفہم اگر علمی طریق رسائی اور حقائق وشواہد کے صحیح تعین سے دور نہ جا پڑے تو وہ بھی نکتہ رسی، حقیقت شناسی ومعنی بینی کا ایک بڑا وسیلہ ہے مگر اس کے وہی فیصلے درخورِ اعتنا اور قابلِ اعتبار ہوں گے جو استخراجی نتائج پر مبنی ہوں۔ محض استقرائی مفروضات کا کرشمہ نہ ہوں۔

رشید حسن خاں اپنے فیصلوں میں کسی نوع کی لچک یا دورنگی خارج از بحث خیال کرتے ہیں۔ وہ صرف اس رائے کو مانتے ہیں اور منوانا چاہتے ہیں جس کی استنادی حیثیت مسلّم ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ 'ریسرچ' اپنی حدود کا تعین کرے اور اس سے آگے نہ جائے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے:

''یہاں پر یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ معروضی حقائق یا شواہد کا تعین کر دیتا ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں کرتا تو یہ بھی بجائے خود اہم ہے۔ ایک دوسرا شخص جو استخراجِ نتائج کی زیادہ اچھی صلاحیت رکھتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا کر دوسرے رخ کی تکمیل کرے گا۔ کبھی کبھی صلاحیتوں کی کمی بیشی کا فرق بھی بعض ناتمامیوں کا باعث ہوا کرتا ہے۔''

اس روشن اور شفاف اندازِ نظر کی مزید صراحت اس بیان میں سامنے آئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ خود رشید حسن خاں کے یہاں تنقید اور تحقیق میں کوئی تضاد کا رشتہ نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو تعامل اور تکمیل کا رشتہ ہے۔ انھوں نے اس بحث میں آگے چل کر یہ کہا ہے:

''استخراجِ نتائج کی طرف توجہ زیادہ مبذول ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سماجی اور سیاسی واقعات کے اثرات کی نشان دہی کی طرف بھی توجہ کی گئی اور سمجھا گیا کہ کسی مصنف کے ساتھ تنقیدی سطح پر انصاف کرنے کے لیے صرف اس کے ذاتی حالات سے واقفیت کافی نہیں، وہ جس زمانے میں تھا اور اس کے گرد و پیش جو حالات چھائے ہوئے تھے اور وہ حالات جن خاص اسباب کا نتیجہ تھے ان کا بھی جائزہ لیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے خالص تحقیقی انداز سے سارے واقعات کا بالکل صحیح صحیح تعین کیا جائے۔ پھر تحقیق کی روشنی میں خالص منطقی انداز سے نتائج نکالے جائیں۔''

تحقیقی اندازِ نظر کے ساتھ واقعات کا تعین جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اردو میں تحقیقی رسائل کا فقدان تو نہیں ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ ایسے بہت سے وسائل منتشر ہیں اور ان کی وضاحتی فہرستیں بھی بیشتر صورتوں میں دستیاب نہیں۔ نئے مآخذ اور نو دریافت وسائل تک رسائی بہت سے افراد کے لیے یوں بھی ایک کارِ مشکل ہے۔ خاص طور پر ان کے لیے جو راہ تحقیق میں اول اول قدم رکھتے ہیں، تن آسانی محنت سے اعراض اور ذہنی کاہلی کی بات الگ رہی۔ تحقیقی تربیت کے لیے رہنما کتابوں کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے۔

علاوہ بریں عام حالات میں جن مصادر تک پہنچنا ممکن ہے، صدق روایت اور صحت متن کے لحاظ سے ان پر بھی اعتماد مشکل ہے۔ جن مآخذ میں ادبی تحقیق میں بھروسا کیا جا سکتا ہے اور جنھیں بالعموم درجۂ استناد دیا جا رہا ہے، وہ متنوع قلمی مآخذ بالخصوص تذکرے اور بیاضیں ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ بھی بہت سی صورتوں میں سند و برہان کے کام نہیں آسکتیں اور یہ مسئلہ خود رشید حسن خاں نے اٹھایا ہے۔

اصولیاتِ تحقیق کے سلسلے میں رشید حسن خاں کا ایک اہم کارنامہ (جسے فی الجملہ ان کی اولیات میں شمار کیا جانا چاہیے) تذکروں اور بیاضوں پر ان کی تحقیقی گفتگو ہے جس میں انھوں نے ان مآخذ کی استنادی حیثیت پر 'شک' کا اظہار کیا۔ اور اس مسئلے کو پہلی بار اہل علم

اور اربابِ تحقیق کے سامنے رکھا ہے۔

اپنے مقالہ تحقیق سے متعلق بعض مسائل میں انھوں نے اس طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:

''بیشتر مطبوعہ تذکروں کے متن پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر مطبوعہ تذکرے اس قدر غلط چھپے ہیں یا ان میں ایسی غلطیاں راہ پا گئی ہیں کہ ان کا از سر نو مرتب کیا جانا ضروری ہے۔ ان میں وہ تذکرے بھی شامل ہیں جن کو ایک زمانے میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا اور وہ بھی جو اس زمانے میں بعض معروف حضرات کے مقدموں کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں احتیاط کا تقاضا یہ ہوگا کہ امکان کی حد تک تذکروں کے اہم خطی نسخوں سے بھی استفادہ کیا جائے۔ بعض مطبوعہ تذکروں کے جو خطی نسخے اب ملے ہیں، ان میں ایسے اضافے ہیں جن سے مطبوعہ تذکرے خالی ہیں۔

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، ص45)

تذکروں پر یہ گفتگو ان اعتراضات سے بہ مراتب مختلف ہے جو گارساں دتاسی سے لے کر تا زمانۂ حال لیے جاتے رہے ہیں۔ یہاں تذکروں کی روایتی خامیوں کا ذکر نہیں، ان کی استنادی حیثیت کے تعین کا سوال ہے، جو ذہن کو ایک نئی سمت سفر دیتا ہے۔

انھوں نے بیاضوں کے حوالوں کو بھی مشکوک حوالوں کے ذیل میں رکھا ہے اور ان پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پرانی بیاضوں کا اچھا خاصا ذخیرہ مختلف کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں محفوظ ہے۔ بیاض مرتب کرنے کا کوئی مقررہ طریقہ نہیں تھا۔ کسی مجموعے یا کسی دوسری بیاض سے بھی کلام نقل کیا جا سکتا تھا اور مختلف لوگوں کی زبان سے سن کر بھی شامل بیاض کیا جا سکتا تھا۔ اس میں صحت انتساب کی حیثیت ثانوی ہوا کرتی تھی، اصل چیز ہوتی تھی ذاتی پسندیدگی۔ ایسے مجموعوں کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے مندرجات عمومی طور پر صحت متن اور صحت انتسا کے لحاظ سے تصدیق کے محتاج رہیں گے......

ایسی مجہول الاحوال بیاضوں سے استفادہ خاص طور پر احتیاط کا طلب گار رہے گا۔''

بات بالکل صحیح ہے۔ صحتِ روایت، صحت انتساب اور صحت متن مسئلہ تحقیقی نقطہ نظر سے کلیدی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس بحث کو اگر پھیلایا جائے تو بیشتر قلمی مآخذ اس کے دائرے میں آجائیں گے اور زیادہ صحیح طریق رسائی وہی ہوگا کہ معتبر، غیر معتبر اور مشکوک کا فیصلہ کرنے میں احتیاط برتی جائے جس کے لیے رشید حسن خاں نے کہا ہے:

''روز ناموں اور بیاضوں کے اندراجات ہوں یا اس قسم کے دوسرے ذرائع، ان مطالعہ تو ضرور کرنا چاہیے، مگر بطور حوالہ ان کو قبول کرنے میں احتیاط اور زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔''

ایک اور اہم مسئلے پر رشید حسن خاں نے خصوصیت سے توجہ دلائی ہے، وہ اساسی مآخذ کے تراجم ہیں جو بدرجۂ مجبوری اساسی مآخذ کے ذیل میں آتے ہیں اور جن سے متعدد مواقع پر استفادہ ایک ناگزیر صورت ہوتا ہے:

''اردو میں تحقیقی کام کرنے والوں کو جن مآخذ سے استفادہ کرنا پڑتا ہے، ان میں بیشتر فارسی میں ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی کتابوں خاص طور پر تذکروں کا اردو میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ اس کا جواب بہت صاف اور واضح ہے کہ ترجمے کو اصل مآخذ کی حیثیت سے نہ پیش کیا جا سکتا ہے نہ کیا جانا چاہیے۔''

ظاہر ہے اس معاملے میں اصولی حیثیت سے دو رائیں نہیں ہو سکتیں لیکن اس سلسلے کی فنی دشواریاں ایسی بھی نہیں جنھیں ناقابلِ التفات قرار دیا جائے۔

رشید حسن خاں کے یہاں جو تحقیقی اندازِ نظر ملتا ہے وہ کافی دنوں سے احتساب کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یوں بھی اردو میں تحقیقی روایت نمایاں حیثیت سے 'دو اہم مکاتب فکر' میں منقسم نظر آتی ہے، ایک روایت ہے جس کے تحقیقی کارناموں کی امتیازی شکل میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ڈاکٹر گیان چند جیسے محققین کے ممتاز کارناموں میں ملتی ہے۔ یہ حضرات کسی دوسرے کام میں اعتراض یا احتساب کو اس وقت تک ضروری نہیں سمجھتے جب تک مقطع میں سخن گسترانہ بات نہ آپڑے۔ ان کا مطمحِ نظر اپنے ذاتی کاموں میں خوب سے خوب تر کی تلاش ہے اور بس۔

دوسری روایت جو اس کے مقابلے میں آئی ہے، تحقیقی انتقاد کی وہ صورت ہے جس میں علمی کاموں کے تحقیقی جائزے اور 'احتساب' کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ تاکہ غلطیوں کو فروغ پانے کا موقع نہ ملے اور تحقیقی کام کرنے والے اپنی علمی ذمہ داریوں کو فراموش نہ کریں۔ پروفیسر شیرانی اور قاضی عبدالودود جیسے اکابرین اسی دوسری روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ رشید حسن خاں کا تعلق بھی اسی روایت سے ہے۔ وہ بھی علمی احتساب اور تحقیقی عیاز گیری کو ایک ناگزیر تقاضا خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

''ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ صفائی اور زیادہ شدت کے ساتھ احتساب کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور اس پر عمل بھی کیا گیا ...... اس لحاظ سے گویا تحقیق نے شیرانی صاحب کی روایت کو پھر سے زندہ کیا جنھوں نے سب سے پہلے تحقیق کی سچائی کو ساری وضع داریوں، مروتوں، مصلحتوں اور سخن گسترانہ اسالیب سے الگ رکھنے کی کوشش پر زور دیا تھا۔ اس زمانے میں قاضی عبدالودود نے اس کو پھر سے اور زیادہ اہتمام کے ساتھ زندگی نوبخشی۔''

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، ص 7-106)

اس سے رشید حسن خاں کا تحقیقی مسلک واضح ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس کو اپناتے ہوئے ساری وضع داریوں، مروتوں اور مصلحتوں سے اپنے ناقدانہ رویّے کو الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سب سے بہتر مثالیں ان تحقیقی تبصروں میں سامنے آتی ہیں جو 'علی گڑھ تاریخِ ادب اردو'، 'دیوانِ غالب' مرتبہ مالک رام اور 'تاریخ ادب اردو' مولفہ جمیل جالبی پر کیے گئے ہیں۔ ان تبصروں نے پڑھنے والوں کو متوجہ کیا اور لکھنے والوں کو متنبہ کیا ہے اور تحقیقی نگارشوں میں احتیاط کے کیا معنی ہیں اس کی طرف بہت سے لوگوں کی نظر گئی ہے۔

تحقیق میں غلط فہمیوں اور غلط نگاریوں کی روک تھام ضروری ہے۔ اگر ہر طرح کے جذباتی رویوں اور غیر علمی فیصلوں کو برداشت کر لیا جائے تو راہ علم رفتہ رفتہ کانٹوں سے بھر جائے گی اور سہل نگاری عشق و عقیدت اور تنافر و تعصب کے تحت روایتی معلومات اور مزعومات کا انبار بڑھتا چلا جائے گا۔ جس طرح تنقید اچھے برے کی پرکھ اور ادب کی اقدار شناسی کے لیے ضروری ہے اسی طرح حقائق کی چھان بین کے لیے تحقیقی تجزیہ ایک ناگزیر صورت ہے جس کے بغیر معروضی سچائیوں کا تعین ممکن نہیں۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ 'زبان و قواعد' اور 'اردو املا' جیسی کتابوں میں (جو یقیناً رشید حسن خاں کے وقیع علمی کارناموں میں سے ہیں) جو اندازِ نگارش ملتا ہے، اس کے مختارات بحث و تحریر میں شروع سے آخر تک وہی سنجیدہ اسلوب کارفرما ہے جس کی توقع وہ ایک محقق سے کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ میں ان کا رویہ نمایاں طور پر بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا آغاز بگمان غالب علی گڑھ تاریخ ادب اردو پر ان کے تاریخی تبصرے سے ہوتا ہے۔

تحقیق اور اخلاقیات تحقیق کے ضمن میں جو مضامین انھوں نے لکھے ہیں، ان کی افادیت و اہمیت میں کلام کی گنجائش نہیں۔ ان مضامین کا اثر تحقیقی انداز پر مرتب کی جانے والی کتابوں سے بھی کچھ زیادہ ہوا ہے لیکن جگہ جگہ ان کی زبان تحقیقی اندازِ بیان کے سادہ سنجیدہ دائرے سے باہر آ گئی ہے۔ اس سے گفتگو کا لطف بڑھ گیا ہے۔ چبھتے ہوئے فقرے یوں بھی زیادہ یاد رہ جاتے ہیں اور گرمیِ محفل کے کام آتے ہیں۔ یہاں ایسے بعض فقرے نقل کیے جاتے ہیں جو قوس و قزح کے نیم وا دائرے کی طرح زبان و بیان کے کچھ شوخ رنگوں کو تو واضح کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ ایک محقق کی زبان کی سطح سے کچھ الگ بھی ہیں:

> ''حالات کے زیرِ اثر تحقیق کو دانش گاہوں میں پناہ گزیں ہونا پڑا ہے۔
> جب کہیں پناہ گزینوں کا سیلاب آتا ہے تو شہری زندگی میں بہت سے پریشان کن مسائل پیدا ہو جاتے ہیں''۔

> ''یہ ایسے عوامل ہیں کہ ان کا پھیلایا ہوا غبارِ زندگی میں ابہام کا دھندلکا پھیلائے رکھتا ہے''۔

> ''ایسے اداروں کا جو پنچایتی کام اب تک سامنے آیا ہے وہ معیار کے اعتبار سے مایوس کن ہے''۔

> ''اکثر سینئر اساتذہ کمیٹیوں کے ممبر بننے اور ترقی کے جتن کرنے میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کے فالتو کاموں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ (ان کا) طالب علم حیران و پریشان ادھر اُدھر مدد کی بھیک مانگتا پھرتا ہے''۔

> ''ممتحنین کی طرف سے مقالے کے رد کیے جانے کا خطرہ یوں نہیں کہ دریا میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر کون رکھ سکتا ہے''۔

''مشکل یہ ہوئی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف سے قطع تعلق بھی نہیں کرسکتا چوں کہ ابھی 'اوراق جمشیدی' کی مدد سے تو وہ اپنا 'طلسم ہوش رُبا' سجائے ہوئے ہے''۔

''علمی اور تحقیقی کارنامے اس طرح وجود میں نہیں آتے کہ کاتا اور لے دوڑی''۔

رشید حسن خاں کے یہاں اس نوع کے فقروں اور جملوں کی اہمیت اساسی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ اس لیے کہ ان کی زبان مجلسی اور صحافتی نہیں۔ وہ ایک محقق ہیں اور ایک محقق کی طرح اندازِ بیان کی قطعیت کے قائل ہیں۔ وہ جس طرح مطالعے میں 'ارتکاز' کو ضروری خیال کرتے ہیں اسی طرح اپنی تحریروں میں بھی وہ ارتکاز پر زور دیتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی نگارشات میں نظریاتی تنوع سے بھی اجتناب برتتے ہیں اور تنقیدی خیال آرائیوں سے بھی اب تقریباً دست کش ہو چکے ہیں۔

اردو زبان 1947 کے بعد پچھلی ایک ثلث صدی میں جس ابتلائی دور سے گزری ہے اب وہ اس کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے اور اس کے اثرات کو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ اس دور میں اردو تحقیق نے نمایاں حیثیت سے قدم آگے بڑھایا ہے۔ رشید حسن خاں نے تحقیق کے آداب اور اس کے ضابطوں کے بارے میں جو مضامین سپردِ قلم کیے ان میں معتبر، غیر معتبر اور مشکوک حوالوں کی بحث اٹھا کر اردو تحقیق میں ایک نئے فکر خیز باب کا اضافہ کیا ہے۔

○○○

پروفیسر حنیف نقوی

رشید حسن خاں اور آدابِ تاریخ نگاری

اردو میں ادبی تحقیق کو جن لوگوں کی بدولت آبرومندانہ مقام حاصل ہوا ہے، ان میں رشید حسن خاں کا نام ایک روشن چراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قاضی عبدالودود کے بعد وہ دوسرے شخص ہیں جنھوں نے اوہام و مفروضات کے ہر بت کو توڑنے اور ہر حقیقت کو واشگاف انداز میں بیان کرنے کا فریضہ کسی تامل اور تکلف کے بغیر پوری جرأت مندی اور راست بازی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اپنی اس شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے پچھلی چند دہائیوں میں مختلف موضوعات پر جس قدر اور جس پائے کا کام کر کے عملی کارکردگی کی جو قابلِ رشک مثال قائم کی ہے وہ ایک منفرد اور لائقِ تحسین امتیاز ہے۔ اگر اس نکتے کو ملحوظ رکھ کر گفتگو کی جائے کہ کسی انسان یا اس کے کسی کارنامے کا نقائص سے کلیتاً جدا ہونا ناممکنات سے ہے تو یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ تحقیق اور بالخصوص تدوینِ متن کے میدان میں فی الوقت کوئی ان کا حریف نہیں۔

خاں صاحب کی تصانیف میں خواہ وہ درسی نوعیت کے انتخابات ہی کیوں نہ ہوں، کوئی کتاب ایسی نہ ملے گی جو ان کی محنتِ شاقہ اور ژرف نگاہی و نکتہ رسی کی شاہد نہ ہو، لیکن تحقیق کے نظری و عملی دونوں پہلوؤں کی جامع تفہیم کے نقطۂ نظر سے 'ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ' کو ان کتابوں میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب نو مختلف مضامین اور تبصروں کا مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۷۸ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۰ء میں اُتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ نے اس کا دوسرا اڈیشن شائع کیا جو علمی حلقوں میں اس کتاب کی مقبولیت اور پذیرائی کا بیّن ثبوت ہے۔ ترتیبِ مضامین کے اعتبار سے یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مندرجہ ذیل پانچ مضامین شامل ہیں:

(۱) کچھ اصول تحقیق کے بارے میں (۲) غیر معتبر حوالے (۳) تحقیق سے متعلق بعض مسائل (۴) تدوین اور تحقیق کے رجحانات (۵) حوالہ اور صحتِ متن۔

دوسرا حصہ بہ تفصیل ذیل چار تبصروں پر مشتمل ہے:

(۱) دیوان غالبؔ صدی اڈیشن (۲) اُردو شاعری کا انتخاب (۳) علی گڑھ تاریخ ادب اُردو (۴) تاریخ ادب اُردو۔

ہماری موجودہ گفتگو اسی دوسرے حصے کے آخری دو مضامین سے متعلق ہے۔ ان میں سے پہلا مضمون 'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' خاں صاحب کی وہ معرکہ آرا تحریر ہے جس کی اشاعت کے ساتھ علمی حلقوں میں ان کے تبحرِ علم، وسعتِ نظر اور جرأتِ گفتار کی دھاک اس طرح قائم ہوئی کہ تن آسان مصنفوں اور سہل پسند محققوں کے لیے ان کا نام ضربِ کلیمی کی علامت بن گیا۔ اس مضمون سے جہاں ایک طرف اس کتاب کی خامیاں نمایاں ہوکر سامنے آئیں وہیں ان اصول و آداب کا تعین بھی ہوا جنھیں ملحوظ رکھے بغیر ادبی تاریخ نگاری کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے کے دوسرے مضمون میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی 'تاریخِ ادبِ اردو' جلدِ اول کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس تبصرے میں بھی موضوع کے دونوں پہلو یعنی کتاب کے مشتملات اور تاریخ نویسی کے مقتضیات پوری شرح و بسط کے ساتھ زیرِ بحث آئے ہیں۔ 'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' ماہرین کے ایک بورڈ کی اجتماعی کوششوں کا ثمرہ تھی جب کہ موخر الذکر کتاب شخصِ واحد کی انفرادی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس اعتبار سے ان دونوں تبصروں کی روشنی میں بہ آسانی ان رموز و نکات کا احاطہ کیا جاسکتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر تاریخ نویسی کے بنیادی لوازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تاریخ نویسی کے سلسلے میں خاں صاحب کا بنیادی موقف یہ ہے کہ ''تاریخ ادب کی ہو یا زبان کی، جدید معیار و انداز کے باعث اس کی ترتیب سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونا بہ ظاہر کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں'' (طبع اول، ص ۲۵۸)۔ اپنی موضوعی وسعت اور بوقلمونی کی بنا پر یہ کام تقسیم کار کے اصول کے تحت اجتماعی طور سے زیادہ بہتر طریقے پر انجام دیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس طرح مختلف ماہرین ادبیات کو اپنے اختصاص کے پیشِ نظر کسی خاص موضوع، مخصوص دور کے ساتھ انصاف کے پورے مواقع حاصل ہوتے ہیں، لیکن خاں صاحب کے بقول ''یہ کام یورپ میں تو کیا جاسکتا ہے کیوں کہ وہاں اچھے علمی کام کرنے والے بددیانتی کو جائز نہیں سمجھتے، شاگردوں سے اور اپنے مجبور ماتحتوں سے بیگار

نہیں لیتے اور وہاں اڈیٹر کی بہت بڑی حیثیت ہوتی ہے'' (ص ۲۵۹)۔ اس کے برخلاف ہمارے یہاں ذمہ داریوں کی تقسیم کے معاملے میں اہلیت و لیاقت سے زیادہ مراتب و مناصب کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور دوسروں سے کام کرا کے اسے اپنے نام سے شائع کرانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی، اس لیے اجتماعی سطح پر پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی کوئی روایت قائم نہیں ہو پاتی ہے۔

اجتماعی نوعیت کے کام کے سلسلے میں سب سے اہم ذمہ داری مرتّب اڈیٹر کی ہوتی ہے، جسے کتاب کے مختلف ابواب کے درمیان تناسب اور ربط و ہم آہنگی برقرار رکھنے کا فریضہ انجام دینا پڑتا ہے اور یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ ایک ہی واقعے سے متعلق دو مقالہ نگاروں کے بیانات میں کوئی تضاد یا اختلاف نہ ہو۔ 'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' کی نمایاں ترین خامی یہ ہے کہ اس میں ان پہلوؤں پر مطلقاً توجہ نہیں دی گئی ہے۔ چناں چہ اس کا پہلا ہی باب 'سیاسی اور تمدنی پس منظر'، 'بیشتر غیر متعلق باتوں پر مشتمل ہے'۔ نتیجہ یہ ہے کہ ''پورا باب پڑھنے کے بعد بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ (اردو) زبان و ادب کے آغاز و ارتقا پر ان حالات کا کیا اثر پڑا'' جو اس کے تحت بیان کیے گئے ہیں (ص ۲۶۰)۔

دو مقالہ نگاروں کے بیانات میں تضاد و اختلاف کو دور کرنے کی طرف بھی کسی توجہ کا دور دور تک سراغ نہیں ملتا۔ فاضل تبصرہ نگار کے الفاظ میں ''اگر اس میں دو مقالہ نگاروں نے کسی واقعے کا ذکر کیا ہے یا کوئی سنہ لکھا ہے تو اکثر مقامات پر دونوں نے مختلف سنہ لکھے ہیں اور متضاد باتیں کہی ہیں اور اگر اتفاق سے کسی تیسرے مضمون نگار نے بھی وہی بات لکھی ہے تو اس نے ان دونوں سے مختلف سنہ درج کیا ہے۔ یہی نہیں، ایک ہی مضمون نگار نے ایک ہی واقعے کے دو مختلف سنہ بھی لکھے ہیں'' (ص ۲۶۱)۔ اس سلسلے میں تضاد بیان کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک مثال امیر خسروؔ کی بھی ہے جن کے متعلق ایک مقالہ نگار کا قول ہے کہ ان سے پہلے شمالی ہند میں کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا ہے جسے ہم اردو شاعر کہہ سکیں جب کہ ایک دوسرے مقالہ نگار کے مطابق ''ان کے ہندی کلام کی کوئی سند اب تک دستیاب نہیں ہو سکی ہے'' (ص ۲۸۱)۔

تاریخ نویسی کے مبادیات میں سے ایک بنیادی نکتہ یہ بھی ہے کہ تاریخ زبان اور تاریخ ادب دونوں کو باہم مخلوط نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دونوں دو مستقل بالذات موضوع ہیں۔ اس سلسلے میں خاں صاحب نے اپنا موقف واضح فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ ''زبان اور ادب

کا باہمی تعلق ہے لیکن تاریخ نگاری کے لیے زبان اور ادب بجائے خود دو مستقل موضوع ہیں اور دونوں کے تقاضے مختلف ہیں۔ زبان کی تاریخ لکھنے والے کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ لسانیات سے کماحقہٗ واقف ہو، اردو کی تاریخ لکھنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان اہم مقامی زبانوں سے بھی ضروری واقفیت رکھتا ہو، جن کے اجزا سے زبان کا ڈھانچا بنا ہے۔ لسانیات اور مقامی زبانوں سے واقفیت کے بغیر زبان کی بحث قیاسات کا مجموعہ اور مفروضات کا جذبات کدہ بن کر رہ جائے گی'' (ص۲۹۳)۔

زبان اور ادب کی طرح تاریخ اور تنقید بھی دو علاحدہ علاحدہ موضوعات ہیں جن کے حدود کا لحاظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ''محاسنِ کلام کو سمجھنے اور بیان کرنے'' کا جو ملکہ رکھتے ہیں وہ خاں صاحب کے نزدیک قابلِ تحسین ہے۔ بطور مثال انھوں نے ''وَلی اور سراجؔ کی خصوصیات کو جس طرح بیان کیا ہے، اس سے ان کی تنقیدی بصیرت کے جوہر کھلتے ہیں''۔ لیکن یہ ایک دوسرا میدان ہے چناں چہ خاں صاحب کے الفاظ میں ان کے اس قسم کے ''تنقیدی بیانات بعض جگہ تاریخ نگاری کے پیمانے سے نکل گئے ہیں اور اس طول بیانی نے تاریخ نگاری کے دائرے کو نقصان پہنچایا ہے'' (ص۲۹۲)۔ اسی بنا پر ان کی یہ طے شدہ رائے ہے کہ ''تاریخِ ادب اور تنقیدِ ادب دو مستقل موضوعات ہیں، لامحالہ ان کے دائرے بھی الگ الگ ہوں گے اور طریقِ کار بھی مختلف ہوگا'' (ص۲۹۲)۔

تاریخِ ادب میں سب سے زیادہ اہمیت واقعات کے بیان کی ہوتی ہے۔ یہ بیان جس قدر معتبر و مستند ہوگا، تاریخ اپنے مقصد میں اسی قدر کامیاب ہوگی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی اہم بات ماخذ کے حوالے کے بغیر نہ کہی جائے۔ خاں صاحب کے بموجب ''تحقیق کے نقطۂ نظر سے ایسے کسی دعوے کو قبول نہیں کیا جاسکتا جو اس التزام سے عاری ہو۔ مثلاً امیر خسرو کے بارے میں ''علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو'' کے ایک مقالہ نگار کا قول ہے کہ انھوں نے ''موسیقی میں ہندی اور ایرانی سُروں کے میل سے طرح طرح کے راگ ایجاد کیے''۔ یہ دعویٰ اس اعتبار سے مہمل ہے کہ ''موسیقی میں خسرؔو کی ایجادات ہنوز بحث طلب اور محتاجِ ثبوت ہیں'' (ص۲۸۰)۔ اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی نے اورنگ زیب کے دورِ حکومت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس میں دور میں اردو زبان مدرسوں اور مکتبوں میں عام طور پر ذریعۂ تعلیم بن جاتی ہے''۔ خاں صاحب کو بجا طور پر اعتراض ہے کہ ''مولف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ اہم اطلاع انھیں کہاں سے ملی۔ حوالے کے بغیر اس دعوے

(بلکہ ادعا) کو قبول نہیں کیا جا سکتا'' (ص ۳۰۰)۔

ادبی مورخ پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ ثانوی یا موخر اور غیر معتبر ماخذ سے کام نہ لے اور ایسے حوالوں پر استفسار استدلال کی بنیاد نہ رکھے جو کمزور اور مشکوک ہوں۔ پروفیسر محمود شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' میں اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخِ ادب میں بڑی کثرت کے ساتھ مجہول الاحوال بیاضوں کے حوالے دیے ہیں۔ خاں صاحب کے نزدیک ان حضرات کا یہ عمل تحقیق سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، کیوں کہ جب تک کسی بیاض کے بارے میں پورے وثوق سے یہ نہ معلوم ہو کہ اس کا مرتّب کون ہے، وہ کس زمانے میں مرتّب ہوئی ہے اور اس کے مندرجات کس حد تک معتبر ہیں، اس کے حوالے سے کوئی بات کہنا اصولی طور پر درست نہیں (ص ۳۰۴)۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے اس دعوے کی تائید میں کہ صوفیاے کرام نے اپنا پیغام، عوام تک پہنچانے کے لیے یہاں کی مقامی زبانوں سے کام لیا، 'فرہنگ آصفیہ' جلد اول کے مقدمے کے حوالے سے شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کا ایک دوہا پیش کیا ہے اور ناتھ پنتھیوں کی تصانیف میں مستعمل زبان کے نمونے کے طور پر 'ہندی ادب کی تاریخ' مولف ڈاکٹر محمد حسن کے حوالے سے دو شعر نقل کیے ہیں۔ اسی کتاب سے انھوں نے اپ بھرنش کا ایک دوہا بھی نقل کیا ہے۔ چوں کہ بوعلی شاہ قلندر کی وفات اور 'فرہنگِ آصفیہ' کی تالیف میں چھ سو سال سے زیادہ کا فرق ہے اور ڈاکٹر محمد حسن اردو کے اہلِ قلم ہیں، اس لیے یہ دونوں حوالے موخر یا ثانوی حوالوں کے ذیل میں آتے ہیں، جنھیں بناے استدلال نہیں بنایا جا سکتا۔ خاں صاحب کے بقول اگر ''مولف بہ طورِ خود ہندی اور اپ بھرنش سے استفادہ نہیں کر سکتے ......تو پھر ان کو اس پھیر میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا اور اگر وہ ان زبانوں سے مناسب طور پر واقف ہیں تو پھر ان کو ثانوی مآخذ سے کام لینا چاہیے تھا'' (ص ۳۲۱)۔

بہت سے راویوں کے بارے میں یہ بات مسلّمہ حیثیت رکھتی ہے کہ وہ نقلِ روایت میں محتاط نہیں اور زیبِ داستاں کی خاطر صحتِ بیان و صداقتِ واقعہ کو نظر انداز کر دینے میں تامّل نہیں کرتے۔ ادبی مورخ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے غیر معتبر راویوں کی تصانیف یا اقوال سے استناد کے معاملے میں حد درجہ احتیاط اور تنقیح و تفحص سے کام لے اور جب تک دوسرے ذرائع سے ان کے کسی بیان کی تائید نہ ہو، اس پر کسی دعوے کی بنیاد نہ رکھے۔ فاضل محقق نے اس سلسلے میں حکیم شمس اللہ قادری، نواب نصیر حسین خیالؔ اور صفیر

بلگرامی کی مثالیں دے کر یہ وضاحت کی ہے کہ ''ان لوگوں نے اپنی کتابوں میں ہر طرح کی روایتیں جمع کر دی ہیں'' جن میں ''حوالے اور سند کا کوئی جھگڑا ہی نہیں''۔ تاریخ ادب کے مولف کا اس قسم کی کسی روایت کو قبول کر کے اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا بناء الفاسد علی الفاسد کے مصداق ہوگا (ص ص ۳۲۲،۳۲۳)۔

واقعات کے بیان میں سنین کا التزام ایک لازمی جز کی حیثیت رکھتا ہے۔ تحقیق کے نقطۂ نظر سے یہ التزام اسی صورت میں مفید ہوسکتا ہے جب کہ ہر سنہ کے ساتھ اس کے ماخذ کا حوالہ بھی موجود ہو۔ بصورتِ دیگر ایسے تمام مندرجات لازماً قابلِ قبول نہ ہوں گے''۔ حوالوں کی اس پابندی کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ اس صورت میں خاں صاحب کے بقول'' لکھنے والا مجبور ہوتا ہے کہ معتبر ترین ماخذ سے کام لے اور اگر کسی سنہ میں کسی طرح کا اختلاف ہے تو پہلے اس کی وضاحت کرے کہ اس نے اس سنہ کو کس بنا پر مرجح سمجھا ہے'' (ص ص ۲۹۶، ۲۹۷)۔

سنین کے اندراج کے سلسلے میں سنہ ہجری اور سنہ عیسوی کی مطابقت کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس معاملے میں بھی خاصی احتیاط اور باریک بینی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عام طور پر مصنفین اس کا لحاظ نہیں رکھتے۔ 'علی گڑھ تاریخِ ادب' اردو' میں اس سلسلے میں عام طور پر 'بے اعتنائی' اور کم احتیاطی کا جو انداز کارفرما نظر آتا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے خاں صاحب نے لکھا ہے:

> ''کتاب میں بیشتر مقامات پر سنہ ہجری و عیسوی دونوں کو درج کیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں ایک نہایت اہم بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس کے سبب سے اس کی افادیت ختم ہونے کے ساتھ ساتھ غلط فہمی کی بڑی گنجائش نکل آئی ہے۔ یہ مسلّمات میں سے ہے کہ جب تک تاریخ اور مہینے کا تعین نہ ہو اس وقت تک یہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں سنہ ہجری مطابق ہے فلاں سنہ عیسوی کے یا اس کے برعکس تاریخ و ماہ نہ معلوم ہونے کی صورت میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اگر سنہ ہجری کے مقابل سنہ عیسوی درج کیا جائے تو اگر اس سنہ ہجری کے کسی بھی مہینے سے کوئی دوسرا سنہ عیسوی شروع ہوجاتا ہے تو وہ دونوں سنہ عیسوی درج کیے جائیں اس کے بغیر کبھی صحیح تعین نہیں ہوسکتا۔ مقالہ نگاروں نے اس

کی پابندی ضروری نہیں سمجھی ہے۔ اس بے پروائی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تقریباً ایسے سارے مقامات پر تعین کو صحیح نہیں کہا جا سکتا'' (ص ۲۶۸)۔

سنین کے سلسلے میں تیسری اہم ضرورت خاں صاحب کے بقول ''یکسانیت اور صراحت'' ہے۔ 'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' کا ایک نمایاں نقص یہ بھی ہے کہ اس میں ان لوازم کو بہت کم ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں ''ناموں کے آگے قوسین میں سنین درج ہیں۔ اس سلسلے میں کسی ایک قاعدے کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ کہیں یہ سنین سنہ ولادت و وفات کو ظاہر کرتے ہیں، کہیں زمانۂ حکومت کو، صراحت نہ یہاں ہے نہ وہاں'' (ص ۲۷۸)۔ گویا اس سلسلے میں بھی مولف یا مرتّب کو ایک اصول وضع کرنا چاہیے مثلاً افراد کے ناموں کے آگے صرف ان کی ولادت اور وفات کے سنہ اور کتابوں کے آگے ان کی طباعت کے سنہ درج کیے جائیں۔ ان کے علاوہ دوسرے اہم واقعات مثلاً سالِ جلوس، زمانۂ حکومت اور صرف پیدائش یا صرف وفات کے سنوں کے اندراج کی صورت میں ان کے لیے مخصوص علامات مقرر کر دی جائیں تا کہ پڑھنے والے کسی شک اور تذبذب میں مبتلا نہ ہوں۔

ادب کی تاریخیں طالب علموں کے استفادے اور عام شائقینِ ادب کے مطالعے کے لیے لکھی جاتی ہیں، اس لیے ان میں ایسے واقعات و بیانات کے شمول سے احتراز کرنا چاہیے جن سے ناپختہ ذہنوں کے مسموم ہونے یا عام لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کا امکان ہو۔ اختلافی مسائل اور متنازعہ فیہ امور سے بحث یا ایسے کسی نقطۂ نظر کی ترجمانی جو ایک مخصوص حلقے تک محدود ہو، تاریخ نگاری کے منصب کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ خاں صاحب کے الفاظ میں ''ایسی کتاب ...... جو کسی ایک نقطۂ نظر کے ماننے والوں کے لیے نہیں، سب کے لیے مرتّب کی گئی ہو، اس میں ان باتوں کا ذکر نہ ہونا چاہیے جو آج تک مختلف فیہ ہیں یا جن کی تعبیر کسی خاص اندازِ فکر کی روشنی میں کی گئی ہو'' (ص ۲۶۰)۔ 'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' کے ایک مقالہ نگار نے اس اصول کے برخلاف صوفیاے کرام کو 'خیرات خوار' اورنگ زیب کو 'دنیا کا بدترین حکمراں' اور اکبر کے دینِ الٰہی کو 'منشور انسانیت' قرار دے کر گویا اپنے حدود سے تجاوز کیا ہے، کیوں کہ اولاً تو ان باتوں کا اصل موضوع یعنی اردو زبان و ادب کے ارتقا سے کوئی تعلق نہیں، ثانیاً یہ ایک مخصوص گروہ کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں اور ادب کے عام طلبہ اور قارئین کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں۔

ایک ادبی مورخ کو بیانِ واقعات کے ضمن میں غیر ضروری طور پر کلیے قائم کرنے سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں خاں صاحب نے 'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' سے جو مثالیں پیش کی ہیں ان میں ایک مقالہ نگار کا یہ بیان بھی شامل ہے کہ ''تعجب انگیز بات یہ ہے کہ بابر ماہرِ جنگ ہونے کے باوجود ایک بلند سیرت اور تربیت یافتہ ذہن رکھتا تھا''۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''جو شخص ماہرِ جنگ ہوگا، وہ نہ بلند سیرت ہوگا نہ اس کا ذہن تربیت یافتہ ہوگا'' (ص ۲۷۳)۔ ظاہر ہے کہ یہ کلیہ کسی درجے میں بھی قابلِ قبول نہیں۔

خاں صاحب نے اس بات پر بھی بجا طور پر زور دیا ہے کہ تاریخِ ادب میں مصنفین و شعرا کے حالات کے تحت بغرضِ استدلال یا بطور نمونہ ان کی تحریروں کے جو اقتباسات یا کلام کے جو نمونے نقل کیے جائیں، وہ ہر اعتبار سے مستند و معتبر ہونا چاہئیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ضرورت یہ دیکھنے کی ہوتی ہے کہ جو تحریر یا جو کلام بطور نمونہ پیش کیا جارہا ہے، اس کا انتساب ہر اعتبار سے درست اور غیر مشکوک ہے۔ 'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ دونوں ہی کتابوں میں امیر خسرو، بابا فرید گنج شکر، امیر حسن حسن دہلوی اور پنڈت چندر بھان برہمن اور اسی قبیل کے بعض اور قدیم شاعروں کی اردو میں طبع آزمائی کے ثبوت میں جو غزلیں یا اشعار نقل کیے گئے ہیں ان کا ان شعرا سے انتساب حد درجہ مشکوک ہے۔ اس لیے انھیں بنائے استدلال بنا کر اخذ کیے ہوئے تمام نتائج خاں صاحب کے الفاظ میں ''محض مفروضات اور صرف قیاس آرائی'' کی حیثیت رکھتے ہیں (ص ۳۰۷)۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ پر خاں صاحب کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس کتاب میں ''نثر اور نظم کے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں ان کے ذیل میں یہ صراحت نہیں ملتی کہ صحت متن کے لحاظ سے کیا وہ واقعتاً قابلِ اعتماد ہیں، یعنی وہ متن درحقیقت ایسا ہے کہ اس سے قطعی طور پر استدلال کیا جاسکے؟ اکثر قدیم مخطوطات کے ایک سے زیادہ نسخے پائے جاتے ہیں اور صحتِ متن کے لحاظ سے وہ سب یکساں حیثیت نہیں رکھتے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولف نے جس نسخے سے کام لیا ہے، اس کو کس بنا پر قابلِ اعتماد سمجھا ہے'' (ص ص ۲۹۱،۲۹۲)۔

اس اعتراض میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ صحتِ انتساب کے تیقن کے بعد صحتِ متن کا تعیّن بھی تاریخ نگار کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ چناں چہ اگر کسی کتاب کے متعدد قلمی نسخے یا مختلف مطبوعہ اڈیشن دستیاب ہیں تو بلا تخصیص ان میں سے کسی ایک سے استفادہ بعض اوقات کسی غلط فیصلے یا اختلافِ رائے کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لیے ایسی صورتوں

میں مولف پر لازم ہوگا کہ وہ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس قلمی نسخے یا مطبوعہ اڈیشن کا انتخاب کرے جو ان میں سب سے زیادہ معتبر اور منشاے مصنف سے قریب تر ہو، اگر کسی تاریخ کے مختلف ابواب علاحدہ علاحدہ مصنفین نے لکھے ہوں اور ایک ہی کتاب کا کوئی اقتباس یا ایک ہی شعر ان میں سے دو یا دو سے زیادہ مصنفین نے نقل کیا ہو تو مرتب کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ اختلافِ متن کی صورت میں وہ ان میں سے مرجح صورت کو برقرار رکھے اور باقی مقامات پر مختلف فیہ متن کو اس کے مطابق درست کردے۔ 'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' میں اس قسم کے اختلافِ متن کی مثالیں جابجا موجود ہیں۔ انھیں پڑھ کر خاں صاحب کے بقول ''یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صحیح صورت کیا ہے (اور چوں کہ) یہ مسلّم ہے کہ ہر شخص کی رسائی اصل مآخذ تک نہیں ہو سکتی، اس لیے نتیجہ معلوم'' (ص ۲۶۷)۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ وقتی ضرورت کے تحت کسی سہل الحصول مآخذ سے کوئی شعر یا اقتباس نقل کر لیا جاتا ہے اور معاملے کی ثانوی یا سرسری نوعیت کی بنا پر اصل کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ خاں صاحب کے نزدیک یہ طریقہ بھی احتیاط کے خلاف اور آدابِ تحقیق کے منافی ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے ناصر علی سرہندی کے ذکر میں ان کے متعلق ولی کا ایک شعر نقل کیا ہے اور حوالہ دیا ہے 'آبِ حیات' کا۔ اس سلسلے میں خاں صاحب کا ارشاد ہے کہ ''اگر یہ شعر ولی کا ہے تو اسے 'دیوانِ ولی' میں موجود ہونا چاہیے۔ اگر وہاں موجود ہے تو پھر حوالہ بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ (بصورتِ موجودہ) یہ کیسے معلوم ہو (سکتا ہے) کہ یہ شعر واقعتاً ولی کا ہے اور ان کے دیوان میں موجود ہے اور اسی طرح ہے؟''

'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' میں ایسے اشعار بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کی صورت ''مضمون نگاروں کی بے احتیاطی'' اور ''پریس والوں کی کرم فرمائی'' کے سبب مسخ ہو کر کچھ سے کچھ ہوگئی ہے جب کہ ''بہت سے مصرعے صریحاً ساقط الوزن ہیں''۔ مثلاً نصرتی کے حالات میں ان کی تاریخِ وفات سے متعلق جو قطعہ منقول ہے اس کے چار مصرعوں میں سے دوسرا مصرع ناموزوں اور چوتھا مصرع محرف ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس آخری مصرعے سے مطلوبہ تاریخ برآمد نہیں ہوتی۔ اس قسم کی غلطیاں کسی بھی کتاب کے علمی معیار اور استفادی حیثیت کو مجروح کرنے کے لیے کافی سمجھی جاتی ہیں لیکن تاریخ ادب میں جو بنیادی طور پر حوالے کی کتاب کا کام دیتی ہے اور جس کا اولین مقصد عام قارئین اور طالب علموں کی رہنمائی ہوتا ہے ان کی موجودگی پڑھنے والوں کے لیے ''گم راہی کا خاصا

سروسامان'' فراہم کردیتی ہے (ص ۲۷۶)۔ اس لیے تاریخ نگار کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی کتاب کو حتی الوسع اس قسم کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے پاک رکھے۔

خاں صاحب نے مآخذ کے قابلِ اعتماد ہونے پر باربار زور دیا ہے۔ یہ اصرار اس لحاظ سے بالکل درست ہے کہ اگر مآخذ کی استنادی حیثیت کمزور ہوگی تو تاریخ اور داستان کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا۔ اس معاملے میں وہ صرف تاریخ نگار کے ذاتی اطمینان کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ یہ بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے ''مآخذ کی تفصیلات اوران سے متعلق اعتبار واستناد کے مختلف مسائل کو ایک ضمیمے کے طور پر مرتّب کرکے آخر میں شاملِ کتاب'' کرے تاکہ قارئین کو بھی اس کے طریقِ کار کا علم ہوسکے اور وہ اس کے مآخذ کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرکے ذاتی طور پر کوئی رائے قائم کرسکیں (ص ۳۴۶)۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب میں ''پاکستان میں اردو'' کے عنوان سے ایک سو بائیس صفحات کا ایک طویل ضمیمہ شامل کیا ہے۔ خاں صاحب کے نزدیک یہ ضمیمہ نہ صرف یہ کہ غیر ضروری ہے بلکہ اس نے ''اس کتاب کو بالکل آخر میں آکر منتشر خیالی اور حشو وزوائد کا مجموعہ بنادیا ہے'' (ص ۳۴۶)۔ ان کے مطابق ''اس غیر متعلق اور نقصان رساں ضمیمے کے بجائے اگر وہ اتنے ہی صفحات پر مشتمل ایک ایسا ضمیمہ مرتّب کرتے جس میں مآخذ کے متعلق ضروری تفصیلات درج ہوتیں اور ضروری امور پر مفصل یا مختصر بحثیں بھی ہوتیں، تو اس سے حقیقی فائدہ حاصل ہوتا اور کتاب کے اعتبار واستناد کی شکل بنتی۔ موجودہ صورت میں ان کے مآخذ کے متعلق جگہ جگہ یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی اصل حیثیت کیا ہے اور یہ کہ مولف نے کسی خاص نسخے کو کس بنا پر قابلِ حوالہ قرار دیا ہے اور یہ کہ اس کے مندرجات کس حد تک قابلِ اعتماد ہیں'' (ص ۳۴۶)۔

مجوزہ ضمیمے کی اہمیت وافادیت کو واضح کرتے ہوئے اس کتاب پر تبصرے کے آخر میں ایک بار پھر لکھتے ہیں:

> ''اردو میں سنین کا مسئلہ بڑی حد تک غیر طے شدہ ہے۔ بہت سے اہم واقعات بھی بحث طلب ہیں۔ صحتِ متن کا بہت بڑا سوالیہ نشان موجود ہے اور انتسابِ کلام کے سلسلے میں بہت سی باتیں بحث طلب ہیں۔ ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ ہر جلد میں ایک مفصل ضمیمہ شامل کیا جائے جس میں ان سب مصادر سے مفصل بحث کی جائے جو اس جلد میں مذکور

ہوئے ہیں'' (ص ۳۵۰)۔

ایک اہم مسئلہ تاریخ ادب کی زبان کا بھی ہے۔ خاں صاحب کے بقول ہر ادبی کتاب کی طرح اس موضوع سے متعلق کتابوں میں بھی ''صحیح بلکہ فصیح زبان کا وجود'' بے حد ضروری ہے (ص ۲۸۵)۔ 'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' سے قواعد اور روزمرہ کے اعتبار سے 'غلط جملوں' اور 'غیر مناسب اندازِ بیان' کی مثالیں پیش کر کے انھوں نے بجا طور پر اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ ''طلبہ جب ایسی اہم کتاب میں ...... ایسے جملے پڑھیں گے تو یہ غلط نگاری ان کے لیے سند کا کام دے گی''۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خاں صاحب کے نزدیک تاریخ نگار کے لیے زبان کے معاملے میں بھی کس قدر محتاط رہنے اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔

صحتِ زبان کے پہلو بہ پہلو اس نکتے کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ تاریخی و تحقیقی بیانات کسی درجے میں بھی رنگیں نگاری و انشاپردازی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ خاں صاحب کے الفاظ میں ''تاریخ اور تحقیق کی زبان کو مبالغے سے پاک اور عبارت آرائی سے محفوظ رہنا چاہیے'' (ص ۳۴۲)۔ ''یہاں نہ جوشؔ صاحب کی لفاظی کی گنجائش ہے اور نہ آزاد کی عبارت آرائی کی''۔ تاریخ و تحقیق کو یہ 'پیرایۂ گفتار' نہ صرف یہ کہ راس نہیں آتا بلکہ بسا اوقات ''اصل مفہوم کو بگاڑنے'' اور ''کم اعتمادی پھیلانے'' کا سبب بن جاتا ہے (ص ۳۴۵)۔

تاریخ سے متعلق کتابوں کا ایک آخری لیکن نہایت اہم جز ان کا اشاریہ ہوتا ہے۔ اشاریے کے بغیر اس قسم کی کتابوں سے استفادے میں جتنی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جس قدر وقت صرف ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، لیکن کسی اشاریے سے مطلوبہ فوائد اسی صورت میں حاصل کیے جا سکتے ہیں جب کہ اس کی ترتیب میں پوری احتیاط اور دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہو، ورنہ اس کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ 'علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو' کا اشاریہ مرتبین کی سہل پسندی اور بے احتیاطی کی وجہ سے جس 'مضحکہ خیز' بے ضابطگی و بے ترتیبی کا شکار ہوا ہے، اس کا اندازہ خاں صاحب کے ان مشاہدات سے کیا جا سکتا ہے:

(۱) ''معلوم ہوتا ہے کہ اشاریہ مرتب کرنے والے بزرگ نے کسی قاعدے کا لحاظ رکھنا اپنے لیے حرام سمجھا تھا۔ جس نقطے کو جہاں چاہا ہے اور جس طرح چاہا ہے، لکھا ہے مثلاً ...... غیاث الدین تغلق کو تو حرف غ کے ذیل میں لکھا گیا ہے اور غیاث الدین بلبن کو حرف ب کے ذیل میں'' (ص ۲۸۳)۔

(۲) ''اشاریے میں ترتیب حروف کا لحاظ رکھا جاتا ہے، خصوصاً حرف اول و ثانی میں۔ اس کتاب کے اشاریہ ساز نے اس مسلّمہ قاعدے کو مہمل سمجھ کر ساری پابندیوں کو اُڑا دیا ہے۔ جس لفظ کو جہاں چاہا ہے، لکھا ہے، مثلاً ع کے ذیل میں سب سے پہلا نام علی ہے، دوسرا اعلاء الدین، اس کے بعد عثمان ہے، پھر عبدالواسع، عبدالحلیم، عبدی ہیں۔ اچانک عمر، عصامی، عزیز سامنے آتے ہیں۔ پھر عنبر اور اس کے معاً بعد عباس اور اس کے بعد عادل (جس کو سب سے پہلے آنا چاہیے تھا)'' (ص ۲۸۴)۔

(۳) ''اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ اصل کتاب اور اشاریے میں مطابقت بھی ہو۔ کتاب کے ایک صفحے پر ایک نام موجود ہے، اشاریہ اس سے خالی ہے۔ اشاریے میں لکھا ہوا ہے کہ یہ نام فلاں صفحے پر ہے لیکن وہ صفحہ اس سے خالی ہے'' (ص ۲۸۴)۔

(۴) ''ایک ہی شخص یا کتاب کو دو مختلف ناموں سے دو جگہ درج کیا گیا ہے مثلاً حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کا نام حرف 'ر' کے ذیل میں 'روشن چراغ دہلی' کی رعایت سے ملے گا اور حرفِ 'ن' کے ذیل میں بھی ملے گا۔ غالباً پریس کی غلطی سے مشہور لغت 'موید الفضلا' کا نام ص ۱۹ پر 'مرید الفضلا' لکھا ہوا ہے۔ اشاریے میں بھی ان کو دو کتابیں فرض کر کے دو جگہ لکھا گیا ہے'' (ص ۲۸۵)۔

ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ:

(۱) اشاریے میں ناموں کا اندراج ایک طے شدہ اصول کے تحت ہونا چاہیے، خواہ اس کے لیے اصل نام کو بنیاد بنایا جائے، خواہ خاندانی نام کو۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ بعض اندراج اصل نام سے اور بعض خاندانی نام سے کیے جائیں۔ بعض شاعروں کا حوالہ ان کے تخلص سے اور بعض کا ان کے اصل نام سے دیا جائے۔

(۲) ہر ردیف کے تحت ناموں کے اندراج میں لغت کے انداز پر حروف کی سلسلہ وار ترتیب کا لحاظ رکھا جائے، یہ نہ ہو کہ صرف حرف اول کی رعایت کو کافی سمجھ کر جو نام جہاں چاہا درج کر دیا۔

(۳) اشاریے اور اصل کتاب کے اندراجات میں مکمل مطابقت ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہونا چاہیے کہ کسی شخص یا کتاب کا نام بطورِ مثال اصل کتاب میں دس جگہ آیا ہو اور اشاریے میں صرف آٹھ مقامات کے حوالے دستیاب ہوں، یا جس صفحے پر وہ نام

مذکور ہو، اس کی بجائے کسی اور صفحے کا نمبر درج کر دیا جائے۔

(۴) بعض اشخاص اور بعض کتابیں بھی دو مختلف ناموں سے معروف ہوتی ہیں۔ اشاریے میں ان کا اندراج پہلے سے طے شدہ اصول کے مطابق کسی ایک ہی نام کے تحت ہونا چاہیے۔ دوسرے نام کے تحت صرف پہلے اندراج کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

تاریخ نگاری سے متعلق اپنے ان مشاہدات میں خاں صاحب نے جن جزئیات کا احاطہ کیا ہے، ہمارے یہاں ان کی طرف مناسب توجہ کی کوئی مستقل اور مستحکم روایت موجود نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو میں اب تک کوئی ایسی تاریخِ ادب نہیں لکھی جا سکی ہے جسے پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ حوالے کی ایک کتاب کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب پر تبصرے کے آخر میں خاں صاحب نے اس خیال کا اظہار فرمایا تھا کہ: ''ایک بار اور سب امور سے قطعِ تعلق کر کے ادب کی تاریخ اس طرح لکھ دی جائے کہ دوسرے کام کرنے والے اس سے استفادہ کر کے اور اس کے مندرجات پر اعتماد کر کے نتائج نکال سکیں تو یہ بڑی خدمت ہوگی۔ ادب کی تاریخ کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ اس کے مندرجات (سنین، واقعات، متن وغیرہ) مستند ہوں تا کہ دوسرے ان سے بلاتکلف کام لے سکیں اور تب تنقید اپنے وسیع الذیل کام کی تکمیل کرنے کے قابل ہو سکے گی'' (ص ۳۵۰)۔

ooo

اردو زبان میں تحقیق کی اہمیت اور موجودہ صورتِ حال

رشید حسن خاں سے ایک مذکرہ

شرکائے گفتگو: ڈاکٹر معین الرحمٰن، سجاد باقر رضوی، جیلانی کامران، مسعود اشعر، اکرام چغتائی، ذوالفقار تابش

محمد اکرام چغتائی: آج ہمارے درمیان بھارت کے معروف محقق رشید حسن خاں موجود ہیں۔ میں آپ دوستوں کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ان سے اردو قواعد اور زبان و املا اور ادبی تحقیق کے حوالے سے سوالات کریں۔

سجاد باقر رضوی: آپ نے اردو املا کے سلسلے میں جو آسانیاں پیدا کی ہیں ان کے محرکات کیا تھے؟ کیا اس کے پیچھے آپ کا اپنا پس منظر تھا؟

کشور ناہید: اس سوال میں اس کا بھی اضافہ کر لیں کہ جس طرح انگریزی زبان کے املا اور قواعد کے بارے میں کتابیں موجود ہیں، ہمارے ہاں یہ روایت ہی نہیں تھی کہ اردو املا کے بارے میں کوئی باقاعدہ منضبط یا سائنٹفک طریقے سے سوچا جائے تو کیا آپ کی یہ سوچ اس تسلسل میں ہے؟

رشید حسن خاں: سب سے پہلے میں یہ وضاحت کر دوں کہ میں نے کسی املا کو آسان نہیں کیا۔ املا جیسا ہوتا ہے ویسا ہی رہا کرتا ہے، میں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ 'بالکل' کو الف کے بغیر لکھیے بلکہ میں نے اصرار کیا ہے کہ 'بالکل' کو ویسے ہی لکھیے جیسا لکھا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عبدالعزیز کو 'الف، لام' کے ساتھ لکھیے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ میں نے کتاب کیوں لکھی؟ میں نے لکھنے پڑھنے کا آغاز لغت، قواعد و عروض سے کم و بیش سنہ پینتالیس، چھیالیس سے شروع کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ابتدائی تعلیم درسِ نظامی کی حاصل کی ہے یعنی مدرسے میں باقاعدہ

عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ عربی تعلیم میں ایک خاص بات یہ ہے کہ مدرسوں میں دو سال تک گرامر پڑھائی جاتی ہے۔ اس وقت تو اس کی افادیت محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اب پتا چلا کیوں کہ اس سے ذہن میں عبارت اور لفظوں کو ناپنے کا پیمانہ بن جاتا ہے۔

چوں کہ پس منظر عربی کا تھا اس لیے میرا پہلا انتخاب لغت، قواعد اور عروض تھا۔ حسنِ اتفاق سے سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا املا پر سلسلۂ مضامین میری نظر سے گزرا تھا۔ صدیقی صاحب کے مضامین پڑھے تو پتا چلا کہ اردو میں اس پر کام ہی نہیں ہوا ہے۔ اردو والوں کی تن آسانی نے اسے قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا! کیوں کہ اردو والے بیشتر شاعری کرتے آئے ہیں۔ شعری مزاج ہے، سائنٹفک مزاج نہیں ہے (اور ہمارے ہاں تو اسی مزاج نے تنقید کو بھی انشائیہ بنادیا ہے) اب میں نے مطالعہ شروع کیا۔ یہ بات ہے ۱۹۶۰ء کی، میں نے املا کے موضوع پر مطالعہ شروع کیا اور جو کچھ اردو میں اس وقت تک لکھا گیا تھا اور میری دسترس میں آسکتا تھا اسے پڑھا۔ اردو کے مختلف مطبعوں کی چھپی ہوئی کتابیں یکجا کیں اور ان کو دیکھا کہ صورتِ حال کیا ہے تو معلوم ہوا کہ لفظ ہی نہیں بلکہ علامتیں تک مختلف ہیں۔ چناں چہ محسوس ہوا کہ اس موضوع پر کام کرنا چاہیے۔ تب کام کرنے بیٹھا جو ۱۹۷۳ء میں مکمل ہوا یعنی تیرہ سال صرف ہوئے۔

میں نے صرف یہ کیا ہے کہ املا کی معیار بندی کی ہے۔ اس سے پہلے میں ایک اور بات بتادوں۔ ۱۹۵۲ء میں ہمارے شہر میں اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں اردو، عربی اور فارسی کے استاد کی اسامی خالی ہوئی۔ میں نے درخواست دے دی اور منتخب ہوگیا۔ لیکن جب میں کلاس میں پڑھانے کھڑا ہوا اور بلیک بورڈ پر ''لیے'' لکھا تو ایک لڑکا کتاب لے آیا اور کہا اس میں تو ہمزہ کے ساتھ ''لئے'' لکھا ہے۔ اس طرح کے کئی واقعات ہوئے میں حیران ہوتا تھا کہ کیا کروں۔ مثلاً ایک لفظ ہے ''اژدہام'' اور کتابیں چھوڑیے ''فرہنگِ آصفیہ'' میں یہ لفظ چار طرح سے لکھا ہوا ہے یا مثلاً ''گزرنا''۔ آپ کو یہ لفظ کہیں ''ز'' سے ملے گا اور کہیں ''ذ'' سے، میں کہتا ہوں کہ کسی زبان کے لیے یہ بات باعثِ فخر نہیں ہے

کہ اس میں معمولی الفاظ کا املا متعین نہ ہو۔ لسانیات میں غلط کوئی چیز نہیں ہوتی مثلاً ایک لفظ کو تین طرح سے لکھا گیا ہے یا بولا گیا ہے تو کسی کو غلط نہیں کہیں گے، نہ تلفظ کو نہ اس کے املا کو، کیوں کہ جو چیز استعمال میں آجاتی ہے وہ غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ ہاں علمی بحثوں میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ان شکلوں میں مروّج صورت یہ ہے۔ مثلاً ہم ہائی اسکول کا نصاب بنانے بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب آٹھویں جماعت کا دوسرے صاحب نویں کا اور تیسرے صاحب دسویں کا نصاب بنائیں گے تو یہ لازم ہوگا کہ اگر ساتویں اور آٹھویں جماعت کی کتاب میں 'گزر' 'ز' سے لکھا گیا ہے تو نویں، دسویں جماعتوں کی کتابوں میں بھی 'ز' سے ہی ہو لیکن ہوتا یہ ہے کہ مثلاً آٹھویں میں 'گزر' 'ز' سے ہے اور نویں اور دسویں میں 'گذر' 'ذ' سے یعنی 'گذر'۔ اب طلبہ 'گزر' کس طرح لکھے!

میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے املا کو 'سہل' نہیں بنایا۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ایسے لکھو۔ کتاب کے مقدمے میں بھی میں نے لکھ دیا ہے کہ اس میں کوئی نئی تجویز پیش نہیں کی گئی۔ کسی لفظ کے املا کو نہیں بدلا گیا ہے جو کئی کئی شکلیں پیدا ہوگئی ہیں، ان کی نشان دہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مرجح صورت کون سی ہے۔

املا میں اصل اصول یہ ہے کہ لفظ کو اس طرح لکھیے جس طرح بولتے ہیں۔ یہ مسلمّہ اصول ہے کہ آخری حرف سے پہلے جو حرف ہے اس سے پہلے اگر 'زبر' ہے تو ہمزہ (ء) آئے گا اور اگر زیر ہے تو 'ی' آئے گی کیوں کہ زیر اپنے ہم جنس ہی کو چاہتا ہے اس لیے 'گئے'، 'نئے' میں ہمزہ آئے گا۔ لیے، دیے، کیے میں 'ی' آئے گی۔

پروفیسر جیلانی کامران: ہندوستان کی تمام زبانوں کا رسم الخط اردو سے مختلف ہے اور اس کے لکھنے پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد ہندوستان کی دیگر زبانوں کے بولنے والوں کے مقابلے میں محدود ہے۔ آپ نے جس طرح کا طریقِ کار وضع کیا ہے اس کی وجہ کہیں عمرانی تو نہیں کہ اس پر دوسری زبانوں کا اثر نہ پڑے۔

رشید حسن خاں: اردو رسم الخط کے سلسلے میں یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اصل میں یہ کام تقسیم سے قبل شروع ہوا تھا۔ میرے تمام کام کی بنیاد انجمن ترقی اردو کی وہ رپورٹ ہے جو ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو نے ایک کمیٹی

قائم کی تھی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس کے سکریٹری تھے۔ اس سے سفارشات پیش کرنے کو کہا گیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں یہ سفارشات انجمن کے سامنے پیش کی گئیں اور رسالہ 'اردو' کے ایک شمارے میں انھیں خاص طور پر شائع کیا گیا۔

پروفیسر جیلانی کامران: زبانوں کی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں انتشار دراصل لوگوں کے تہذیبی پس منظر اور ان تہذیبوں کے استحصال کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر زبانیں کسی ایسے ماحول میں داخل کی جائیں یا پروان چڑھیں جن میں بہت سے دوسرے متبادل یا ایسے رسم الخط اور ایسا املا ہو جن کا ان کی تاریخ کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو تو پھر رویے اور مقاصد بدل جاتے ہیں، جیسا کہ آپ نے کہا کہ جس طرح الفاظ بولے جائیں ویسے ہی لکھے جائیں یعنی املا بھی درست ہے اور تلفظ بھی۔ میں سمجھتا ہوں یہ ایک نہایت مفید رویہ ہے۔ مجھے تو یہ ساری باتیں یوں لگتی ہیں کہ اردو بولنے والے یا اردو کے مداحین اردو کے لیے ایک نئی لسانی سمت تلاش کر رہے ہیں اور عدمِ اطمینان کی کیفیتیں دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟

رشید حسن خاں: کیا یہ سارے حالات ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہوئے ہیں جن کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں؟

پروفیسر جیلانی کامران: ۱۹۴۷ء سے پہلے ہمارے حکمراں اور تھے لہٰذا ۱۹۴۰ء کا برٹش انڈیا مختلف تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندی والے بھی ہماری طرح تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد میں جو بھی صورتِ حال پیدا ہوئی ہے میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس وقت جو کام کر رہے ہیں وہ نہایت مستحسن ہے۔

رشید حسن خاں: اصل میں اردو املا کا سب سے پہلا کام تو مولانا احسن مارہروی نے شروع کیا تھا، جب ۱۹۰۵ء میں انھوں نے اصولِ املا کے بارے میں کہا تھا کہ ''دلکش'' میں ''دل'' الگ لکھو اور ''کش'' کو الگ لکھو (وغیرہ)۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو املا کے مسائل پر ہمارے اساتذہ نے اس وقت توجہ کی ہے جب وہ سوالات ہی پیدا نہیں ہوئے تھے جن کے نتیجے میں آپ یہ بات کہہ رہے ہیں۔

ذوالفقار احمد تابش: یہ ضرورتیں صرف ایک ملک سے تعلق نہیں رکھتیں۔ ہمارے ہاں بھی ظاہر ہے کہ جب صحیح متنوں (Texts) پر کتابیں ترتیب دینے کی کوشش کی گئی تو یہ

مسائل ہمارے سامنے بھی آئے۔ مثال کے طور پر انجمن ترقی اردو کراچی نے جب مطبوعات کا سلسلہ شروع کیا تو ان کے پاس پہلے سے جو طے شدہ طریقِ کار تھا اس کی پابندی کی گئی۔ اس طرح ہمارے ہاں جب مجلسِ ترقی ادب لاہور کی بنیاد رکھی گئی اور مرحوم تاج صاحب نے اس کے لیے لوگوں کو اکٹھا کیا تو یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوا کہ پرانی کتابوں (کلاسیکی کتابوں) کو چھائیں گے تو ان کے متنوں میں جو فرق ہے خاص طور پر املا کا اور علامات کا تو اس کے لیے ہم کیا کریں گے۔ چناں چہ یہاں بھی ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی اور انھوں نے املا اور علامات کے لیے باقاعدہ قواعد وضوابط وضع کر کے انھیں ایک رسالے کی شکل میں چھاپ دیا تھا۔

اکرام چغتائی: آپ کی کتاب اردو املا کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں چھپا، اس کے بعد سے یہ کتاب دو سال سے انجمن ترقی اردو کے رسالے میں قسط وار چھپ رہی ہے۔ پہلے ایڈیشن اور دوسرے ایڈیشن میں دس سال کا وقفہ آتا ہے۔ کیا دوسرے ایڈیشن میں کچھ اضافے بھی کیے گئے ہیں؟

رشید حسن خاں: انجمن ترقی اردو کے پرچے میں جو مضامین قسط وار چھپ رہے ہیں اُن میں ایک تو ترتیب کی تبدیلی ہے بعض مباحث پہلے آگئے ہیں اور بعض بعد میں، لیکن اصل مباحث میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہاں میں نے مثالیں بڑھادی ہیں اور آخر میں الفاظ کا جو گوشوارہ تیار کیا تھا اسے دوگنا بلکہ تین گنا کر دیا ہے تاکہ جس لفظ کا املا دیکھنا مقصود ہو، اس میں دیکھ لیا جائے۔

میں اپنی کتاب کے بارے میں یہ بھی وضاحت کردوں کہ اس کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے بیشتر اسے مکمل طور پر پڑھے بغیر لکھا گیا ہے اور یہ سب تحریریں میری نظر سے گزری بھی ہیں، میں نے ان سے نوٹس بھی لیے کہ شاید میرے کسی کام آسکیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں کوئی بھی ایسا مثبت پہلو مجھے نہیں ملا کہ میں اپنی رائے میں کوئی تبدیلی لاسکتا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن: ۱۹۵۵ء کے بعد 'آج کل' کا جو تحقیق نمبر چھپا اس میں ایک بڑا اہم مضمون تھا ''اردو تحقیق کے چار اساطیر'' اور آج جب ہم ۱۹۸۷ء میں اسے یاد کرتے ہیں تو ہمیں اس محرومی کا احساس ہوتا ہے کہ ان چار میں سے تین سے

ہم محروم ہو چکے ہیں۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ادبی تحقیق کے جو عملی یا نظری مسائل ہیں آپ کے علاوہ کوئی اور بزرگ بھی ہیں جو اس طرح سوچ رہے ہیں؟

رشید حسن خاں: میں تحقیق کے مستقبل کی طرف سے خاصا ناامید ہوتا جا رہا ہوں۔ اس کی تین وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ تحقیقی مزاج کے لیے جس تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، جس بنیادی تعلیم کی ضرورت تھی اور جس کی بنیاد پر ہمارے محققین نے درجہ شرف حاصل کیا تھا وہ گویا ختم ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ احساسِ زیاں جاتا رہا ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ میں نے قاضی صاحب اور عرشی صاحب اور صدیقی صاحب کو دیکھا ہے، تینوں محققین بڑے درویش صفت تھے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد اور پھر ۱۹۶۰ء کے بعد جو ایک سماجی سطح پر تبدیلی آئی ہے تو اس کے نتیجے میں بیشتر مبینہ پڑھے لکھے لوگ ہوس کا شکار ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس سب کچھ ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ بازار میں سب کچھ بکتا ہے، ملتا ہے، لیکن علم نہیں بکتا۔

ایک اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے بارے میں بارہا کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ علم، تحقیق کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا ہے صرف علم ضروری ہوتا تو ہمارے محققین بھی بہت ہوتے کیوں کہ عالم تو بہت گزرے ہیں، محققین ہیں بس تین چار۔ بنیادی چیز ہے طبعی مناسبت۔ اگر طبعی مناسبت نہیں، تو علم بے کار ہے۔ انسان میں صبر، تحمل اور قوتِ برداشت ہو اور دنیا کو حاصل کرنے کا جذبہ کم ہو۔ لکھنؤ کی ڈیرے دار طوائفیں گانا سب کو سنا دیتی تھیں لیکن جنسی وابستگی صرف ایک سے رکھتی تھیں۔ ہمارے بہت سے اساتذہ اور ناقدین کا کردار تو ڈیرے دار طوائف کے برابر بھی نہیں رہا ہے، کیوں کہ ان کی وفاداری سب کے ساتھ ہے، ہمارے پاس سب کچھ ہو، گھر ہو، کار ہو اور ایک گروپ ہو اور دنیا کی آرائش کی اور سب چیزیں ہوں اس نے ہمیں اس چیز سے محروم کر دیا ہے کہ جو چٹائی پر بیٹھ کر آنکھوں کا تیل ٹپکا کر کام کرنے پر مجبور کرتی تھی۔

ہم میں سے اکثر نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے، لکھنا اختیار کر لیا ہے اور لکھنے کے لیے تعینِ وقت کے ساتھ ٹائم ٹیبل بنا لیا ہے کہ اتنے دن میں ایک کتاب مکمل کرنا ہے چوں کہ صفحات کے لحاظ سے معاوضہ ملے گا اس لیے اتنے صفحے ضرور لکھنا

ہیں۔ اس صورتِ حال نے تحقیق کو تباہ کر دیا ہے اور اس سے زیادہ تباہ کُن صورتِ حال یہ ہے کہ اب چوں کہ تحقیق تو پناہ گزینوں کی طرح یونیورسٹیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی ہے اس لیے پی ایچ ڈی کا نام تحقیق ہوگیا ہے اور مثلاً میر کے ایک دیوان کا متن مرتّب کرنا میر کے حالاتِ زندگی پر بحث کرنا ہے، تو اس کے لیے آپ کو لائبریریوں کو کھنگالنا ہوگا لہٰذا آسان طریقہ یہ ہے کہ زندہ شخصیتوں کو موضوعِ تحقیق بنایا جائے، یعنی ہم خرما ہم ثواب محقق کو یہ آسانی کہ ٹیپ ریکارڈر ساتھ لیا، اس سے انٹرویو کیا، اس کے محلے والوں سے گھر والوں سے پوچھ لیا اور بس تحقیق ہوگئی جب کہ ہم تحقیق میں سب سے پہلے یہ پڑھاتے ہیں کہ جو شخص اپنے اور اپنے خاندان کے متعلق جتنے Statements دیتا ہے وہ سب قابلِ قبول نہیں ہوتے کیوں کہ آدمی سب سے زیادہ جھوٹ اپنے متعلق یا اپنے خاندان کے متعلق بولتا ہے اب بڑے پیمانے پر وہ لوگ، جن پر ہم شاعر ہونے کی تہمت لگانے کے بھی گناہ گار نہیں تھے، ان کو تحقیق کا موضوع بنتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

اکرام چغتائی: پاکستان اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں تحقیق کے نام پر ہونے والے کام کے بارے میں آپ کی مجموعی رائے کیا ہے؟

رشید حسن خاں: گزشتہ دس پندرہ سال کے دوران یونیورسٹیوں سے جو مقالے شائع ہوئے ہیں، اگر وہ پچاس ہیں تو شاید ایک دو اس قابل ہوں کہ تحقیق کی تعریف ان پر درست آتی ہو۔

اکرام چغتائی: آپ نے ''ادبی تحقیق۔ مسائل و تجزیہ'' میں کچھ کتابوں پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ کچھ اور کتابوں پر بھی مزید تبصرہ آپ نے کیا ہے یا نہیں؟

رشید حسن خاں: نہیں، میں گزشتہ کئی سال سے 'باغ و بہار' میں اتنا الجھا ہوا ہوں کہ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں کوئی اور کام نہیں کروں گا۔

کشور ناہید: چالیس سال کے دوران ہمارے ہاں اردو پر علاقائی زبانوں کے اور آپ کے ہاں اردو پر ہندی زبان کے اثرات پڑے ہیں۔ ایک تو یہ زمین کی ضرورت تھی اور دوسرے اردو نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے ان اثرات کو قبول کرنا اس کے خاصے میں شامل ہے۔ کیا آپ نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس قسم

کی اردو پر بھی تحقیق کی جائے۔

رشید حسن خاں: آپ نے جو کچھ کہا یہ بڑا اہم کام ہے، لوگوں کو اس طرف آنا چاہیے۔ میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ آسان پسندی علم اور تحقیق کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ یہ نئے نئے راستے سجھاتی ہے اور ایسے سجھاتی ہے کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔

کشور ناہید: لوگوں نے تو امیر خسرو کا اردو دیوان تک دریافت کرلیا ہے۔

رشید حسن خاں: وہ تو منشی نول کشور پریس نے بھی خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا دیوان دریافت کرلیا تھا اور سو برس تک چھاپتے رہے، شیرانی صاحب نے بتایا کہ یہ ان کا دیوان نہیں ہے۔

امیر خسرو والا مسئلہ یہ ہے کہ ایک نیا رجحان شروع ہوا ہے اور اب اردو کا رشتہ محمد تغلق کے زمانے سے جوڑا جا رہا ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ ریختے کی اصل شکل اس زمانے میں بنی تھی۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ تغلق اور خلجی کے زمانے میں ریختہ اگر اردو میں آ گیا تھا اور اردو لکھی جانے لگی تھی تب تو سارے نظریے بدل جاتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ سب سے پہلے آدمی امیر خسرو ہیں کہ انھوں نے ریختے بھی لکھے اور پہیلیاں بھی لکھیں۔ اس کے لیے کچہری کے جھوٹے گواہ کی طرح ہر سہارا لینے کی تیاری کی جا رہی ہے جب کہ تحقیق کے مطابق کسی ایک سطر کا ثبوت موجود نہیں ہے۔ آج کے دن تک کوئی شخص ایسا ایک ثبوت بھی پیش نہیں کرسکا ہے کہ کوئی ایک پہیلی یا کہ مکرنی امیر خسرو کی ہے۔ امیر خسرو کا پہلا دوہا 'سب رس' میں ہے۔ مولوی سیّد احمد دہلوی نے 'فرہنگِ آصفیہ' کے دیباچے میں امیر خسرو کی بیسوں پہیلیاں دے دی ہیں۔ مولوی صاحب ہمارے زمانے کے آدمی، ان کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ ہمیں معلوم ہے کہ مولوی صاحب نے نبی ہونے کا دعوا نہیں کیا۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ ان پر وحی آتی ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہا کہ انھیں الہام ہوتا ہے یا خواب میں انھیں بشارت ہوگئی ہو کہ یہ پہیلیاں امیر خسرو کی ہیں لہٰذا جب تک اس سوال کا جواب نہیں دیا جائے گا ہم اس وقت کوئی چیز امیر خسرو سے منسوب تسلیم نہیں کریں گے۔

تحقیق میں ثبوت اور سند کے کچھ اصول مقرر ہیں روایت مسلسل ہو اور راوی معتبر

ہو۔ اگر راوی معتبر نہ ہو مثلاً نواب نصیر حسین خیال کی ایک کتاب 'مغل اور اردو' شائع ہوئی جس میں لکھا ہے کہ زیب النساء نے یہ شعر کہے، نور جہاں نے یہ شعر کہے۔ سب نے کہا کہ ضرور کہے ہوں گے لیکن یہ ملے کہاں سے؟ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ یہ شعر میر کا ہے، یہ غزل غالب کی ہے یا دیوان فلاں شاعر کا ہے تو ہم پہلے یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ کہاں ملا؟

پروفیسر جیلانی کامران: غالبؔ اور میرؔ تو ایک دوسرے کے قریب کے شاعر ہیں۔ امیر خسرو کو کس طرح متعین کریں گے؟

رشید حسن خاں: امیر خسروؔ کے زمانے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور امیر خسرو کے بعد سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر چلا آرہا ہے۔ کوئی ایک شخص تین سو برس تک کسی کتاب میں یہ نہیں لکھتا کہ خسرو نے ہندوی کا یہ شعر کہا ہے۔ امیر خسرو نے خود لکھا ہے کہ میں نے ہندوی کے شعر کہے ہیں۔ ہندوی اصطلاحی لفظ ہے جو ہندوستان کی ہر مقامی زبان کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ ہندی تو عالمِ وجود میں آئی نہیں تھی جسے 'کھڑی بولی' کہا جاتا ہے لیکن یہ بھی امیر خسرو نے ہی لکھا کہ میں نے ہندوی کے جو شعر کہے وہ دوستوں کی نذر کردیے۔ امیر خسرو نے ہندوی میں شعر کہے تھے، ہم اسے مانتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ انھوں نے اپنے دوستوں میں تقسیم کردیے تھے لیکن اب وہ کہاں ہیں؟ ہمیں معلوم نہیں اگر کسی کو معلوم ہیں تو ہمیں بتائے اور سند ثبوت پیش کرے جو قابلِ قبول بھی ہو۔

جیلانی کامران: وہ چیزیں جب فوک (Folk) میں چلی گئیں تو ......

رشید حسن خاں: یہ کیسے معلوم ہوا کہ فوک میں چلی گئیں؟

جیلانی کامران: عام طور پر یہی کہا جاتا ہے۔

رشید حسن خاں: تحقیق میں 'عام طور' سے بحث نہیں ہوتی، چھے سو سال کا فاصلہ ہے۔ میں عرض کروں کہ میر امن نے 'باغ و بہار' کے دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ جب حضرت نظام الدین اولیاء بیمار ہوئے تو امیر خسرو تیمارداری میں انھیں یہ قصہ سنایا کرتے تھے، یہ روایت ہوئی اگر ماننے والے ہوتے تو اسے بھی مان لیتے۔ اس میں کیا برائی ہے۔ اگر مولوی سیّد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے کو ماننا ہے تو پھر

اس کو ماننے میں کیا برائی ہے۔ میرامّن تو اس سے پہلے کہہ گئے ہیں۔ لیکن ہم نے میرامّن کی روایت کو نہیں مانا۔ شیرانی صاحب نے سب سے پہلے اس کو بے بنیاد بتایا۔

اکرام چغتائی: آپ نے ہندوی کا لفظ استعمال کیا ہے تو کیا یہ اس علاقے کی زبان سمجھی جائے گی جہاں وہ شخص رہتا تھا کیوں کہ مسعود سلمان نے تو یہ کہا ہے کہ ان کے دیوان تین زبانوں میں تھے۔ فارسی میں اور ایک بزبانِ ہندوی اور مسعود سلمان تو لاہور میں رہتے تھے اور شاعری کرتے تھے، تو کیا ہندوی سے مراد پنجابی زبان لی جائے یا کوئی اور زبان؟

رشید حسن خاں: اس زمانے میں شاہی فوجیں سفر کیا کرتی تھیں اور لوگ ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ جس خاص وقت میں وہ یہ لفظ استعمال کر رہے ہیں اس وقت وہ کس علاقے میں تھے۔ مسعود سعد سلمان کے لیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بیشتر یہاں (لاہور میں) رہے ہیں تو اس علاقے کی زبان مراد ہو۔ لیکن باقی کسی کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہندوی کا لفظ ہر مقامی زبان کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

ذوالفقار احمد تابش: ابھی آپ نے کہا کہ تحقیق دونوں طرف زوال پذیر ہوئی ہے۔ اس سے پہلے ہمیں لاہور میں شیرانی صاحب نظر آتے ہیں۔ آپ کے ہاں بھی دو تین نام لیے جا سکتے ہیں۔ ذاتی یا اداروں کی سطح پر تحقیق کا جو تھوڑا بہت کام ہوا ہے اس سے آپ نے بھی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ میں پچاس اور ساٹھ کی دہائی کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ پچاس کا سنہ اس لیے بھی اہم ہے کہ چند سال قبل تقسیم کا عمل ہوتا ہے۔ دو ملک بنتے ہیں لوگ نئی سماجی، سیاسی، علمی و ادبی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے نصاب مقرر ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے طریقِ کار وضع کیے جاتے ہیں گویا ایک بالکل نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب اگر ہم تخلیقی سطح پر دیکھیں تو وہاں بھی شاعری کی سطح پر اور تخلیقی سطح پر اور باقی دیگر سرگرمیوں میں بھی بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادب کی نئی بنیادیں رکھنے کے لیے کہیں تخلیقی سطحوں کی طرف زیادہ توجہ تو نہیں ہوگئی۔ یعنی ہمارے لکھنے والوں کی توجہ تخلیقی

امور کی طرف زیادہ ہوگئی اور جو توڑ پھوڑ یا جن تبدیلیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کا تحقیق پر براہِ راست تو اثر نہیں پڑا؟

رشید حسن خاں: یہ سوال بڑا اہم، معنی خیز اور دلچسپ ہے۔ وہ بات جو میں بھول گیا تھا آپ نے یاد دلا دی۔ تخلیق اور تحقیق دو مختلف راستے ہیں، جو کہیں آ کر نہیں ملتے۔ میں اگر چاہوں تو لفظ جمع کر کے شعر بنا سکتا ہوں لیکن شعر کہہ نہیں سکتا، کیوں کہ تخلیق کا عمل بڑا مختلف عمل ہے جو اندرون سے تعلق رکھتا ہے، خارج سے نہیں۔ جب کہ تحقیق خالص اکتسابی اور خارجی عمل ہے۔ جو شخص تخلیقی صلاحیت نہیں رکھتا وہ کتنا ہی بڑا محقق ہو، تحقیق کرے یا نہ کرے، تخلیق تو کر ہی نہیں سکتا اور جو شخص تخلیق کار ہے وہ کتنا ہی سر پیٹ لے، تحقیق کا کام نہیں کر سکتا۔ ہوا یہ ہے کہ آہستہ آہستہ ۱۹۴۷ء کا جو حادثہ ہوا ہے، اس نے حدِ فاصل کھینچ دی ہے وہاں سے یہ چیزیں شروع ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں، لیکن وہ زمانہ ان کے شروع ہونے کی تمہید بن گیا ہے۔ اسی طرح وہ پورے نظام کے بدلنے کی بھی تمہید بنا ہے۔ نظام کے بدلنے نے صورتِ حال کو بدل دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنیادی تعلیم ختم ہوگئی۔ اب یہ بات کہ مزاجی مناسبت، تو وہ پہلے ہی کم تھی۔ ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک ایک اکیلے شیرانی صاحب کھڑے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب چیزیں بدلی نہیں ہیں، ۱۹۴۷ء والا عمل نہیں ہوا ہے۔ دراصل تحقیق کا کام پہلے بھی محدود دائرے میں تھا اور ہمیشہ محدود دائرے میں رہے گا اور اس میں وہی لوگ آئیں گے جن کے اندر قلندری ہوگی۔ اگر علم کے ساتھ قلندری کا جز شامل نہیں تو کتنا ہی بڑا آدمی ہو، تحقیق نہیں کر سکتا۔ ہاں ترقی اردو بورڈ اور مجلس ترقی ادب کی کتابیں مرتب کر سکتا ہے۔

ابھی ہمارے ہاں ہندی اصناف پر ایک سمینار ہوا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مجھے بھی شرکت کی دعوت دی، میں نے کبت پر ایک مضمون پڑھا۔ 'کبت' کے بارے میں مجھے ان کتابوں کی تلاش ہوئی جن میں کبت ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ محمد بخش مہجور لکھنوی کی کتاب 'نورتن' میں اس پر پورا ایک باب ہے۔ اب مجھے اس کے پہلے ایڈیشن کی تلاش ہوئی، پہلا ایڈیشن نہیں ملا۔ میں نے مجلس ترقی ادب لاہور کا ایڈیشن اُٹھالیا۔ لیکن میں اس کی ایک سطر کو بھی نقل نہیں کر سکا

کیوں کہ پڑھا ہی نہیں جا سکا۔ جن صاحب نے اسے مرتب کیا تھا وہ جانتے ہی نہیں کہ 'کبت' ہوتا کیا ہے اور اس کی زبان کیا ہوتی ہے، یہ ایک مثال ہے، ہمارے ہاں ترقی اردو بورڈ دھڑا دھڑ کتابوں کے ترجمے چھاپ رہا ہے۔ میں آپ سے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ لوگ جن کی کتابوں کے تراجم ہو رہے ہیں اگر وہ زندہ ہوتے تو ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیتے۔ اسی لیے میں ہمیشہ اس پر اصرار کرتا ہوں کہ تذکروں کے ترجمے مت کیجیے کیوں کہ وہ ثانوی ماخذ ہوتے ہیں اور تحقیق ثانوی ماخذ کو قبول نہیں کرتی۔ کراچی سے شیفتہ کے تذکرے 'گلشنِ بے خار' کے دو ترجمے چھپے ہیں۔ وہ اس پائے کے ہیں کہ میں کیا کہوں۔ اس پر ایک مشہور آدمی کا لکھا ہوا مقدمہ بھی ہے۔ غرض اب تک میری نظر سے ہندوستان اور پاکستان میں ایسا کوئی ترجمہ نہیں گزرا جس کو اعتماد کے ساتھ استعمال کیا جا سکے۔ سب نے معاوضہ بھی لیا ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ضمیر بالکل پتھر کی مانند سادہ و صاف ہے کہ معاوضہ لیتے وقت ادنا سی خلش بھی پیدا نہیں ہوتی کہ ہم جو کام کر رہے ہیں جس کا ہم نے معاوضہ لیا ہے اس کا حشر کیا ہوگا۔ ہم تحقیق کے بڑے پراجیکٹ بناتے ہیں جب تک پراجیکٹ کاغذ پر ہوتا ہے بڑا اچھا رہتا ہے لیکن جب عمل میں آتا ہے تو کچھ اور چیز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''اخلاقیاتِ تحقیق'' ختم ہو گئی ہے، ضمیر سادہ ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن: آپ کے ہاں سے ایک کتاب 'تاریخ ادب اردو' چھپی تھی۔ ایک 'تاریخ ادب اردو' ہم نے چھاپی ہے۔ آپ کے ہاں والی تو آپ کے تبصرے پر واپس لے لی گئی، لیکن ہمارے ہاں والی 'تاریخ ادب اردو' ابھی تک چل رہی ہے۔ کیا پاکستانی کتاب آپ کی نظر سے گزری ہے؟

رشید حسن خاں: میں نے اسے پڑھنا ضروری نہیں سمجھا۔

اکرام چغتائی: آپ نے صورتِ حال کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بڑی تشویشناک اور حوصلہ شکن ہے۔

رشید حسن خاں: لیکن انشاء اللہ آپ کا اور ہمارا حوصلہ ختم نہیں ہوگا۔

اکرام چغتائی: تحقیق میں جو کچھ ہو رہا ہے یا جو موجودہ صورتِ حال ہے، کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہمارے ہاں اردو میں تحقیقی وسائل کی کمی ہے؟

رشید حسن خاں: یہ درست ہے کہ ایسا کوئی مرکز یا لائبریری نہیں کہ وہاں سے تمام دستاویزیں مل سکیں۔ بہت دن ہوئے جب ترقی اردو بورڈ کی طرف سے کہا گیا تھا کہ 'کلیاتِ میر' کو ایڈٹ کردوں۔ میں نے دو شرطیں رکھیں، اول یہ کہ اس کام میں دس برس لگیں گے۔ دوسری یہ کہ میں نے ۳۵ مخطوطات کی ایک فہرست فراہم کی اور کہا کہ ہندوستان، پاکستان اور یورپ کے کتب خانوں سے ان کے فوٹو اسٹیٹ فراہم کردیے جائیں۔ کہا گیا کہ سرکاری طور پر تو یہ انتظام نہیں ہوسکتا۔ میں نے کہا اگر یہ نہیں ہوسکتا تو کام بھی نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان اور پاکستان کی بدنصیبی یہ ہے کہ اور تو سب کام ہورہے ہیں بڑی بڑی عمارتیں بن رہی ہیں، ادارے قائم ہورہے ہیں لیکن ایک بھی ایسا ادارہ نہیں کہ جہاں انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم، کراچی میوزیم، پنجاب یونیورسٹی کا شیرانی کلکشن اور ہندوستان میں رضا لائبریری اور خدا بخش لائبریری کی اہم کتابوں اور مخطوطات کی فوٹو اسٹیٹ یکجا کردیے جائیں، جب تک ایسا نہیں ہوگا، حقیقی اسکالر تحقیق کا کام خاطر خواہ نہیں کرپائیں گے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن: چار سال سے آپ 'باغ و بہار' پر کام کررہے ہیں۔ چوبیس گھنٹے تو 'باغ و بہار' میں الجھے نہیں رہ سکتے کوئی اور بھی تو مصروفیات ہوں گی مثلاً شعر و ادب کا مطالعہ وغیرہ......؟

رشید حسن خاں: میں تنہائی کے لمحوں میں پہلے دن سے آج تک شاعری کو سب سے زیادہ رفیق رکھتا ہوں، کیوں کہ میرا خیال ہی نہیں عقیدہ بھی ہے کہ شعر محفل میں پڑھنے کی چیز نہیں، زور سے پڑھنے کی چیز نہیں۔ جب زور سے شعر پڑھا جاتا ہے تو اپنی آب و تاب آدھی کھو دیتا ہے، جیسے کوئی بہت اچھا گانا ہو اور ٹرانسسٹر کو بہت اونچا کردیا جائے تو گانے کی خوبی آدھے سے زیادہ ختم ہوجاتی ہے۔ جب میں تنہا ہوتا ہوں، پریشان ہوتا ہوں، گھبرایا ہوا ہوتا ہوں تو صرف شاعری سے اپنا دل بہلاتا ہوں۔ لیکن کسی کو سناتا نہیں اور اس شاعری کو پڑھتا ہوں جو پہلے میرے ذہن پر حملہ نہ کرے بلکہ میرے دل میں اُتر جائے۔ میں شاعری پڑھتا ہوں اور اس میں قدیم و جدید کی تخصیص نہیں۔ میں نئے نئے شاعروں کو بھی پڑھتا ہوں۔ فیض کو اتنی بار پڑھا ہے کہ بہت سے فیض پرستوں نے بھی شاید اتنی

بار نہ پڑھا ہو۔ تحقیق کے سلسلے میں بھی میری کوشش ہوتی ہے کہ یہ ڈرانے کی چیز نہ ہو، پڑھنے کی چیز ہو۔ خواندگی کی صفت باقی رہے لیکن وہ بات بھی نہ ہو جس سے ہماری تنقید انشائیہ بن گئی ہے۔ وہ بات بھی نہ ہو جس نے کرشن چندر نے افسانے کی زبان کو رنگ و نور کا منارہ بنا دیا ہے۔ تحقیق اپنی حدوں میں رہے۔

کشور ناہید: جب آپ تحقیق کی بات کرتے ہیں تو آپ کا فرض بنتا ہے کہ آپ نئے آنے والوں کو جدید خطوط سے آشنا کریں، اگر آپ جدید املا کا لائحۂ عمل دے سکتے ہیں تو انھیں جدید تحقیق پر کام کرنے پر بھی راغب کریں۔

رشید حسن خاں: گزشتہ اٹھائیس سال سے جب سے میں یونیورسٹی میں ہوں، میرے دل میں بھی یہی حسرت ہے۔

کشور ناہید: جب آپ تحقیق کے اصول دریافت کرنے لگتے ہیں تو کتاب کے دو سو سال پرانا ہونے کا انتظار کیوں کرتے ہیں۔ یہ طریقہ کیوں رائج نہیں کرتے کہ جب کوئی کتاب لکھی جائے، چھاپی جائے تو اس کا اصل مسودہ محفوظ کر لیا جائے۔

رشید حسن خاں: یہ کام ہمارا نہیں۔ یہ کام ہے لائبریریوں کا۔ لائبریریوں کو کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں خدا بخش لائبریری نے یہ کام شروع کیا ہے۔ وہ مصنفین کو خطوط لکھتے ہیں کہ مسودہ ارسال کر دیں کیوں کہ مسودہ پہلا خیال ہوتا ہے۔

مسعود اشعر: ہمارے ہاں یہ کام ہمدرد لائبریری کر رہی ہے۔

❖❖❖

ڈاکٹر نیر مسعود

'فسانۂ عجائب' مرتّبہ رشید حسن خاں

آخر 'فسانۂ عجائب' مرتبۂ رشید حسن خاں منظرِ عام پر آگئی۔ اس ایڈیشن کی تکمیل اور اشاعت کے درمیان کئی برس کا فاصلہ ہے۔ کچھ یہی صورت اصل کتاب 'فسانۂ عجائب' کے ساتھ بھی پیش آئی تھی جس کا ذکر رجب علی بیگ سرور اس کے پہلے ایڈیشن (۱۲۵۹ھ) کی نثرِ خاتمہ میں اس طرح شروع کرتے ہیں:

''برسوں یہ فسانہ کسادِ بازاریِ زمانہ سے تہ رہا، مشہور نہ ہوا''۔

رشید حسن خاں کا یہ ایڈیشن بھی برسوں تہ رہا، لیکن اس کی شہرت کا آغاز اس کی ترتیب کے آغاز کے ساتھ ہی ہوگیا تھا۔ اردو تحقیق کی عام روش سے رشید حسن خاں کو سخت شکایتیں ہیں اور انھوں نے بعض محققوں کے مرتّب کیے ہوئے کلاسیکی متون کی بے دردی سے چیر پھاڑ بھی کی ہے، اس لیے یہ خبر خاصی دلچسپی کے ساتھ سنی گئی تھی کہ اب رشید حسن خاں خود ایک کلاسیکی متن اور وہ بھی 'فسانۂ عجائب' کا سا خطرناک متن مرتّب کررہے ہیں۔ یہ تجسّس پیدا ہونا فطری تھا کہ رشید حسن خاں متن کی تحقیقی تدوین کے جس معیار کا دوسروں سے مطالبہ کرتے ہیں اسے خود کہاں تک قائم رکھ پاتے ہیں۔ اس ایڈیشن کی اشاعت کے بعد یہ بات بلاتامل کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے اپنی تنقیدی اور احتسابی تحریروں میں تدوینِ متن کے جس مثالی نمونے کا تصور پیش کیا تھا، عملاً اس سے بھی کچھ بہتر نمونہ پیش کردیا ہے اور اس بات کا اعتراف کرنے میں بھی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ابھی تک اردو نثر کا کوئی متن اس شان کے ساتھ مرتّب نہیں ہوا تھا۔

تدوین کا یہ کام رشید حسن خاں نے ۱۹۷۸ء کے قریب شروع کیا تھا۔ اس میں سب

سے سخت مرحلہ ’فسانۂ عجائب‘ کے متن کی صحیح قرأت کا تھا۔ ایک بار انھوں نے مجھے لکھا تھا:

’’سچی بات تو یہ ہے کہ اس متن نے مجھے تھکا مارا ہے۔ اس قدر صبر آزما کام سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ معلوم نہیں یار لوگوں نے کس طرح اب تک اسے نپٹایا ہے اور اساتذہ نے پڑھایا ہے‘‘۔

اور یہ بھی اطلاع دی:

’’پرسوں دو گھنٹے ایک جملے کی نذر ہو گئے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کو بھی اس مسرت میں شریک کروں جو حل کرنے کے بعد مجھے حاصل ہوئی تھی‘‘۔

اعراب اور رموزِ اوقاف کا التزام جو پڑھنے والے کے لیے سہولت مہیا کرتا ہے، مرتّب کے لیے مشکلوں اور ذمہ داریوں کے پہاڑ کھڑے کر دیتا ہے۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مرتّب کے ذہن میں متن کے ہر لفظ کا تلفظ مع معنی اور ہر جملے کی ساخت مع مفہوم آئینہ نہ ہو۔ اس کے لیے اس کو مصنّف کے ذاتی اسلوب اور اس کے عہد اور علاقے کی زبان کی عمومی خصوصیات سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ رشید حسن خاں نے اس سلسلے میں جو کوہ کنی کی ہے اس کا اندازہ ان کے تیار کیے ہوئے متن کے کسی بھی صفحے کو توجہ سے پڑھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ متن اعراب و اوقاف سے مزین ہو کر اپنی شرح آپ کرتا ہوا چلتا ہے اور بجائے خود ایک مکمل تحقیقی کام ہے۔ لیکن اسی کے برابر کا یا شاید اس سے بھی بڑا کارنامہ وہ ملحقات (مقدمے، ضمیمے، فرہنگ) ہیں جن کا مجموعی حجم ’فسانۂ عجائب‘ کے متن سے زیادہ ہے۔ مقدمہ کئی مباحث پر مشتمل ہے اور اس کے احاطے کا اندازہ ان مباحث کے عنوانات سے ہو سکتا ہے جو حسبِ ذیل ہیں:

[سرور کی] ولادت، وفات، مدفن، تعلیم اور مختلف فنون سے واقفیت۔

[فسانۂ عجائب کی] وجہِ تصنیف اور زمانۂ تصنیف، نوازش اور اصلاح۔ ’بیانِ لکھنؤ‘ کے اختلافات۔ آسان کہنے کی فرمائش۔ میر امّن، باغ و بہار۔ ضمنی داستانیں۔ بندر کی تقریر۔ زبان و بیان۔ خطی نسخے۔ مطبوعہ نسخے۔ بنیادی متن [مرتّب کا] طریقِ کار۔ علامات، رموزِ اوقاف......

’فسانۂ عجائب‘ کا سببِ تالیف، زمانۂ تالیف، اس کے مختلف ایڈیشنوں کی صورتِ حال، یہ سب تحقیق کے بہت الجھے ہوئے مسائل تھے۔ رجب علی بیگ سرور نے ’فسانۂ عجائب‘ کے حصے مختلف زمانوں میں لکھے اور کتاب مکمل کرنے کے بعد بھی اس میں ردوبدل

اور حذف و اضافہ کرتے رہے۔ ان کے ایک حریفِ سخن دہلوی نے طنزاً لکھا تھا کہ ''سرور لکھنوی نے اٹھارہ مرتبہ 'فسانۂ عجائب' کو درست کیا'' اور یہ سلسلہ ١٢٤٠ھ سے ١٢٨٠ھ تک چلتا رہا۔ اس طرح چالیس سال تک سرور کتاب میں مداخلت کرتے رہے۔ رشید حسن خاں نے 'فسانۂ عجائب' کے سب اہم ایڈیشنوں کو بار بار پڑھ کر اور ان کا باہم لفظ بہ لفظ مقابلہ کر کے ان مداخلتوں کی روداد مرتب کی ہے۔ یہ محال کی حد تک مشکل کام تھا اور رشید حسن خاں کے سوا شاید کوئی اور اس کا بیڑا اٹھانے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

مصنف کے حالاتِ زندگی کی تحقیق اور اس کی سوانح نگاری متنِ کتاب کے مرتب کی ذمہ داری نہیں ہوتی، لیکن مصنف کے جن حالات کا ربط اُس کی تصنیف سے ہوتا ہے ان پر نظر کرنا ضروری ہے۔ رشید حسن خاں نے اس اصول کا لحاظ رکھا ہے۔ انھوں نے سرور کے عام حالاتِ زندگی کا مختصر بیان کیا ہے لیکن 'فسانۂ عجائب' کے محرکِ اول کی شخصیت، سرور اور نوازش کی جلاوطنی کی علت اور اس سلسلے میں لکھنؤ کے محلّہ منصور نگر کی اہمیت پر بعض قرائن کی روشنی میں کچھ اہم امکانات کی نشان دہی کی ہے۔ یہ امکانات جن عجیب انکشافات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ان کا کوئی حتمی ثبوت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے رشید حسن خاں نے اپنے اخذ کیے ہوئے نتائج کو قیاس آرائی کی حد میں رکھا ہے، لیکن اگر سرور اور نوازش کے حالات کی مزید تحقیق کی جائے تو عجب نہیں کہ یہ قیاسات حقیقت بن کر سامنے آجائیں۔

متنِ کتاب کے بعد ضمیمے آتے ہیں۔ پہلے ضمیمے 'نثرہاے خاتمۂ کتاب' میں وہ سب عبارتیں درج کردی گئی ہیں جو سرور نے 'فسانۂ عجائب' کے مختلف ایڈیشنوں کے آخر میں لکھی ہیں۔ ان عبارتوں سے 'فسانۂ عجائب' کی تصنیف اور اشاعت کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔

دوسرا ضمیمہ 'تشریحات' کا ہے۔ 'فسانۂ عجائب' کے بہت سے لفظوں اور فقروں کو کئی طرح پڑھا جاسکتا ہے۔ رشید حسن خاں نے اُن مختلف قرأتوں کی وضاحت کے ساتھ اپنی ترجیحی قرأت کا جواز پیش کیا ہے۔ بہت سے لفظوں اور فقروں کے مفاہیم تشریح طلب ہیں، اس ضمیمے میں وہ تشریحیں بھی ہیں، بہت سے لفظوں کے تلفظ و املا اور تذکیر و تانیث کے تعین میں بحث طلب امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے ضمیمے 'انتسابِ اشعار' میں ان شعروں کی تحقیق ہے جو سرور نے 'فسانۂ عجائب' میں جابجا درج کیے ہیں۔ ان شعروں کے اندراج کے ساتھ سرور نے شاعر کا حوالہ کہیں دیا

ہے، کہیں نہیں دیا ہے، کہیں غلط دیا ہے، بعض شعروں میں ضرورتاً اور بعض میں سہواً کچھ تبدیلی کردی ہے۔ رشید حسن خاں نے ان شعروں کی صحیح قرأت اوران کے مصنفوں کا تعین کیا ہے۔ یہ کتنا جاں کاہ کام تھا اس کا اندازہ رشید حسن خاں کے سوا شاید کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔

چوتھا ضمیمہ 'اشخاص، مقامات، عمارتیں'۔ سرور کے دیباچۂ کتاب میں جو اسمائے خاص آئے ہیں ان کے متعلق معلومات فراہم کرنا بہت ضروری مگر بہت مشکل کام تھا۔ رشید حسن خاں نے حسبِ توقع یہ کام بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

پانچویں ضمیمے 'تلفظ اور املا' اور چھٹے ضمیمے 'الفاظ اور طریقِ استعمال' کا تعلق رشید حسن خاں کے خاص اور پسندیدہ میدان سے ہے۔ ان ضمیموں کے تحت انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق وہ بجا طور پر ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کہہ سکتے ہیں اور اگرچہ ان ضمیموں کا تعلق اصلاً 'فسانۂ عجائب' کے متن سے ہے لیکن ان کا فائدہ کلاسیکی اردو نثر کے بہت سے دوسرے متون کو بھی پہنچے گا۔

ساتواں ضمیمہ 'اختلافِ نسخ' کا ہے۔ یہ پچاسی (۸۵) صفحوں پر مشتمل مکمل کام تھا مگر کتاب کی بڑھتی ہوئی ضخامت کے پیشِ نظر اس میں صرف وہ چودہ صفحے شامل ہیں جن میں دیباچۂ کتاب کے اختلافاتِ نسخ دیے گئے ہیں اور متنِ کتاب کے اختلافات روک لیے گئے ہیں۔ تدوینِ متن کے ایک بہت ضروری عنصر سے کتاب کا عاری رہ جانا جتنا افسوس ناک ہے اس سے زیادہ افسوسناک یہ بات ہے کہ اس نقصان کو محض کتاب کی ضخامت ذرا کم رکھنے کے لیے گوارا کرنا پڑا ہے۔ امید ہے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں، جس کی نوبت خدا کرے جلد آئے، یہ کمی پوری کردی جائے گی۔

فرہنگ کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں عام الفاظ ہیں، دوسرے میں عربی عبارتوں اور تیسرے میں فارسی شعروں اور فقروں کے معنی دیے گئے ہیں۔

کتاب کے مشتملات کا یہ تعارف اس لیے پیش کیا گیا کہ پڑھنے والوں کو رشید حسن خاں کے طریقِ کار اور تدوینِ متن کے اصول و آداب کا علم ہوجائے۔ اس علم کی عملی تربیت کے لیے 'فسانۂ عجائب' مرتبہ رشید حسن خاں کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس ایڈیشن کا مقصد پڑھنے والوں، خصوصاً طالبِ علموں کے لیے 'فسانۂ عجائب' کے مطالعے کو خوشگوار اور آسان بنانا ہے، لیکن یہ طالبِ علموں سے بھی زیادہ اردو کے محققوں، استادوں اور نقادوں

کے لیے مفید ہے۔ محققوں کو اُسے تحقیق کی درسی کتاب کی طرح پڑھنا چاہیے، اساتذہ کو یہ ایڈیشن ذہین اور متجسس طالبِ علموں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا سکتا ہے اور نقاد اس ایڈیشن کو پیش نظر رکھ کر صحیح معنوں میں 'فسانۂ عجائب' کا تنقیدی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

اس ایڈیشن کے انتساب کا بھی ذکر ضروری ہے۔ رشید حسن خاں سے اس کی امید تو خیر کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی کسی کتاب کو کسی صاحبِ اقتدار شخصیت کے نام معنون کریں گے، البتہ اس مہتم بالشان تحقیقی کارنامے کا انتساب کسی بڑے محقق کے نام ضرور متوقع تھا، لیکن اس کے انتساب کی عبارت یہ ہے:

''لکھنؤ کے ایک فدائی جناب صباح الدین عمر کی نذر''۔

صباح الدین عمر صاحب ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ کے سابق مدیر، اتر پردیش اردو اکادمی کے بنیاد گزار اور سابق سکریٹری اور لکھنؤ کی معروف شخصیت ہیں، لیکن تحقیق کی دنیا سے الگ ہیں۔ رشید حسن خاں کی کتاب موصول ہونے کے بعد انھوں نے خاصی پریشانی کے عالم میں مجھ کو فون کیا کہ ''خاں صاحب نے یہ کیا کیا، اب لوگ پوچھتے پھریں گے کہ یہ صباح الدین عمر کون صاحب ہیں جن کو ایسی زبردست تحقیقی کتاب پیش کی گئی ہے''۔ لیکن صباح الدین صاحب واقعی لکھنؤ کے فدائی اور خاموش خدمت گار ہیں۔ 'فسانۂ عجائب' کا یہ انتساب ان کی شخصیت کے اعتراف کی بہت عمدہ صورت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خود رشید حسن خاں کی اس ادبی خدمت کا اعتراف کس صورت میں کیا جاتا ہے۔

❖❖❖

کالی داس گپتا رضا

ہمارے خاں صاحب

میری کتاب 'سلطان الشعرا خاقانیِ ہند، شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی (معتبر حالات، مستند کلام)' پر انتساب ان لفظوں میں ہے: ''رشید حسن خاں کے نام جو ہمارے زمانے کے ممتاز محقق ہیں اور تدوین میں آج جن کا مدِّ مقابل کوئی نہیں''۔

میں نے یہ کتاب اپریل ۱۹۹۷ء میں مکمل کی تھی۔ ابھی چند روز پہلے خاں صاحب کی تازہ کتاب 'مثنویاتِ شوق' مجھے ملی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پیش لفظ میں جناب خلیق انجم نے میرے انتساب کی تائید اور بھی زوردار الفاظ میں کی ہے، اگرچہ انداز مختلف ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اردو میں رشید حسن خاں کے پایے کا کوئی اور متنی نقاد ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ خاں صاحب کو متنی تنقید کے سائنٹفک طریقوں پر قدرت حاصل ہے وہ املا اور تلفظ کے ماہر ہیں، اسی لیے وہ متن کا جس طرح تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہیں وہ کوئی اور نہیں کر سکتا''۔

رسالہ 'کتاب نما' کے ستمبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں خاں صاحب کی تازہ تصنیف 'مثنویاتِ شوق' پر ڈاکٹر گیان چند کا تبصرہ چھپا ہے، اُس میں انھوں نے رشید حسن خاں کو 'خدائے تدوین' کے لقب سے پکارا ہے۔ ظاہر ہے کہ تبصرے کے عنوان میں 'صحیفہ' کا لفظ اسی لقب کی رعایت سے ہے۔ عنوان ہے:

> ''خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویاتِ شوق''

میں اس عنوان سے قطعی متفق ہوں تاہم اس عمدہ تبصرے میں ایک مقام پر اُن سے سہو ہو گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''وہ (رشید حسن خاں) رشکؔ کی لغت کا نام 'نفس اللغۃ' لکھتے ہیں ......

اس کا نام تاریخی ہے جو 'نفس اللغہ' ہے اِس سے تاریخِ تصنیف ۱۲۵۶ھ برآمد ہوتی ہے۔ اگر آخری حرف کو 'ت' لکھا جائے تو ۱۶۵۱ھ تاریخ نکلے گی جو صحیح نہیں ہے......''

عرض ہے کہ نفس اللغۃ میں لمبی 'ت' نہیں ہے جس کے ۴۰۰ عدد لیے جائیں، یہ گول ت (ۃ) ہے جو (ہ) کے برابر مانی جائے گی جس کے پانچ ہی عدد لیے جائیں گے۔ گویا نفس اللغۃ نفس اللغت کے برابر نہیں بلکہ نفس اللغہ ہی کے برابر ہے۔

میں خاں صاحب کی اعلا درجے کی تحقیق سے تو واقف تھا مگر فنِ تدوین میں اُن کی مہارت سے بہ خوبی آگاہ نہ تھا۔ دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد اور کلامِ ذوق کے بعض دوسرے مآخذ میں تحریف کے قصے زبان زدِ عام ہیں۔ اس لیے مدت سے میری تمنا تھی کہ ذوق کا وہ کلام شائع کیا جائے جس کے مستند ہونے میں کوئی کلام نہ ہو۔ اس کے لیے میں نے بیشتر 'کلیاتِ ذوق' مرتبہ' تنویر احمد علوی اور کچھ تذکروں ہی کو پیشِ نظر رکھا کیوں کہ اُس وقت دیوانِ ذوق مرتبہ ویرانؔ و ظہیرؔ اور نگارستانِ سخن میری دسترس میں نہ تھے۔ ان ماخذوں کے بغیر کلامِ ذوق کو معتبر و مستند کیوں کر تسلیم کیا جائے! اس اثنا میں رشید حسن خاں کسی کام کے لیے ممبئی تشریف لائے اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ یہاں مہینہ بھر کے لیے رُکنے والے ہیں، میں نے موقع غنیمت جانا اور ضعفِ بصارت کا بہانہ کر کے (جو واقعی تھا) اُنھیں کلام ذوق (دو ڈھائی ہزار اشعار) بغیر کسی ماخذ کے بھیج دیا جو کچھ دنوں کے بعد اُنھوں نے دیکھ کر اس نوٹ کے ساتھ لوٹا دیا کہ چوں کہ کوئی کتاب (ماخذ) ان کے پاس نہیں، اس لیے اس میں غلطیاں رہ سکتی ہیں۔ اصل ماخذ سے مقابلہ کر لیجیے۔ کچھ عرصے کے بعد 'دیوانِ ذوق' مرتبہ ویرانؔ و ظہیرؔ اور 'نگارستانِ سخن' مجھے مل گئے۔ میں نے خاں صاحب کی ترامیم کو اِن ماخذوں سے ملا کر دیکھا تو اسّی فیصد ترکیبوں اور اُن پر کی گئی ترمیموں کو درست پایا اور پورے کلام پر تدوین کا کام تو اس پایے کا تھا کہ خود استاد ذوقؔ بھی اُس پر ناز کرتے۔

میں خاں صاحب کا شکریہ 'پیش لفظ' میں ادا کرنا چاہتا تھا مگر وہ نہ مانے۔ تب میں نے ذیل کے انتساب میں اُن کے احسان کا کچھ بدلا چکانے کی ٹھانی اور لکھا:

''رشید حسن خاں کے نام

جو ہمارے زمانے کے ممتاز محقق ہیں اور تدوین میں آج جن کا مدِ مقابل کوئی نہیں''

رشید حسن خاں نے بہت سے دیگر کاموں کے علاوہ پانچ عظیم کارنامے انجام دیے ہیں جن

سے وہ فنِ تدوین کے شہنشاہ تسلیم کرلیے گئے، مگر یہ کام انھوں نے دم زدن میں مکمل نہیں کرلیے تھے، اِن کی تکمیل میں برسوں لگے۔ اُنھوں نے کبھی ثانوی ماخذ پر سمجھوتا نہیں کیا اور اصل ماخذ تک پہنچنے میں سالہا سال انتظار کیا۔ اُنھوں نے اس میں جو مصیبتیں اٹھائی ہیں انھیں فرہاد بھی نہ اٹھا پاتا۔ ان کے پانچ کام یہ ہیں:

(۱) فسانۂ عجائب

(۲) باغ و بہار

(۳) مثنوی گلزارِ نسیم

(۴) مثنویاتِ شوق

(۵) مثنوی سحرالبیان (جواس وقت زیرِ طبع ہے)

اِن میں سب سے زیادہ دلچسپی مجھے 'مثنوی گلزارِ نسیم' سے تھی کیوں کہ چکبست کے سلسلے میں اس کے بہت سے حوالے میرے کام میں بھی موجود ہیں۔ میں نے اُس کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خاں صاحب میں جانب داری ایسی کوئی چیز نہیں۔ جہاں اُنھوں نے چکبست کو اُن کی غلطی پر لتاڑا ہے وہاں شرر بھی اُسی سختی کا شکار ہوئے ہیں بلکہ بعض مقامات پر چکبست کی حد سے زیادہ تعریف کی ہے۔ مثلاً 'مثنوی گلزارِ نسیم' (ص ۱۴۱) پر چکبست کی سخن سازی، غلط بیانی اور طرف داری کی نشان دہی کرنے سے پہلے لکھا ہے:

''اس بات کا اعترافِ کیا جانا چاہیے کہ متعدد اعتراضات کے جواب میں چکبست نے بہت تلاش کے ساتھ اسناد فراہم کیں، اس سے ان کے مطالعے کی وسعت کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض اشعار کے مفاہیم کے سلسلے میں سخن فہمی کی عمدہ صلاحیت سامنے آتی ہے اور بعض اشعار کے سلسلے میں اندازِ بیان سے متعلق جو توجیہات کی ہیں وہ بھی ان کی ذہانت پر دلالت کرتی ہیں ......''

۲۳ سالہ چکبست کے لیے رشید حسن خاں ایسے سخت گیر نقاد اور محقق کے یہ جملے خود میرے لیے داد کا درجہ رکھتے ہیں اور اطمینان کا باعث ہوئے ہیں کہ میں نے اگر چکبست پر پانچ کتابیں تصنیف کی تھیں تو میں نے کسی غلط شاعر، نقاد اور ادیب کا انتخاب نہیں کیا تھا۔

خاں صاحب کی تازہ تصنیف 'مثنویاتِ شوق' پر ایک دوراز کار بحث اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ نازیبا ہی نہیں بلکہ غلط بھی ہے کیوں کہ اُنھیں کسی شہر، کسی علاقے، کسی ملک، کسی تہذیب سے

ذرہ بھر کھٹک نہیں۔ اُنھیں تو وہی لکھنا ہے جو مآخذ اور قرائن سے ثابت ہے اور بس۔

اس وقت میرے سامنے خاں صاحب کی مرتّب کی ہوئی 'مثنوی گلزارِ نسیم' ہے۔ یہ کتاب ۷۲۴ صفحات پر محیط ہے جب کہ نظم (مثنوی) کے کل اشعار ۱۵۳۱ ہیں جو کتاب کے محض ۸۵ صفحوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ باقی ماندہ ۶۳۹ صفحوں میں اس مختصر مثنوی پر کیا لکھا گیا ہوگا۔ سو عرض ہے کہ اِن لگ بھگ ساڑھے چھ سو صفحوں پر درج ایک حرف بھی ضرورت سے زیادہ نہیں۔ چاروں کتابوں کا یہی حال ہے۔ تشریحات اور فرہنگیں اس درجہ عالمانہ ہیں کہ اگر اُنھیں الگ سے چھاپ دیا جائے تو وہ مستقل حوالے کی کتابیں بن جائیں۔

ایک بات اور بھی عرض کردوں۔ میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ خاں صاحب خشک انسان ہیں۔ اُنھیں شاعری سے کیا لینا دینا۔ وہ شاعروں پر کیوں لکھتے ہیں وغیرہ۔ مگر میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اُنھیں لطافتِ شعری سے گہرا لگاو ہے اور فنِ شعر سے گہری واقفیت ہے۔ وہ عروض کے غوامض و دقائق سے باخبر ہیں اور اُنھیں محاورہ، روزمرہ پر عبور حاصل ہے، اُن کی 'چُپ' سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

اُنھیں حال ہی میں مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے مگر وہ اس سے زیادہ کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ دانشور طبقہ ہر عہد میں ان کے کاموں کی عظمت کا اعتراف واقرار کرے گا اور خاں صاحب کا احسان مند رہے گا۔

اس سے پہلے کہ مضمون ختم کروں خاں صاحب کے خطوں کے بارے میں بھی کچھ بات ہوجائے۔ اب یہ عام طور پر معلوم ہے کہ مکتوب الیہ خطوں کو سنبھال کر رکھتا ہے اور اُنھیں ضائع نہیں کرتا تاکہ بہ وقتِ ضرورت اُنھیں بطورِ سند یا شہادت استعمال کیا جاسکے۔ نتیجے میں مکتوب نگار بھی اُتنا ہی محتاط ہوگیا ہے۔ وہ بھی اپنے خط میں صحیح صورتِ حال لکھنے سے گریز کرتا ہے۔ اس لیے اب خطوں کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی جو رہنی چاہیے تھی۔ چناں چہ خاں صاحب نے مجھے بتایا کہ اب وہ خطوں کو جمع نہیں کرتے بلکہ جواب لکھ دینے کے بعد تلف کردیتے ہیں، کیوں کہ اب اُن کی قدر و قیمت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ بات دل کو لگتی ہے بلکہ ہر اُس شخص کے دل کو لگے گی جسے تحقیق کے فن سے مَس ہے۔ میں بھی اب اسی اصول پر عمل پیرا ہوں۔ میں اب اُنھی خطوں کو فائل میں رکھتا ہوں جن میں کوئی علمی ادبی نکتہ بیان کیا گیا ہو یا جو کسی لحاظ سے دلچسپ ہوں۔

خاں صاحب اپنی معلومات یا کسی عقدے کے حل کی تصدیق کے لیے ڈھیروں خط لکھ ڈالتے ہیں۔ ہر اُس شخص کو خط لکھ دیں گے جس سے معلومات میں ذرا سا بھی اضافہ ہونے کا امکان ہو۔ یہی انہماک ہے جو انھیں دوسرے محققوں اور مرتبوں سے ممتاز کرتا ہے۔

ذیل میں خطوں کے چند اقتباس دیے جاتے ہیں جن سے اُن کا طریقۂ کار اور ان کی مختلف کیفیتیں سامنے آجائیں گی۔

۱۴؍جولائی ۱۹۹۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے 'مثنویاتِ شوق' کو مکمل کرلیا، زیرِ کتابت ہے۔ اب کل سے 'سحر البیانؔ' کو شروع کیا ہے۔ اِدھر اُدھر خطوں کے گھوڑے دوڑا رہا ہوں۔ آپ کے پاس کوئی خطی یا مطبوعہ نسخہ ہے؟''

ایک محقق کے نزدیک اس خط کی اہمیت یہ ہے کہ:

(۱) رشید حسن خاں نے 'مثنویاتِ شوق' کو ۱۴؍جولائی ۱۹۹۶ء سے پہلے مکمل کرلیا تھا اور اب اس کی کتابت ہورہی ہے۔ دوسرے

(۲) یہ کہ مثنوی 'سحر البیان' کی ترتیب کا کام انھوں نے ۱۵؍جولائی (۱۹۹۶ء) سے شروع کیا ہوگا۔

درجِ بالا اقتباس میں نے ایک محقق کے نظریے کی وضاحت کے لیے شامل کیا ہے۔

۵؍دسمبر ۱۹۹۵ء کے خط میں درج ہے:

> ''اب (گلزارِ نسیم) میں بعض مقامات تصحیح طلب رہ گئے ہیں اور کیا کہوں۔ بشریت۔ مندرجہ ذیل مقامات پر اپنے نسخے میں تصحیح کرلیجیے۔ ممنون ہوں گا:
>
> ص ۴۰۵: حاشیہ: ''باپ اپنی بیٹی سے کہتا ہے''
> صحیح صورت: ''ماں اپنی بیٹی سے کہتی ہے''
>
> ص ۴۰۷: سطر ۹: ''نسیمؔ کے استاد بھائی رشک کا شعر
> میں جزوِ اوّل کو قلم زد کرکے صرف
> ''رشکؔ کا شعر'' رکھیے۔ رشکؔ تو ناسخؔ کے شاگرد تھے۔
> معلوم نہیں کس دُھن میں استاد بھائی لکھ گیا......''

اس اقتباس میں کوئی علمی، ادبی نکتہ نہیں۔ یہ اُن کے لیے ہے جن کے پاس 'گلزارِ نسیم' مرتبہ

رشید حسن خاں ہو۔ وہ براہِ کرم اپنے نسخے میں تصحیح کرلیں۔

۶؍دسمبر ۱۹۹۵ء کے خط سے ایک اقتباس دیکھیے:

''زبانی روایتوں نے اور بزرگوں اور واقف کاروں کی مبینہ روایتوں نے جو گُل کھلائے ہیں، اُن سے تو آپ بھی واقف ہیں۔ جب تک قابلِ قبول روایت نہ ملے، بات ناتمام اور مشکوک رہے گی۔ مجھے آپ سے مکمل طور پر اتفاق ہے کہ شہرت کی بے جا خواہش، اب ہوس میں تبدیل ہوتی جارہی ہے اور اس طرح کہ اُسے دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔ آدمی کو جو عزت و شہرت اُس کے کاموں کی بنا پر ملی ہو اُسی پر اکتفا کرنا چاہیے۔

محققین ...... کے حصے میں شروع ہی سے اور ہر جگہ بے قدری آئی ہے۔ یہ سخت جانی کا کرشمہ ہے کہ آپ اور ہم پھر بھی کام کیے جاتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ہم کو اور آپ کو شہرتِ عام ویسے بھی راس نہیں آسکتی اور وہ ہمارے کام کی بھی نہیں......''

۱۹؍جون ۱۹۹۵ء کے خط کی آخری سطریں ملاحظہ کیجیے:

''گلزارِ نسیم تو مدخولہٗ ناشر اور مخزونۂ پریس ہے، معلوم نہیں کب چھپے۔ اس سے مجھے بہت کوفت ہوئی ہے، مگر وہی بات:

بندگی بے چارگی۔ کیا کرسکتا ہوں......''

خاں صاحب یوں تو قابل نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ہی کرتے ہیں مگر کبھی کبھی جھلا بھی اُٹھتے ہیں۔ ۳؍جون ۱۹۹۵ء کے خط کا یہ اقتباس کسی ایسی ہی عارضی جھلاہٹ کا غماز ہے:

''میں خود حیران تھا کہ دونوں شماروں کی رسید نہیں ملی۔ اب معلوم ہوا کہ کیا ہوا تھا۔ سخت بیزار ہوں مگر کیا کروں، چہ تواں کرد مرد ماں ایند۔ یہ نئی نسل حد سے زیادہ بے پرواہے۔ انھیں تو جدیدیت کے سوا اور کچھ راس ہی نہیں آتا......

صاد آنکھوں کی دیکھ پسر کی/ بینائی کے چہرے پر نظر کی

صاد چوں کہ مذکر ہے اس لیے مصرع میں 'صاد آنکھوں کے' کہنا چاہیے مگر 'صاد آنکھوں کی' ہی مشہور ہوگیا ہے''۔

۲۶؍فروری ۱۹۹۳ء کے خط کی آخری چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''اس شعر کی غلط قرأت نے لغت تک میں رسائی حاصل کر لی ہے۔ میں نے اس پر بہت مفصل حاشیہ لکھا ہے۔ داغؔ سے مجھے اتفاق ہے۔ پہلے ہی میں نے اسی طرح لکھا تھا۔ اطمینانِ کلی کے لیے مشورہ کرنا ضروری خیال کیا ہے......''

اس حزم و احتیاط کا جواب نہیں۔ اُن کے کام کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ خاں صاحب کسی کی تعریف نہیں کرتے مگر یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ آپ کوئی اچھا کام کر کے تو دکھایئے؟ ادھورے اور خام کام پر اُن سے داد لینا ممکن نہیں۔

۲۸؍ مارچ ۱۹۹۲ء کے ایک خط میں میری کتاب موصول ہونے پر لکھتے ہیں:

''انتخاب کا تحفہ مل گیا۔ اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں ...... آپ کی کاوش قابلِ داد اور سزاوارِ تحسین و آفرین ہے۔
جی خوش ہو گیا اِسے دیکھ کر......''

اس سے پہلے کا ایک خط مورخہ ۲۴؍ جون ۱۹۹۳ء بھی اسی زمرے میں آتا ہے، لکھتے ہیں:

''کتابوں کا تحفہ ملا تھا۔ افریقہ سے متعلق کتاب جو پڑھنی شروع کی تو دلچسپی نے اُسے ختم کرنے سے پہلے رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ جی خوش ہو گیا۔ اس لطفِ خاص کے لیے شکر گزار ہوں......''

اس سے بھی پہلے ۲۲؍ ستمبر ۱۹۹۲ء کو لکھتے ہیں:

''بے صبر والی کتاب مل گئی۔ آپ کام تو ہمیشہ سلیقے سے کیا کرتے ہیں اور اس کی نمود اس میں بھی ہے اور خوب ہے......''

۱۴؍ دسمبر ۱۹۹۱ء کے خط سے بھی یہ چند سطریں دیکھ لیجیے:

''مجھے جوشؔ ملسیانی سے متعلق کتاب خاص کر پسند آئی۔ غالبؔ پر تو لکھا جاتا رہے گا، مگر ایسے باکمال اساتذہ کو ہم سب بے طرح بھلائے بیٹھے ہیں۔ آپ کی اس کتاب سے مرحوم کی یاد دلوں میں تازہ ہو جائے گی اور یہ بڑی بات ہے......''

۲؍ مئی ۱۹۸۹ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

''بہ ہر طور، آپ کی عرق ریزی اور جاں فشانی کا تو پہلے سے قائل ہوں، اب ان کتابوں کو خاص کر 'دیوانِ غالب' کو پڑھ کر اور قائل ہو جاؤں گا۔

اب اس طرح کام کرنے والے ہمارے پاس کتنے آدمی ہیں؟ انگلیوں پر گنے جانے کے بہ قدر بھی تو نہیں ......''

اب چند خطوں میں اس 'خشک انسان' کی زندہ دلی اور شوخی بھی ملاحظہ کیجیے:

۸؍جولائی ۱۹۹۲ء:

''ایک پیکٹ ملا تین کتابوں کا، جس پر تین نام لکھے ہوئے ہیں، یعنی میرا نام کسی دانے پر نہیں ......''

۱۰؍دسمبر ۱۹۹۶ء:

چوں کہ آپ آسمانی بزرگوار اللہ میاں عرف بھگوان صاحب کی شرن میں رہتے ہیں، اس لیے یقین ہے کہ بہ عافیت ہوں گے ......''

۴؍فروری ۱۹۹۷ء:

''آپ جیسے کام کرنے والے کا یہ حال، مگر ایسا شروع سے ہوتا رہا ہے، شرفاے ادب پریشاں خاطر رہے ہیں یا پریشاں حال۔ میرے اور آپ کے ممدوح کے مطابق: موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں ......''

میں نے شاید لکھا ہوگا کہ مختلف عارضوں میں گھرا رہنے کی وجہ سے اب مزید کام سے دست بردار ہوا چاہتا ہوں۔ جواب میں ۲۹؍مئی ۱۹۹۷ء کو تحریر فرماتے ہیں:

''دیکھیے صاحب! ادبی کاموں کی چِیٹک لگ جائے تو پھر چھوٹتی نہیں اسے بھی آتشک کا مرض سمجھیے۔ آپ کیسا ہی عہد کرلیں اور پیمان باندھیں، کریں گے وہی ادبی کام، ضرور بالضرور، آپ رہ نہیں سکتے میرا احوال بھی یہی ہے۔ اس لیے آپ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اُسے 'تصوف براے شعر گفتن خوبست' کے ذیل میں رکھتا ہوں:

اُس پر یقین ہے......''

مثنوی 'سحرالبیان' کی ترتیب کے دوران میں اُنھیں فنِ موسیقی کے باب میں بڑی کھکھیڑ اٹھانی پڑی۔ ۱۶؍دسمبر ۱۹۹۷ء کے ایک خط کا آخری حصہ پیش قارئین ہے (مثنوی 'سحرالبیان' کا ایک شعر ہے):

''کوئی فن میں سنگیت کے شعلہ رو
برم جوگ پچھی کی لے پر ملو

یہاں میں بالکل پیدل ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر حسنؔ بھی موسیقی سے
میری ہی طرح واقف تھے۔ برم اور جوگ کو تو معنی پہنا لیے کہ یہ طبلے کی
دو تالیں ہیں، مگر 'پچھی' سمجھ میں نہیں آیا اور پُر ملو تو ایک کلاسکی رقص ہے۔
اس کا یہاں کیا کام......

ارے صاحب! میں تو پھنس گیا ہوں، کچھ سوچیے اور کچھ تاویل کیجیے
اور ان لفظوں کے صحیح معنی اختصار کے ساتھ لکھ دیجیے۔ خاص کر پچھی کے۔
اور دوسرے مصرعے کی چول کیسے بیٹھے گی۔ آپ کے جواب کے لیے چشم
بہ راہ ہوں۔ آپ کی ستار نوازی کب کام آئے گی......"

میں نے خاں صاحب کے ادبی خطوں کا عمداً ذکر نہیں کیا ہے کیوں کہ وہ خاصے طویل اور دقیق ہیں۔ یوں بھی 'رشید حسن خاں' ایک مستقل اور وسیع موضوع ہے۔ اُس پر تفصیلی گفتگو کبھی آئندہ کی جائے گی، فی الحال اتنا ہی۔

ooo

شمیم حنفی

'گلزارِ نسیم' مرتّبہ رشید حسن خاں

پچھلے کچھ برسوں میں کلاسیکی ادب کی طرف عام توجہ میں جو تیزی آئی ہے اسے دراصل ایک تہذیبی نشاۃ ثانیہ یا نئی ذہنی بیداری سمجھنا چاہیے۔ لوگ اپنے ماضی سے غافل ہوتے ہیں تو اپنے حال کے بھی نہیں رہ جاتے۔ تمام مہذب معاشروں کی تخلیقی توانائی اور اور جمالیاتی وجدان کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اُس معاشرے کے لوگ اپنی روایت کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ کس طرح سوچتے ہیں؟ تاریخ کو ایک جامد مظہر کے طور پر دیکھتے ہیں یا اسے اپنے لیے فیضان کا ایک سرچشمہ بناتے ہیں؟ اُن کے اجتماعی حافظے میں ماضی کن سطحوں پر زندہ رہتا ہے؟ اور اُن کے شعور میں گزرے ہوئے، دور افتادہ تجربوں کی حیثیت کیا ہوتی ہے؟

ادب کے نئے طالب علموں کو ادھر نئے سرے سے اپنی کلاسیکی کتابوں اور نظم و نثر کی قدیم صنفوں کے واسطے سے اپنے تہذیبی رویوں کو سمجھنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ 'شعر شور انگیز'، 'باغ و بہار'، 'فسانہ عجائب'، 'مرثیہ خوانی کا فن'، 'مثنویاتِ شوق' جیسی کتابیں جب نئے زمانے کی حقیقتوں سے دوچار اور نئی حسیت کے مسائل میں الجھے ہوئے اساتذہ اور طلبا کے ساتھ نظر آنے لگیں تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری اجتماعی زندگی میں ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے اور اندر ہی اندر ہمارے تبدیل ہوتے رہنے کا سلسلہ جاری ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ایک مضمون (نیا ادب اور پرانی کہانیاں) میں تہذیبی ماضی سے بڑھتے ہوئے شغف کو شخصیت کے گم شدہ عناصر کی پناہ گاہ یا بازیافت کے طور پر دیکھا تھا۔ یاد کیجیے، سنہ سینتالیس کے فوراً بعد کا ماحول جس میں سیاسی واردات نے غیر معمولی اتھل پتھل پیدا کی تھی لیکن کس طرح اسی کے ملبے سے ماضی کے ایک نئے احساس کا ظہور ہوا۔ محمد حسن عسکری، سلیم احمد،

جیلانی کامران، انتظار حسین، ناصر کاظمی، منیر نیازی سے لے کر محمد سلیم الرحمٰن، سہیل احمد، نیر مسعود، شمس الرحمٰن فاروقی تک ہمارے تہذیبی اور ثقافتی رویوں کی ایک لمبی روداد پھیلی ہوئی ہے۔

مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا ہے کہ تمہید پھیلتی جا رہی ہے اور اب مجھے اپنے اصل موضوع، رشید حسن خاں کی مرتبہ گلزارِ نسیم (ناشر: انجمن ترقی اردو) کے بارے میں گفتگو شروع کر دینی چاہیے۔ لیکن میرے لیے پچھلے دس بارہ برسوں کے عرصے پر پھیلی ہوئی اُن تمام علمی خدمات اور سرگرمیوں کو دیکھنا اور سمجھنا، جن سے رشید حسن خاں کا نام جڑا ہوا ہے اسی سطح پر اور اسی پس منظر میں بامعنی بنتا ہے۔ ہم اپنے اجتماعی مذاق، مزاج اور شعور کو ڈی کولونائز کیے بغیر آج کی دنیا میں اپنے ماضی یا اپنی حسیت کے گم شدہ سانچوں کی معنویت پر غور نہیں کر سکتے۔ تحقیق کے کاروبارِ شوق سے ادب کے تربیت یافتہ لیکن عام قارئین کو جو دوری اور ناصبوری کا احساس ہوتا ہے تو اسی لیے کہ تحقیق عام قاری کے لیے ایک تجربہ یا واردات نہیں بنتی۔ تجسس کا ذوق اور انجانی، اندیکھی حقیقتوں تک جا پہنچنے کا شوق اپنی جگہ پر، مگر ادبی اور تخلیقی دستاویزوں کے ذریعے عام قاری دراصل اپنے آپ کو اپنی دنیا کو یا ماضی سے حال تک پھیلے ہوئے اس پورے سلسلے کو سمجھنا چاہتا ہے جس کے بغیر اپنے آپ تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ زندہ شخصیتیں اور زندہ قومیں اسی تناظر کے ساتھ اپنی شناخت متعین کرتی ہیں۔ کم سے کم اتنا ہر شخص جانتا ہے کہ سوویت یونین میں انقلاب کے بعد ادب پڑھنے والوں کا جو بے مثال معاشرہ سامنے آیا، اس میں نظریاتی اور سیاسی سخت گیری کے باوجود کلاسیکی ادب کے شہ پاروں سے شغف میں بھی اضافہ ہوا۔ ایک مختلف سطح پر کچھ ایسی ہی صورت حال ہمیں اردو معاشرے میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ایک طرف تو ادب پڑھنے والوں کا دائرہ سمٹ رہا ہے، مگر دوسری طرف کلاسیکی سرمائے کی قدر و قیمت کا احساس اور اپنے ماضی کو پھر سے سمجھنے کا شوق بھی بڑھ رہا ہے۔ اس معاملے میں ''خدائے تحقیق یا تدوین'' قسم کی مبالغہ آمیز اور تقریباً بے معنی ترکیبوں کے استعمال سے بچ کر بھی دیکھا جائے (تخلیق کاروں کی بات اور ہے مگر تنقید اور تحقیق میں اس خوش عقیدگی کی گنجائش نہیں) تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ رشید حسن خاں کے کارنامے بہت وقیع ہیں اور جن حدود کے اندر رہتے ہوئے انھوں نے 'باغ و بہار'، 'فسانہ عجائب'، 'مثنویاتِ شوق'، 'گلزارِ نسیم' (اور اب تو 'مثنوی سحرالبیان' بھی) کے مطالعات اور ان کے بارے میں معلومات مرتب کیے ہیں،

وہاں اردو تحقیق کے میدان میں اُن کا کوئی بدل اس وقت نہیں ہے۔

رشید حسن خاں نے جس وسیع و عریض سطح پر، 'گلزارِ نسیم' سے قطع نظر کلاسیکی ادب کے بعض دوسرے شاہ کاروں کی تدوین اور ترتیب کا کام انجام دیا ہے اور ان شاہ کاروں کی تفہیم کا راستہ ہموار کیا ہے اُس کی مثالیں (اُن سے پہلے بھی) انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ ڈاکٹر زور (کلیات قلی قطب شاہ)، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب (دیوانِ فائز) پروفیسر نورالحسن ہاشمی (کلیات ولی) اور مولانا عرشی (دیوانِ غالب) کی جیسی دقت نظر تفحص اور جاں کاہی علاوہ برایں تحقیق و تلاش کے صبر آزما عمل میں بھی خوش مذاقی اور حظ آفرینی کی ایک اعلا سطح کو قائم رکھنا، ہمارے زمانے کے معدودے چند علمائے ادب کے حصے میں آیا ہے۔ کلاسیکی ادب کے شاہ کاروں پر یادگار قسم کے مقدمے تو ایسے اصحاب نے بھی لکھے ہیں جو تحقیق کی دنیا کے آدمی نہیں تھے۔ مثال کے طور پر محمد حسن عسکری کا مقدمہ 'طلسم ہوش رُبا' کے انتخاب پر یا ممتاز حسین کا مقدمہ 'باغ و بہار' پر، یا آتش کے کلام پر خلیل الرحمٰن اعظمی کا مقدمہ یا پھر مولوی عبدالحق کے مقدمے۔ ان میں سے کئی مقدموں کی فکری اور تجزیاتی سطح اردو کے بیشتر معروف محققین کے مطالعات کی عمومی سطح سے بلند تر ہے اور ان سے ہمارے علم ہی میں نہیں، ہماری بصیرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ان سے ذہنی مشقت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق اور وجدان کی سرگرمی کا پتا بھی چلتا ہے۔ خبر کے علاوہ نظر کی گہرائی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اور ادب کے عام قاری انھیں جس شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں اس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تحریریں کلاسیکی ادب سے دلچسپی میں عام اضافے کا سبب بنی ہیں۔ رشید حسن خاں کی بنیادی حیثیت محقق کی ہے لیکن ان کی تحقیقات کے یہ نمونے صرف محققوں کے کام اور مطلب کے نہیں ہیں۔ ہمارے محققوں میں ایسے برگزیدہ اصحاب بھی گزرے ہیں جو ایک بھی ایسے لقمے کے روادار نہیں ہوتے تھے جو کام و دہن کو لذت بخش سکے۔ ان کی تحریروں میں ایک بھولا بھٹکا دل چسپ فقرہ، ایک جملہ ایسا کہ دماغ کو منور کرسکے ایک ایسی بات جو چھان بین کی محنت کے بجائے تفہیم اور تعبیر کی بصیرت سے نمودار ہوئی ہو، نموننۃً کبھی نظر نہیں آتی۔ ہر چند کہ ایلیٹ نے دل چسپ لیکن گمراہ کرنے والی تنقید کے مقابلے میں معمولی سے معمولی تحقیق کو بھی کارآمد بتایا ہے مگر تحقیق بھی بامعنی اسی صورت میں بنتی ہے اور ادب شناسی کے عمل میں موثر رول اسی وقت ادا کرسکتی ہے جب وہ ہمارے تخلیقی ادراک پر اثر انداز ہوسکے اور اس کے واسطے سے ہم اپنے ادبی رویوں یا ترجیحات یا

فیصلوں کو بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔ ایسی تحقیق اور تنقید جس کے علاقۂ ہدف میں صرف محققین اور ناقدین پائے جائیں ادب کے عام قارئین کی دلچسپی کا مرکز نہیں بنتی۔ رشید حسن خاں کی تحقیق نے اس ممنوعہ اور مخصوص علاقے سے آگے، عام پڑھنے والوں کی طرف جانے کا راستہ بھی دکھایا ہے۔

اس نکتے کی وضاحت اور اس مسئلے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ہمیں 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب'، 'مثنویاتِ شوق' کے پس منظری مواد، توضیحات، اشارات، مقدموں اور فرہنگوں پر ٹھہر ٹھہر کر نظر ڈالنی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام معاملات ایک مختصر سے مضمون میں سمیٹے نہیں جا سکتے اس لیے اب میں اپنے آپ کو صرف گلزارِ نسیم تک محدود رکھوں گا۔

یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ جس سال گلزارِ نسیم (مرتبہ رشید حسن خاں) کی اشاعت عمل میں آئی (۱۹۹۵ء) اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے مجھے لاہور سے ٹالسٹائی کے جنگ اور امن کی اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل وہ دونوں جلدیں موصول ہوئی تھیں جن کے اردو ترجمے، مقدمے، تاریخ اور ثقافتی پس منظر، تلمیحات کی وضاحتوں اور نقشوں فرہنگوں اور اشاروں کو یکجا کرنے کا بوجھ تنِ تنہا ایک شخص (جناب شاہد حمید) نے اٹھایا ہے۔ (اشاعت ۱۹۹۳ء) یہ کام اپنی وسعت نظر، کثیر الجہتی اور معیار کے اعتبار سے اس پائے کا تھا کہ اس کی نظیر یورپ کی ''ترقی یافتہ'' زبانوں میں بھی کم ملتی ہے۔ اسی طرح، اوکسفورڈ یونی ورسٹی پریس نئی دلی کی طرف سے شائع ہونے والا (۱۹۹۹ء) چودھری محمد نعیم کا کیا ہوا 'ذکرِ میر' کا انگریزی ترجمہ، ترجمے کی غیر معمولی سطح اور اوصاف سے قطع نظر اپنے ضمیموں، حاشیوں، وضاحتوں، متعلقہ اطلاعات کے بیان، تاریخی اور دستاویزی نوعیت کی معلومات، اپنی مرتبہ فرہنگ آخذ اور مصادر کی تفصیل اور ذہین بصیرتوں سے معمور مقدمے کی بنا پر اردو کے حالیہ علمی اور ادبی سرمائے میں ایک بیش قیمت اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان حقائق کی نشاندہی کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ ایک طرف جہاں اردو معاشرہ، اردو والے اور اردو سے متعلق علمی اور ادبی سرگرمیاں ایک مسلسل زوال اور سوقیت کے نرغے میں ہیں وہیں ایسے اصحاب بھی موجود ہیں جو اپنی خلوت نشینی کا اعتبار سنبھالے ہوئے ہیں اور ہر طرح کے بازاری پن سے دور اپنے علمی مشاغل میں منہمک ہیں۔ بڑے علمی اور ادبی کارنامے اس استغراق، منصب کے اس شعور، علم کے وقار اور اس کے تقاضوں سے ایسی شدید وابستگی کے بغیر وجود میں نہیں آتے۔ عبرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ سنجیدہ اداروں سے بھی اب اس قسم کا مواد آئے دن

شائع ہوتا رہتا ہے جس کی نوعیت مذموم اسباب مبتذل اور سرشت غیر سنجیدہ ہوتی ہے۔ رشید حسن خاں مزاجاً راہب نہیں، مگر دلّی کے پُر شور ماحول میں برسوں تک رہتے ہوئے اور اب اپنے خاموش، الگ تھلگ قصباتی مزاج رکھنے والے شہر میں زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے علمی تحقیق و تجسس، مطالعے اور جائزے کی جو بلند اور وقیع سطح قائم کی ہے اسے دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ دلّی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے ان کی وابستگی کا پورا دور حوصلہ شکن حالات اور وسائل کے باوجود جس رکھ رکھاؤ، تمکنت اور علمی و ادبی شوق کے ساتھ گزرا، اس کی تہہ سے نمودار ہونے والی سنہری فصلیں خاص کر پچھلے نو دس برسوں میں جوان ہوئی ہیں۔ ان کے مرتبہ 'باغ و بہار' (۱۹۹۲ء) کی اشاعت سے جو سلسلہ کلاسیکی متون کی نئی ترتیب و تدوین تعبیر اور تفہیم کا شروع ہوا تھا وہ ابھی جاری ہے اور اس کا سب سے بڑا فائدہ اجتماعی لحاظ سے، یہ ہوا ہے کہ ہم اپنے خستہ و شکستہ ادبی معاشرے میں اپنے تہذیبی ماضی اور صدیوں پر پھیلی ہوئی روایت کی نشاۃ ثانیہ کے آثار دیکھ رہے ہیں۔

'گلزارِ نسیم' کی اہمیت صرف اس لیے نہیں کہ اردو کی سب سے معروف اور برتر مثنویوں میں اس نظم کی ایک منفرد جگہ ہے، یہ مثنوی مشرقی طرزِ احساس اسالیب اور ہند اسلامی روایات کے باہمی انضمام کی ایک قیمتی دستاویز بھی ہے۔ زیرِ نظر نسخے میں مثنوی کا اصل متن صرف چھیاسی صفحوں پر مشتمل ہے جب کہ اس اشاعت کی مجموعی ضخامت سات سو چوبیس (۷۲۴) صفحات کی ہے، گویا کہ ایک سو چوبیس صفحات پر پھیلے ہوئے عزت اللہ بنگالی کی فارسی متن کو (جو اس نسخے میں شامل ہے) الگ کر کے بھی دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس کتاب کے پانچ سو سے زائد صفحے رشید حسن خاں کی اپنی چھان بین، پرکھ اور مباحث کا احاطہ کرتے ہیں۔

مقدمے کے ڈیڑھ سو صفحوں میں گلزارِ نسیم کی ادبی اور نصابی اہمیت، قصے سے وابستہ روایات، اس کے اجزا، اس کے تمثیلی پیرائے، پھر دیا شنکر نسیم کے سوانح اور ادبی خدمات؛ اس کے بعد گلزارِ نسیم کے مختلف نسخوں، قصہ گل بکاولی کی فارسی روایت، فارسی متن کے نثری اردو ترجمے (مذہب عشق از منشی نہال چند لاہوری) کی نوعیت اور دیگر متعلقات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ گلزارِ نسیم کے واسطے سے شرر اور چکبست کے معروف معرکے کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس معاملے میں رشید حسن خاں نے حزم و احتیاط کا پہلو مستقلاً پیش نظر رکھا ہے اور شرر کے ساتھ ساتھ چکبست کے رویّے کی تہہ میں جو عناصر کارفرما تھے ان کا

جائزہ مکمل غیر جانبداری کے ساتھ اور براہین و دلائل کی بنیاد پر پیش کیا ہے۔ اس پورے قضیے کی بابت رشید حسن خاں کی مجموعی رائے کیا تھی، اس کا اندازہ ذیل کے چھوٹے سے اقتباس سے ہو جاتا ہے:

"(مولانا عبدالحلیم شرؔر) کے تبصرے کو پڑھ کر صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ چکبستؔ کا لکھا ہوا مقدمہ ہمہ وقت اُن کے سامنے رہا ہے۔ شرؔر نے زبان اور بیان سے متعلق بہت سے اعتراض کیے اور بھی بہت کچھ لکھا۔ مولاناؔ کے قلم نے بھی احتیاط کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا۔ چکبستؔ نے اس تبصرے کا مفصّل جواب لکھا جس میں ہر اعتراض کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ پھر جو بحث شروع ہوئی تو دونوں طرف سے ایسی تحریریں بھی لکھی گئیں جن کو پڑھ کر معقولیت کا سر جھک جاتا ہے اور شائستگی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اس سلسلے میں اودھ پنچ میں بہت کچھ لکھا گیا، اور بیش تر تحریریں بیان کی شایستگی اور علمی سنجیدگی سے محروم ہیں۔"

رشید حسن خاں نے اس معرکے کے محرکات کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ انھوں نے فروری ۱۹۰۳ء کے "کشمیر درپن" میں چھپنے والے چکبستؔ کے ایک مضمون "پنڈت دیا شنکر نسیم" کی طرف توجہ دلائی ہے جس میں کہیں براہِ راست، کہیں بالواسطہ طور پر چکبستؔ نے لکھنؤ کے بعض معروف شاعروں (مثلاً امانتؔ اور شوقؔ قدوائی) کو تضحیک کا نشانہ بنایا تھا۔ چکبستؔ نے اسی پر قناعت نہیں کی تھی، اُن کی زد میں صبا، رند، خلیلؔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے ناسخؔ بھی آ گئے ہیں۔ آتشؔ کے ساتھ اتنی رعایت ضرور برتی کہ انھیں نسیمؔ کے برابر کا شاعر کہہ کر چھوڑ دیا۔ دوسری طرف چکبستؔ کے جواب میں جو انداز اختیار کیا گیا اس کی بنیادیں بھی صاف نہیں تھیں اور سخن فہمی پر طرف داری سے زیادہ تعصب کا رویہ غالب تھا۔

گلزارِ نسیمؔ کے قصے کی یہ ایک افسوس ناک کڑی ہے۔ اس ایڈیشن کے ضمیمہ و تشریحات میں رشید حسن خاں نے (ص ۲۴۷ تا ۵۲۰) جس شرح و بست کے ساتھ زبان اور بیان کے نکات پر بحث کی ہے اس سے لغات، لفظیات اور صناعت کے بہت سے باریک پہلو ابھرتے ہیں۔ موجودہ دور کہ جب تعلیم کے اعلا مراکز، خاص طور پر یونیورسٹیوں میں لسانی فنی اور ذوقی تربیت کا رجحان معدوم ہوتا جا رہا ہے، رشید حسن خاں کی یہ دیدہ ریزی اردو کے طلبا (اور ان سے زیادہ اساتذہ) کے لیے ایک مدرسۃ الاصلاح کی حیثیت رکھتی

ہے۔ یوں بھی بنیادی متن پر اعراب کی نشان زدگی، تلفظ و املا کی تفصیلات اور فرہنگ پر مبنی ضمیمے (ص ۵۲۱ تا ۶۰۰) کی شمولیت نے اس ایڈیشن کو ایک مکمل، قائم بالذات اور نہایت کارآمد نسخے کی حیثیت دے دی ہے۔ لفظوں کے معنی، پھر معنی کے معنی کا مسئلہ تخلیقی زبان کی سطح پر ایک ساتھ کئی جہتیں رکھتا ہے اور کبھی کبھی یہ مسئلے لغات کی مدد سے حل نہیں ہوتے۔ تکثیرِ معنی کے مضمرات تک رسائی کے کئی راستے جدید علوم اور جدید تنقید نے کھولے ہیں۔ صرف کلاسیکی اصولوں اور ضابطوں کی مدد سے یہاں تک پہنچنا آسان نہیں کیوں کہ تخلیقی تجربے، اظہار اور اسلوب سے وابستہ بہت سے سوال تفہیم وتعبیر کے روایتی طریقوں کی گرفت میں نہیں آتے۔ یہ قدیم شعریات اور جمالیاتی قدروں کی حدِ اختیار سے آگے ہیں۔ رشید حسن خاں نے اس قسم کے سوالات کو اپنے جائزے کے حدود سے بالعموم باہر رکھا ہے۔ اسی طرح مقدمے کے بعض بیانات مزید تفصیل اور تعبیر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

(الف) رعایت لفظی اور اختصار، ان میں کتنا ہی حسن ہو، یا پیدا کیا جائے؛ مثنوی کی صنف میں اور ان میں ایک طرح کا بیر ہے۔ اور سب حُسن پیدا ہو جائیں گے؛ مگر جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور محاکات، جو مثنوی کے اہم اجزا ہیں، اُن کا رنگ اڑ جائے گا۔

(ب) اس مثنوی (گلزارِنسیم) کے اشعار میں چمک ہے، فن کاری کا کمال ہے، دل کشی ہے؛ لیکن تاثیر کی گرمی نہیں۔

(ج) اندر کی بد دعا سے "شراپ" کا وہ تصور بھی سامنے آجاتا ہے جس کی کارفرمائی ہندو اساطیری روایت میں بہت ملتی ہے۔ جنس کی تبدیلی کے ایک ذیلی قصّے نے ایک قدیم ہندوستانی اساطیری روایت کی نشاندہی کی ہے۔

(د) تمثیل کے انداز میں کسی داستانی بیان کے ظاہری اجزا کی باطنی تفسیر کی گئی ہے۔

(ہ) (گلزارِنسیم کی اہمیت یہ ہے کہ جس چیز کو "لفظی مناسبت" کہتے ہیں اور رعایت لفظی سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی کرشمہ کاریاں (اس نظم کے واسطے سے)

سامنے آسکیں گی جن کی مدد سے اس عمل کی خوبی کو (اور خامی کو بھی) اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔

(و) جو لوگ رعایت لفظی، مناسبات لفظی اور ضائع لفظی و معنوی کے نظام سے ناواقفِ محض ہیں، ایسے سادہ خیال اور کم نظر حضرات اس نثری شاہ کار (باغ و بہار) کے بیشتر جملوں اور عبارتوں کے حقیقی حسن کو نہیں سمجھ پائیں گے۔

(ز) لفظوں میں معنی و مفہوم کے لحاظ سے جو کثیر الجہاتی ہوتی ہے، اُس کے بھی کئی پہلو ہوتے ہیں۔ میں یہاں ایسے صرف دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کروں گا۔

(ح) (نسیم) کا خاص انداز پانچ اجزا سے مرکّب ہے۔ (۱) [بیان کا] اختصار۔ (۲) [لفظی مناسبتوں اور رعایتوں کی مدد سے] مفہوم میں پہلو داری۔ (۳) [لفظی اور معنوی صنعتوں کے واسطے سے] حسنِ بیان میں اضافہ۔ (۴) [نئے پن سے معمور] تشبیہیں۔ (۵) [بیان کا استحکام یعنی] بندش کی چُستی۔

ان میں کئی باتیں بحث طلب ہیں اور اختلاف کی گنجائش رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہی کہ بیان کے اختصار سے جذبات نگاری یا واقعہ نگاری کا رنگ اڑ جائے گا (اقتباس الف)، یا یہ کہ 'گلزار نسیم' میں فن کاری کا کمال ہے، لیکن تاثیر کی گرمی نہیں (اقتباس ب)، یا یہ کہ رعایت، مناسبت اور ضائع کے نظام سے ناواقف لوگ عبارتوں کے حقیقی حسن کو نہیں سمجھ پائیں گے۔ (اقتباس و)۔ ظاہر ہے کہ بیان کے ایجاز اور اختصار سے جذبے یا واقعہ نگاری کا حسن کا بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ اور تاثیر کی گرمی دراصل اعلا درجے کی فن کاری ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسرے اقتباسات (ز، ح، ج، د اور ہ) میں جو مفروضے قائم کیے گئے ہیں اُن پر ادب کے جمالیاتی، تہذیبی، عمرانیاتی اور نفسیاتی تناظر میں تفصیلی بحث کے بغیر، اُنھیں کلّیوں اور قوانین کی طرح قبول کر لینا نہ تو ممکن ہے نہ مناسب۔ غالباً جیلانی کامران نے ایک مضمون میں 'گلزار نسیم' کے تصوراتی اور تہذیبی مضمرات سے متعلق کئی اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ گلزارِ نسیم کی جمالیاتی قدر و قیمت کے بارے میں افتخار جالب نے بھی ایک مضمون میں کچھ ایسے نکات کی نشان دہی کی تھی جو ہمیں اس پیچ دار نظم

کے روایتی جائزوں میں نہیں ملتی۔ اصل میں کلاسیکی ادب کے شہ پاروں کی جانب ہمارا عام روّیہ یہی رہا ہے کہ اکثر سامنے کی اور سطح کے اوپر کی حقیقت اور بار بار کی دوہرائی ہوئی خصوصیات سے آگے ہم جدید تر علوم، نظریوں اور فلسفوں کی بخشی ہوئی بصیرت سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ نتیجتاً دلچسپ اور معلومات سے معمور ہونے کے باوجود بہت سے مطالعے انسانی واردات اور تخلیقی تجربے کے مبہم، پیچیدہ اور اسرار آمیز عناصر کو گرفت میں لینے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ کلاسیکی ادبیات کی تفہیم وتعبیر کا ایک زاویہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انھیں ماضی میں مروج اور مقبول ضابطوں سے آگے بڑھ کر حالیہ تجربوں اور حقیقتوں اور روّیوں کی مدد سے بھی سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ایلیٹ کے اس بیان کا کہ نئی حسیّت اپنے حال اور مستقبل پر اثر انداز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی گزشتہ تاریخ اور اپنے ماضی کا مفہوم تبدیل کردینے کی طاقت بھی رکھتی ہے، ایک مطلب یہ بھی ہے صرف ماضی ہی حال کو متاثر نہیں کرتا، حال کے واسطے سے بھی ماضی کی ایک نئی تصویر مرتب کی جاسکتی ہے۔

مگر، یہ بات بھی اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ تخلیقی ادب کا کوئی بھی جائزہ چاہے جتنا ہشت پہلو اور مفصل ہو، کسی فن پارے کے تمام مضمرات کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ چناں چہ رشید حسن خاں نے بھی ایک معیّنہ دائرے کے اندر اس صبر آزما بلکہ ہوش ربا اور وسیع پیمانے پر ہمارے کلاسیکی ادب کے بعض شاہ کاروں کی تدوین، تفہیم اور تحسین کا بیڑا اٹھایا ہے اور اپنی دیکھی بھالی دنیا میں اُن کی مہم جوئی بے شک غیر معمولی اور لاثانی ہے۔ بڑے اداروں اور اعلا تعلیم کے مراکز میں ان دنوں جو کلچر فروغ پا رہا ہے، خاص کر ہماری اپنی زبان و ادب کے نام پر، اس سے کوئی امید بندھتی نہیں، بلکہ رہا سہا حوصلہ بھی ٹوٹتا ہے۔ ادب جب دینوی مناصب کے حصول کا ذریعہ بن جائے اور ادیب اشتہاری کمپنیوں، مرکنٹائل اداروں اور Show-biz کے نمائندے نظر آنے لگیں تو اس لمحے میں ہمیں ادب کے حشر سے ڈرنا چاہیے۔ اس طوفانِ بے تمیزی میں رشید حسن خاں اور ان کے جیسے گنے چنے افراد کا دم بہت غنیمت ہے۔ ہمیں انجمن ترقی اردو (ہند) کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے یکے بعد دیگرے، خاں صاحب کی کئی ضخیم کتابوں کی اشاعت کا ذمہ لیا ہے ورنہ تو تجارتی اور کاروباری قسم کے مواد سے ہٹ کر پبلشنگ، وہ بھی اردو پبلشنگ کے بارے میں کیا کہا جائے اور کس سے کہا جائے؟ اردو اور اہلِ اردو واقعی مشکل میں ہیں!

~~~~~
~~~~~

پروفیسر گیان چند جین

خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویاتِ شوق

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ رشید حسن خاں اردو کے خدائے تدوین ہیں۔ 'فسانۂ عجائب'، 'باغ و بہار' اور 'مثنوی گلزارِ نسیم' کے بعد اُن کا چوتھا شاہکار 'مثنویاتِ شوق' ۱۹۹۸ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا۔ اسے بابائے اردو مولوی عبدالحق سیریز نمبر۴ کہا گیا ہے۔ اس سیریز کی پہلی تین کتابیں کون سی ہیں مجھے معلوم نہیں۔ تدوین کے اس کارنامے کو مولوی عبدالحق سیریز کیوں کہا گیا، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ مولوی صاحب نے بلاشبہ اردو کی غیر معمولی خدمات کیں، قدیم ادب کی متعدد کتابوں کو ترتیب دیا لیکن ان میں کوئی بھی کام غیر معمولی نہیں۔ رشید حسن خاں کے معیار کی کوئی تدوین ہے تو وہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ہے۔ اس سیریز کو مولانا عرشی سے معنون کیا جاتا تو بہتر ہوتا لیکن حقیقت سے آنکھیں چار کرنے میں تامل کیوں؟ اس سیریز کو سیدھا سادہ رشید حسن خاں سیریز کہا جاتا تو ایک حقیقتِ جلی کا اعتراف ہوتا۔

'مثنویاتِ شوق' کے مختصر تعارف میں ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہیں:

> ''متنی تنقید پر میری تھوڑی بہت نظر ہے، اس لیے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو میں رشید حسن خاں کے پایے کا کوئی اور متنی نقاد ابھی تک پیدا نہیں ہوا...... وہ متن کا جس طرح تنقیدی ایڈیشن تیار کرتے ہیں، وہ کوئی اور نہیں کر سکتا''۔

مجھے اس فیصلے سے کامل اتفاق ہے، اتفاق نہیں ہے تو اُن کی اصطلاحوں: متنی تنقید، متنی نقاد اور تنقیدی ایڈیشن سے۔ آپ چاہیں نہ چاہیں اردو میں تحقیق اور تنقید میں فرق کیا جاتا ہے۔ کیا

ضرور ہے کہ انگریزی اصطلاح Textual Critcism کا لفظی ترجمہ متنی تنقید کیا جائے، اسے تدوینِ متن اور یہ کام کرنے والے کو مدونِ متن کہنا چاہیے۔ تنقیدی ایڈیشن کو تحقیقی ایڈیشن کہا جائے تو صحیح تر ہوگا۔ میں نے ایک یونیورسٹی میں امتحان کے ایک پرچے کو موڈریٹ کرتے ہوئے دیکھا کہ ممتحن نے سوال کیا تھا ''ذیل کی عبارت کی (یا شاید اشعار کی) متنی تنقید کیجیے''۔ یہ نتیجہ ہے غلط اصطلاح ڈھالنے کا۔

رشید حسن خاں کے جملہ تدوینی کام مولانا عرشی کی تدوینات سے بھی بھاری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مستقبل میں بہت عرصے تک خاں صاحب کے پایے کا دوسرا مدوّن سامنے نہ آسکے گا، اسی لیے میں انھیں خدائے تدوین کہتا ہوں، کوئی آزردہ ہوتو ہوا کرے۔

رشید حسن خاں کلاسیکی علوم کے ماہر ہیں۔ اُن کے پہلے تین کارناموں کے بعد چوتھے کام کے لیے 'مثنویاتِ شوق' کے انتخاب کی اطلاع پاکر میں سوچتا تھا کہ خاں صاحب نے غلط انتخاب کیا۔ ان کے جیسے علم وفضل والے عالم کے لیے شوق کی مثنویاں ہلکی ہیں۔ ان میں تدوین کے جوہر دکھانے کا کہاں موقع ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ استاد کاریگر کے ہاتھ میں جو بھی خام مادّہ آجائے وہ اپنی چابک دستی سے اُس کو شاہکار بنادیتا ہے۔ 'مثنویاتِ شوق' کی تدوین کو دیکھ کر اس پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ میرے پاس وہ علم نہیں کہ میں اس تدوین کا تنقیدی تجزیہ کرسکوں۔ اس کے محض تعارف پر اکتفا کروں گا۔

انھوں نے تین مثنویوں: 'فریبِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' کے متن سے پہلے ۱۵۶ صفحوں کا عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔ متن کے بعد ۱۴۲ صفحات کے چار ضمیمے اور ایک فرہنگ ہے۔ مقدمے میں پندرہ ذیلی عنوانات ہیں۔ پہلا عنوان ہے 'تمہید' جو مثنویوں کے تہذیبی اور ادبی پس منظر میں مشتمل ہے۔ جو لوگ خاں صاحب کو محض محقق سمجھتے ہیں وہ اس تمہید کی گل گشت کریں تو ان کی تنقیدی نظر کے قائل ہوجائیں گے۔ محض تیرہ صفحوں میں حق ادا کردیا ہے۔ اس کے بعد حالاتِ زندگی ہیں۔ چوں کہ شوق کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے اور رشید حسن خاں صرف مستند بات ہی کرتے ہیں اس لیے انھوں نے شوق پر لکھنے والوں کے بیانات اور جملہ روایتوں کو چھانا پھٹکا اور سب ضروری باتیں سات آٹھ صفحوں میں لکھ دیں۔

اگلا عنوان ''مثنویاتِ شوق کی تعداد'' ہے، جس میں جملہ مثنویات کا جائزہ لے کر الحاقات کو رد کیا ہے۔ ان بے بنیاد انتسابات کے راوی ہمارے بعض زعمائے ادب ہیں۔

یہ عام طور سے مانا جاتا ہے کہ شوق نے محض تین مثنویاں لکھیں: 'فریبِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق'۔ رشید حسن خاں بھی اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد مقدمے کا نہایت اہم حصہ آتا ہے ''مثنویات کا زمانۂ تصنیف''۔ یہاں رشید حسن خاں کے تحقیقی جوہر کھلتے ہیں۔ انھوں نے بطورِ خاص تین پیش رو مورخوں کے بیانات کا تجزیہ کیا ہے:

۱- عطاء اللہ پالوی کا 'تذکرۂ شوق'۔

۲- ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کی کتاب 'دبستانِ آتش' نیز 'کلیاتِ شوق'۔

۳- ڈاکٹر سیّد محمد حیدر کا تحقیقی مقالہ 'حیاتِ شوق' (۱۹۹۱ء)۔

پالوی صاحب نے لکھا تھا کہ 'فریبِ عشق' شوق کی پہلی مثنوی ہونی چاہیے کیوں کہ اس میں شوق نے اپنے لڑکپن کا ذکر کیا ہے۔ خاں صاحب نے دکھایا کہ پالوی صاحب کے مطابق شوق ۱۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے اور 'فریبِ عشق' ۱۲۶۳ھ میں لکھی گئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت شوق کی عمر ۶۶ برس کی تھی جسے لڑکپن نہیں کہا جاسکتا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجنوں گورکھپوری کے بارے میں بڑے مزے کی بات کہی ہے:

> ''مجنوں صاحب کے رومان زدہ مزاج کو تحقیق کی مشکل پسندی سے دور کی بھی مناسبت نہیں تھی'' (ص ۴۳)۔

میں نے 'بہارِ عشق' کی طبعِ اوّل ۱۲۶۶ھ کی ایک نثرِ خاتمہ کی بنا پر لکھا تھا:

> ''چوں کہ یہ مثنوی ایک ذی اقتدار نواب کی فرمائش پر لکھی گئی اور شائع کی گئی، کوئی وجہ نہیں کہ تصنیف کے بعد طباعت میں دیر ہوئی ہو، اس لیے اس کی تاریخ ۱۲۶۶ھ تسلیم کی جاسکتی ہے''۔

('اردو مثنوی شمالی ہند میں' جلد دوم، ص ۱۲۰)

اب دیکھیے کہ تحقیق میں حزم و احتیاط کسے کہتے ہیں۔ خاں صاحب کا موقف ہے:

> ''جین صاحب کی بات قرینِ قیاس تو ہے، دل کو لگتی ہوئی بھی معلوم ہوتی ہے، مگر اس قیاس کو حتمی حیثیت نہیں دی جاسکتی یعنی قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی تصنیف اور طباعت کا درمیانی وقفہ کتنا تھا''۔

(ص ۴۵)

ویسے وہ عالم طور سے میرے بیانات سے اتفاق کرنے پر مائل ہیں۔ 'بہارِ عشق' کی تاریخ صفر ۱۲۶۳ھ (جلوسِ واجد علی شاہ) اور شوال ۱۲۶۶ھ کے بیچ طے کی ہے۔ شوق کے مقالہ

نگارڈاکٹر حیدر کے بیانات کی انھوں نے بڑی کھنچائی کی ہے۔ حیدر نے دعویٰ کیا تھا کہ شوق کی تینوں مثنویاں نصیرالدین حیدر کے عہد کی ہیں۔ 'بہارِ عشق' میں واجد علی شاہ کی مدح کے اشعار کے لیے انھوں نے مفروضہ پیش کیا:

''بہت ممکن ہے کہ واجد علی شاہ سے متعلق تمام اشعار بعد میں ضرورتاً یا مصلحتاً جوڑ دیے گئے ہوں''۔

ایسے بیان پر رشید حسن خاں جیسے سخت گیر محقق کے ردِعمل کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر حیدر کے دلائل کے پرخچے اُڑا دیے۔ تینوں مثنویوں کی تاریخ تصنیف کے بیانات میں 'زہرِ عشق' کی بحث شاہکار ہے۔ میں نے اپنی کتاب 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' میں لکھا تھا کہ 'زہرِ عشق' کا مادۂ تاریخ 'غمِ دلربا' ہے جسے سب سے پہلے سر راس مسعود نے 'انتخابِ زرّیں' میں درج کیا۔ عشرت رحمانی نے دیباچۂ 'زہرِ عشق' میں ذاکر بدایونی کا پورا قطعہ درج کردیا جس میں یہ مادّہ نظم کیا گیا ہے۔ میں رشید حسن خاں کی طرح جستجو کہاں کرتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ راس مسعود اور عشرت رحمانی دونوں نے اپنے ماخذ کو چھپا کر یہ تاثر دیا جیسے یہ ان کی دریافت ہے۔ دراصل یہ سب نظامی بدایونی کے دیباچۂ 'زہرِ عشق' (۱۹۱۹ء) سے لیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں ایک ایک جملے اور فقرے پر وکیل کی طرح بحث کرکے محتاط ترین نتیجہ نکالتے ہیں۔ انھوں نے اطلاع دی کہ اب تک کی معلومات کے مطابق اس مثنوی کا قدیم ترین ایڈیشن مطبعِ شعلۂ طور، کانپور کا جنوری ۱۸۶۲ء کا ہے، ۱۲۷۷ھ مطابق ہے ۶۱-۱۸۶۰ء کے۔ وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۷۷ھ ہی ہوگا۔

مثنویات کی تاریخ کے بعد اگلا عنوان ہے ''منعِ اشاعت''۔ پورے مقدمے میں تحقیق کے شاہکار یہی وہ بیانات ہیں۔ امتناعِ اشاعت کے بارے میں انھوں نے جملہ روایات کا اس عمقِ نظر سے جائزہ لیا ہے جیسے کوئی شرلاک ہومز چھان بین کرے۔ خاں صاحب کے تجزیے سے یہ بھی درس ملتا ہے کہ سنی سنائی روایات کا کس طرح تجزیہ کرنا چاہیے۔ ص ۶۵ تا ۸۷ کو محیط اس جائزے میں انھوں نے متعدد ایسی روایتوں اور بیانات کی نشان دہی کی ہے جن سے میں واقف نہ تھا۔ مثلاً سر رضا علی کا 'اعمال نامہ' (دسمبر ۱۹۴۳ء)، امیر احمد علوی کی 'مثنویات' (دسمبر ۱۹۴۳ء)، نظامی بدایونی کا نسخۂ 'زہرِ عشق' (۱۹۱۹ء) جس میں انھوں نے ۱۹۱۹ء کے ایک گورنمنٹ آرڈر کا حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کی روایت کہ 'زہرِ عشق'

میں میر مونس کی داستانِ محبت کو بیان کیا ہے۔ (۱۹۸۹ء) ڈاکٹر اظہر فاروقی کی روایت، ضیا فتح آبادی شاگردِ سیمابؔ کی روایت وغیرہ۔ روایتوں کو پرکھنے کے لیے خاں صاحب کے حسبِ ذیل مشاہدے کو تحقیق کے اصولوں میں جگہ دینی چاہیے:

''میں یہاں ایک بات پر خاص کر زور دینا چاہتا ہوں۔ مثنوی گلزارِ نسیم کی تدوین کے دوران اس سے متعلق زبانی روایتیں میرے سامنے آئیں، مثلاً یہ لکھا گیا کہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے، یا یہ کہ فلاں صاحب کے بھائی، شاگرد یا داماد نے خود مجھ سے کہا تھا یا میرے سامنے یہ بیان تھا، جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ ایسی سبھی روایتیں خانہ ساز تھیں۔ ایسی روایتوں کے بیان کرنے والے کون تھے؟ مولانا عبدالحلیم شررؔ اور پنڈت برج نرائن چکبستؔ جیسے لکھنؤ کے محترم حضرات تھے، خصوصاً آخرالذکر۔ تب سے میں زبانی روایتوں کے سلسلے میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا ہوں، خاص کر ایسی روایتیں جن پر کسی واقعے کے ہونے یا نہ ہونے کا دار و مدار ہو۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ روایت کی کچھ اصل تو ہے، لیکن نقل روایت کے نتیجے میں اس کا چہرہ مہرہ بدل گیا ہے یا بگڑ گیا ہے''۔ (ص ۷۷-۷۶)

اگر میری زندگی میں میری کتاب 'تحقیق کا فن' کا نیا ایڈیشن نکلا تو میں ان کے مشاہدے کو رہنما اصولوں میں ضم کر کے درج کروں گا۔ ان کا یہ مشاہدہ بھی گرہ میں باندھ رکھنے کے قابل ہے:

''یہ بات ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ ہمارے بہت سے معروف اہلِ قلم تحقیقی مزاج نہیں رکھتے تھے، اس لیے ایسے اقوال پر نہ تو تعجب ہونا چاہیے اور نہ انھیں لازماً قابلِ قبول سمجھنا چاہیے۔ جو حضرات اپنے آپ کو نقاد کہتے ہیں ان میں سے بیشتر کے مزاج کو تحقیق سے دور کی مناسبت بھی نہیں ہوتی، اس لیے وہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے حضرات کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ کیا لکھنا ہے، لیکن عموماً یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا نہیں لکھنا ہے''۔
(ص ۸۶-۸۵)

مقدمے کے امتناعِ اشاعت والے تجزیے کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اگلا جزو مطبوعہ نسخہ ہے جس میں تینوں مثنویوں کے قدیم ترین اور اہم ایڈیشنوں کی

تفصیل ہے۔ یہ یاد رہے کہ رشید حسن خاں جس متن کو مرتّب کرتے ہیں اس کے تمام اہم مخطوطوں اور مطبوعہ ایڈیشنوں کو فراہم کر کے کام کرتے ہیں، ایسے ایسے ایڈیشن کہ میں نے انھیں کبھی دیکھا سنا بھی نہیں ہے۔ رشید حسن خاں نے واضح کیا کہ 'مثنویاتِ شوق' کا کوئی اہم خطی نسخہ نہیں ملتا، تمام مفید نسخے مطبوعہ ہیں۔ انھوں نے ان کی تفصیل دیتے ہوئے بعض ایڈیشنوں کے اہم ترقیمے بھی نقل کر دیے ہیں۔ مثلاً 'بہارِ عشق' کا مطبع محمدی لکھنؤ کا ۱۲۶۸ھ کا ایڈیشن جو مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد چھپا۔ اس کی نثر خاتمہ میں یہ اہم اطلاع ہے:

> "(مصنف نے) حسبِ استدعاے 'بعضے دوستان لطیف کچھ خیال انجام اندیشی کر دنیاے فانی کو ناچیز سمجھ کر اصل حقیقت کو بیان کیا تا کہ عارفانِ صافی دل اس کو ملاحظہ کر کے لذتِ حسنِ حقیقی اٹھاویں۔ لہٰذا دوبارہ بحرِ تفکر میں غواصی کر کے اس درِ شاہوار اور گوہرِ آبدار کو رشتۂ نظم میں منسلک کیا اور 'بہارِ عشق' صادق نام رکھا"۔

انگریزی کہاوت ہے کہ وطن پرستی ہر بدمعاش (Scoundrel) کی آخری پناہ گاہ ہے۔ ہندوستان میں کہنا چاہیے کہ دین داری ہر اوباش کی آخری پناہ گاہ ہے۔ شوق، 'بہارِ عشق' میں بہت کھُل کھیلے۔ جب ان پر زمانے کی پھٹکار پڑی ہوگی تو گھبرا کر عشقِ صادق کے اشعار کا اضافہ کر کے معلم العارفین بن گئے۔ کام کی بات یہ ہے کہ نئے جنم میں انھوں نے مثنوی کا نام 'بہارِ عشق صادق' رکھ دیا۔ حیرت ہے کہ فاضل مرتّب نے اس نکتے پر کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ اطلاع دیتے ہیں کہ ۱۲۶۸ھ کا ایڈیشن مصنف کی نظر سے گزرا آخری ایڈیشن ہے۔ اگر اس میں بہارِ عشق کا نام بدل کر 'بہارِ عشق حقیقی' رکھ دیا گیا ہے تو اسی کو مستند نام مان کر مثنوی کا یہی نام زیب عنوان کرنا چاہیے۔

گارساں دتاسی نے اپنے اٹھارویں خطبے میں 'زہرِ عشق' کے نسخے کے موصول ہونے کا ذکر کیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں عطاء اللہ پالوی نے اپنی طرف سے اس نسخے کو ۱۸۶۲ء کا چھپا ہوا کہہ دیا، شاہ عبدالسلام نے بغیر حوالے کے اسی بیان کو نقل کر دیا۔ خاں صاحب نے اصل خطبے میں دیکھا تو کسی سنہ کا اندراج نہیں (ص ۱۰۱)۔ خاں صاحب نے 'زہرِ عشق' کے قدیم ترین دستیاب ایڈیشن کو حاصل کیا لیکن فرطِ احتیاط سے اسے طبع اول کہنے سے پرہیز کیا۔ تینوں مثنویوں کے قدیم ایڈیشنوں کی تلاش میں انھوں نے کیا کیا پاپڑ بیلے، کن کن کنوؤں میں بانس ڈالے، ان کی تفصیل دوسرے تحقیق کاروں کے سامنے تلاشِ مواد کا مثالی نمونہ

پیش کرتی ہے۔

اگلا جزو ''ذیلی عنوانات'' ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ تینوں مثنویوں میں سے کسی مثنوی کے کسی معتبر نسخے میں کوئی ذیلی عنوان نہیں بجز بہار عشق کے 'ترغیبِ عشقِ حقیقی' کے، اس لیے بعد والوں کے یہ اضافے قابلِ قبول نہیں۔ ہیروئنوں کے نام کے عنوان کے تحت فاضل مرتّب نے واضح کیا ہے کہ ان کے جو نام مشہور ہیں دراصل وہ ان کی صفت ہیں، علم کے طور پر نام نہیں۔ دو عنوانات میں اشعار کی کمی بیشی اور تکرار کی نشان دہی کی ہے۔

'مثنویاتِ شوق کے مآخذ' کے تحت انھوں نے میرے ایک بیان کے پیشِ نظر یہ تو مانا ہے کہ واجد علی شاہ کی مثنوی 'بحر الفت' اور شوق کی 'بہارِ عشق' میں کئی اشعار اس حد تک مماثل ہیں کہ ایک نے دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن مرتّب اس امر میں مذبذب ہیں کہ واجد علی شاہ نے یہ مثنوی شوق سے پہلے لکھی تھی کہ بعد میں (ص ۱۲۷)۔

اس کے آگے انھوں نے دو عنوانات کو ایک ساتھ لیا ہے:

الف: کیا یہ مثنویاں شوق کی سرگذشت ہیں۔ ب: وجہ تصنیف

انھوں نے یہ درست نتیجہ نکالا ہے کہ یہ شوق کی سرگذشت نہیں۔ انھوں نے 'بہارِ عشق' کے بارے میں یہ نادر نکتہ دریافت کیا کہ 'بہارِ عشق' میں جس خاتون سے انھوں نے زنا بالجبر کیا، بعد میں اسی سے شادی کی۔ ''نواب مرزا شوق ہوں یا ویسا ہی کوئی دوسرا شخص، اس کا اعلان کرنا کبھی پسند نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی وہی ہے جس کے ساتھ زنا بالجبر کیا جا چکا ہے''۔ (ص ۱۳۵)

واقعی حیرت ہے کہ اس پہلو پر میرا یا کسی دوسرے کا دھیان نہیں گیا۔ انھوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ ''شاعر کا اصل مقصد صرف خواتین کی زبان و بیان کی بہار دکھانا تھا''۔

اردو محققوں میں خود رشید حسن خاں زبان و بیان کی جو بہار دکھاتے ہیں ویسا کسی دوسرے سے نہ ہو سکا۔ ایک مثال:

> ''یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ شوقؔ نے یہ مثنویاں لکھنوی معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھی تھیں۔ شوقؔ اگر زندہ ہوتے اور ان پر یہ الزام لگایا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ ضرور دائر کر دیتے۔ وہ اس طبقۂ اشرافیہ کے ایک فرد تھے جو ایسے جلسوں کو اور ایسی لطف اندوزیوں کو اور ایسی جنسی کامیابیوں کو تہذیبی زندگی کا جز مانتا تھا...... راہِ

نجات لکھنے والے اور فریبِ عشق اور بہارِ عشق لکھنے والے الگ الگ راہوں کے راہی ہوتے ہیں''۔ (ص ۱۴۶)

خط کشیدگی سے ظاہر ہے کہ 'راہِ نجات' کسی کتاب کا نام ہے، میں اس سے واقف نہیں۔

'زبان و بیان' کے عنوان کے تحت انھوں نے تفصیلی، عالمانہ اور دلچسپ جائزہ لیا ہے۔ یہ صحیح لکھتے ہیں کہ 'زہرِ عشق' میں ''محاوراتِ صاحباتِ محل'' کی وہ کیفیت نہیں جو پہلی دو مثنویوں میں ہے۔ ''کہیں کہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شوق نے اپنی زبان ہیروئن کے منہ میں رکھ دی ہے''۔ (ص ۴۴-۱۴۳)

ہیروئن کے منہ میں زبان رکھنے کی بات سے کہیں قاری کے منہ میں پانی نہ بھر آئے۔ اس سے قطعِ نظر انھوں نے زندگی کے فنا پذیر ہونے کے اشعار درج کیے ہیں جو ''ایک الھڑ لڑکی کی زبان نہیں، یہ شوق کی آواز ہے''۔

مقدمے کا آخری عنوان ''طریق کار'' موجودہ ایڈیشن کے متن کی پیشکش کے بارے میں ہے۔ انھوں نے یہ بہت اچھا کیا کہ مثنویوں کے اشعار پر مسلسل نمبر شمار ڈال دیے جس سے حوالہ دینے میں بہت آسانی ہوگئی۔ لیکن انھوں نے عرشی صاحب کی طرح مختلف ایڈیشنوں کے لیے جو حرفی مخففات طے کیے ہیں، ان سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کے بجائے یک لفظی اشارہ طے کر لیتے تو ذہن کی اس طرف آسانی سے رسائی ہو جاتی یعنی مطبع کے نام کا ابتدائی حرف ف، س، م وغیرہ لکھنے کے بجائے پورا لفظ فیضی، سلطان، محمدی لکھا جاتا تو لفظی تصویر سامنے آجاتی۔

انھوں نے مقدمے میں بہت سے اہم مطالب فٹ نوٹ میں دیے ہیں۔ میرے نزدیک ہر اہم تبصرہ متن میں آنا چاہیے، یہ نہیں کہ کچھ متن میں لکھ دیا اور اسی سے متعلق، اتنی ہی اہم بات حاشیے میں ٹانک دی۔ حاشیے کا استعمال حوالے کے علاوہ کم سے کم کرنا چاہیے۔

آگے متن ہے جو زیادہ سے زیادہ معتبر اور صحیح ہے۔ اس فن پر خاں صاحب کے برابر کس کو دسترس ہوگی؟ متن کے بعد کے ضمیمے معلومات کے ایسے گنجینے ہیں کہ میں ان کی تفصیلات میں نہ جا کر صرف ان کا موضوع درج کرنے پر اکتفا کروں گا۔ پہلا ضمیمہ تشریحات ہے، دوسرا تلفظ اور املا، تیسرا اختلافِ نسخ، چوتھا الفاظ اور طریقِ استعمال۔ آخری جز و فرہنگ ہے۔ ان سب کو دیکھ کر مرتب کے غیر معمولی علم و فضل اور ان کی وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ان سے اختلاف کرنا بھی ممکن ہے، مثلاً:

۱- وہ رشک کے لغت کا نام 'نفس اللغۃ' لکھتے ہیں (ص ۳۰۹، ۳۱۰)۔ اس کا نام تاریخی ہے جو 'نفس اللغۃ' ہے۔ اس سے تاریخ تصنیف ۱۲۵۶ھ برآمد ہوتی ہے۔ اگر آخری حرف کو ت لکھا جائے تو ۱۲۵۱ھ تاریخ نکلے گی جو صحیح نہیں۔ ویسے انھوں نے اس لغت کے بارے میں بہت بیش بہا معلومات دی ہیں۔

۲- ۱۲۲۳ ناک میں دم ہے، اشک باری ہے زندگانی سے جان آری ہے (ص ۲۳۷)۔ اس کے لفظ 'آری' کا حاشیہ ص ۱۲-۳۱۱ پر ہے اس میں خبر دیتے ہیں کہ دو اور اشعار میں 'عاری' آیا ہے۔ وہاں سب مستند نسخوں میں 'عاری' ملتا ہے اس لیے وہی لکھا۔ موجودہ شعر میں 'آری' ملتا ہے اس لیے اسے اس املا سے لکھا۔ اس کے بعد وہ امیر مینائی کے ایک خط کا اقتباس دیتے ہیں:

> "'آری' میرے نزدیک ہندی ہے اس لیے کہ 'عاری' زچ و تنگ و عاجز کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہندی میں تو عین سے لکھنا خلاف اصول ہے۔ ہندی میں 'عین' کہاں"۔ (ص ۳۱۱)

اس لفظ کے سلسلے میں خاں صاحب نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے لیکن میں ان سے اور امیر مینائی سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اردو میں عربی کے متعدد الفاظ ان معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جو عربی کے لیے اجنبی ہوں گے۔ مثلاً عرصہ، عربی میں بہ معنی میدان، اردو میں مدت، عربی صلوات عربی میں بہ معنی نماز اردو میں بہ معنی گالی۔ کیا ہم ان سب کو ہندی کے پلے منڈھ کر 'ارسا'، 'سلوات' لکھیں گے۔ عاجز کے معنی میں 'آری' کوئی ہندی لفظ نہیں، اس املا کے ساتھ ایک مہمل لفظ ہے۔ مختلف لغات، امیر مینائی کے مشاہدے اور نسخوں میں 'آری' لکھا ہونے کے باوجود میں اصرار کروں گا کہ اس شعر میں 'عاری' ہی لکھا جائے۔

ایک تحقیقی کتاب میں اشاریے اور کتابیات کی بھی توقع کی جاتی ہے۔ اگر اشاریہ بنانا بار ہوتا تو کم از کم کتابیات تو ضروری تھی۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ رشید حسن خاں کی ان تدوینات کو دیکھ کر یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ صحت کے ساتھ عمر دراز پائیں تاکہ اردو کا دامن مالا مال کرتے رہیں۔ ان کی طبیعت ماندی رہتی ہے، اس کے باوجود وہ جس تن دہی کے ساتھ کام میں لگے رہتے ہیں وہ قابلِ تعریف و قابلِ تقلید ہے۔

❖❖❖

پروفیسر فضیل جعفری

'مثنویاتِ شوق' مرتّبہ رشید حسن خاں

تقسیم ملک کے برسوں بعد تک ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے ایسے کئی جیّد عالم موجود تھے جو تحقیق و تدوین کے میدان کے شہسوار ہی نہیں اپنی اپنی جگہ یکتائے روزگار بھی تھے۔ ان بزرگوں نے علمی و ادبی معاملات میں غیر معمولی تلاش و جستجو کے ذریعے منطقی نتائج تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری توانائیوں کو وقف کردیا تھا۔ افسوس کہ ہمارے ہم عصروں میں ایسے دشوار اور پیچیدہ مراحل سے گزرنے کا حوصلہ تو کجا، اسلاف کے کارناموں سے استفادہ کرنے کا شوق اور سلیقہ بھی باقی نہیں رہ گیا۔ اسی طرح یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اب سے پچیس تیس سال قبل تک مختلف یونیورسٹیوں میں ایسے اردو اساتذہ مل جاتے تھے جنھیں تحقیق و تدوین سے خواہ زیادہ دلچسپی نہ رہی ہو لیکن جن کا علمی و ادبی مرتبہ کافی بلند تھا۔ میں جن اساتذہ کا ذکر کررہا ہوں ان میں سے بیشتر راہیِ ملکِ عدم اور باقی ملازمت سے سبکدوش ہوچکے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ ان اساتذہ کے ایسے ابتدائی شاگرد بھی جنھوں نے درس و تدریس کا پیشہ اپنایا، یا تو وظیفہ یاب ہوچکے ہیں یا پھر ہونے والے ہیں۔

جہاں تک اردو اساتذہ کی نسبتاً نئی نسل کا تعلق ہے اس کے زیادہ تر نمائندوں کی ذہنی اور علمی حالت خاصی قابلِ رحم نظر آتی ہے۔ اس صورتِ حال کا سبب بھی واضح ہے۔ ان اساتذہ میں اکثریت ان غریبوں کی ہے جنھیں بی.اے میں خراب کارکردگی کی وجہ سے ایم.اے کی سطح پر دوسرے مضامین میں داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔ ایم.اے (اردو) میں انھیں آسانی سے داخلہ ہی نہیں، فرسٹ ڈویژن بھی ملنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ ہول سیل میں پی.ایچ.ڈی کی تقسیم کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے تو ہیں اور ان شعبوں میں 'ڈاکٹر' خواتین و حضرات کی بھرمار بھی ہے لیکن خالص علمی و

ادبی ماحول رخصت ہو چکا ہے۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں میں ہمارے یہاں ایک بھی اہم یا قابلِ ذکر محقق پیدا نہیں ہوا۔

اس /پس منظر میں جب ہم رشید حسن خاں پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی عرشی کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ موجودہ حالات میں اگر خاں صاحب یہ دعوا کریں کہ:

ہمارے بعد اُجالا نہیں اندھیرا ہے

تو ان کا دعویٰ یقیناً حق بجانب قرار پائے گا۔

یوں تو انھوں نے اچھی خاصی تعداد میں معیاری تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کا اصل میدان تدوین ہے۔ تحقیق و تدوین لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور چوں کہ اعلا پایے کی تحقیق کے بغیر کوئی مستند تدوینی کام ممکن ہی نہیں، اس لیے بلاتکلف یہ کہا جاسکتا ہے کہ فی زمانہ رشید حسن خاں تحقیق و تدوین میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ 'فسانۂ عجائب'، 'باغ و بہار' اور 'گلزارِ نسیم' کے بعد 'مثنویاتِ شوق' ان کا تازہ ترین تحقیقی اور تدوینی کارنامہ ہے۔

چوں کہ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے شائع ہوئی ہے اس لیے اگر کوئی چاہتا بھی تو انجمن کے معتمد ڈاکٹر خلیق انجم کو ایک علمی کتاب پر خالص غیر علمی تقریظ لکھنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ موصوف نے اپنے تعارفی نوٹ میں جہاں خاں صاحب کے بارے میں اور بہت کچھ لکھا ہے وہیں یہ بات بھی بہ اصرار کہی ہے کہ ''اردو میں رشید حسن خاں کے پایے کا کوئی اور متنی نقاد ابھی تک پیدا نہیں ہوا''۔ 'گلزارِ نسیم' والے نوٹ میں بھی ان کا یہی موقف تھا۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے 'مثنویاتِ شوق' پر تبصرہ کرتے ہوئے (ماہنامہ 'کتاب نما' دہلی، ستمبر ۱۹۹۸ء) ڈاکٹر انجم کے خیال سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ متنی تنقید اور تدوینِ متن دو الگ چیزیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ متنی تنقید کے مغربی تصور کے پیشِ نظر ڈاکٹر جین کا نقطۂ نظر بالکل صحیح ہے۔ متنی نقاد (Testual Critic) تنقید کرتے وقت اپنی ساری توجہ متن۔ یعنی کاغذ پر چھپے ہوئے الفاظ پر مرکوز رکھتا ہے اور انہی سے سارے معانی و مطالب اخذ کرتا ہے۔ اسے سوانح، تاریخ اور عصری حالات وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اردو کے بعض جدید نقادوں نے جو متنی تنقید لکھی ہے وہ بھی اسی قسم کی ہے۔ اس اعتبار سے رشید حسن خاں متنی نقاد نہیں ہیں۔ ویسے یہ ان کے لیے کوئی قابلِ فخر بات بھی نہیں ہے۔ ان کے تحقیقی و

تدوینی کارنامے اعلا پایے کے تنقیدی کارناموں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔

چوں کہ ڈاکٹر خلیق انجم تنقیدی نظریات، خصوصاً جدید تنقیدی نظریات سے قریب و دور کی کوئی نسبت نہیں رکھتے اس لیے اس معاملے میں انھیں بجا طور پر معصوم و معذور سمجھا جانا چاہیے۔ خاں صاحب نے زیرِ تبصرہ کتاب کے دیباچے میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''جو حضرات اپنے آپ کو نقاد کہتے ہیں ان میں سے بیشتر کے مزاج کو تحقیق سے دور کی بھی مناسبت نہیں ہوتی۔ ایسے حضرات کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ کیا لکھنا ہے لیکن عموماً یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا نہیں لکھنا ہے''۔

اس مسئلے سے قطع نظر کہ نقاد کے لیے محقق ہونا ضروری ہے یا نہیں، عرض یہ ہے کہ موجودہ سیاق و سباق میں اس جملے کا سب سے زیادہ اطلاق خلیق انجم ہی پر ہوتا ہے۔ ویسے مجھے ان کے اس مفروضے سے اتفاق ہے کہ ''کلاسیکی متون کو مرتّب کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ رشید حسن خاں ہی کی ہمت ہے کہ وہ ایسی دشوار منزلوں سے انتہائی کامیابی کے ساتھ گزر رہے ہیں''۔

بات یہ ہے کہ خاں صاحب کو دشوار گزار، پیچیدہ، ناہموار اور خاردار راستوں سے گزرنے اور دور دراز منزلوں تک پہنچنے کا چسکا سا لگ گیا ہے۔ برسوں کی تحقیقی محنت اور شدید علمی ریاضت کے نتیجے میں اب وہ اس قابل ہی نہیں رہ گئے کہ کوئی معمولی کام کرسکیں یا کسی موضوع کو رواروی میں نمٹا دیں۔ 'مثنویاتِ شوق' اس حقیقت کا تازہ ترین ثبوت ہے۔

نواب مرزا شوق لکھنوی اردو کے بہت بڑے شاعر نہ سہی بہت مشہور شاعر ضرور ہیں۔ ان کی ایک مثنوی 'زہرِ عشق' کا شمار بجا طور پر اردو کے مشہور ترین شعری کارناموں میں ہوتا ہے۔ جن افراد کو اس مثنوی کے مطالعے کا موقع نہیں ملا وہ بھی کم از کم اس کے نام اور کئی اشعار سے ضرور واقف ہیں جو کم و بیش ضرب المثل بن چکے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

گیسو رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں — چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں
موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ، کل ہماری باری ہے
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے

'زہرِ عشق' کے برخلاف اردو کا عام قاری، شوق کی دوسری مثنویوں: 'فریبِ عشق' اور 'بہارِ عشق' سے عموماً زیادہ واقفیت نہیں رکھتا۔ خاں صاحب کی کاوشوں کے طفیل عین ممکن ہے کہ یہ صورتِ حال تبدیل ہو جائے۔

جہاں تک زیرِ تبصرہ کتاب کا تعلق ہے یہ حقیقت پہلی ہی نظر میں آشکار ہو جاتی ہے کہ 'مثنویاتِ شوق' کی ترتیب و تدوین کا کام خاصا مشکل اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ یوں تو مرزا شوق اپنے زمانے میں بھی کوئی گمنام شاعر نہیں تھے لیکن ان کے معاصرین اور فوراً بعد آنے والوں کے یہاں شوق کے سرسری تذکرے کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ اس حقیقت کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں لکھی گئی پہلی کتاب عطاء اللہ پالوی کی تصنیف 'تذکرۂ شوق' ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔

رشید حسن خاں نے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل اپنے طویل دیباچے میں شوق کے عہد کے معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی حالات سے لے کر ان کی پیدائش، نام و نسب، عرفیت، شکل و صورت، مثنویوں کی تعداد، تاریخِ تصنیف و اشاعت، ان کے مآخذات، اشعار میں کمی بیشی اور فحاشی یا کسی اور الزام میں ان پر عائد کی جانے والی مبینہ پابندی وغیرہ تک مختلف مسائل کا احاطہ کیا ہے نیز عطاء اللہ پالوی کے علاوہ مولانا حالی، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریابادی، رضا علی، شاہ عبدالسلام، عبدالحلیم شرر، نظامی بدایونی، راس مسعود، مجنوں گورکھپوری، عشرت رحمانی، گیان چند جین اور کئی دوسرے اصحابِ علم نے شوق کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بڑی مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ یہ دیباچہ اتنا عالمانہ، مبسوط اور دلچسپ ہے کہ بجائے خود ایک علاحدہ تصنیف کا مرتبہ رکھتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دیباچے کے سامنے متن محض ایک ضمیمہ بن کر رہ گیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ رشید حسن خاں تحقیق و تدوین کے معاملے میں مزاجاً کٹر اور بنیاد پرست واقع ہوئے ہیں۔ وہ پہلے ہر چھوٹے بڑے مسئلے پر موجود تمام تفاصیل مواد اور حوالوں کو جمع کرتے ہیں، ماخذات، حوالوں اور اطلاعات کا تقابلی موازنہ کرتے ہیں، چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کا بھی دقتِ نظر کے ساتھ تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور اتنے طویل عمل سے گزرنے کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ثبوت، شواہد اور دلائل کے بغیر وہ کسی بڑے سے بڑے محقق، عالم یا ادیب کی بات قبول نہیں کرتے۔ اسی طرح بطورِ اصول وہ کسی کی بھی نہ تو غیر مشروط حمایت کرتے ہیں نہ مخالفت۔ اگر حقائق و شواہد کی روشنی میں انھیں کوئی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے تو اسے تسلیم کر لیتے ہیں لیکن اگر وہی راوی سہواً یا پھر زیبِ داستاں کے لیے غلط بیانی سے کام لے تو وہ اسے اتنی ہی شدت کے ساتھ رد بھی کر دیتے ہیں۔ 'مثنویاتِ شوق' میں ایسے مقامات جابجا بکھرے

ہوئے ہیں۔ ردّ وقبول کے اس عمل میں اگر خاں صاحب کہیں انتہا پسندی کا شکار ہو جائیں تو اسے ان کی تحقیقی بنیاد پرستی کا ہی نتیجہ سمجھا جانا چاہیے۔

رشید حسن خاں کے نزدیک شوق کی مثنویاں لسانی اعتبار سے ہی نہیں، تہذیبی اعتبار سے بھی بڑی زبردست اہمیت کی حامل ہیں۔ بقول ان کے:

''یہ مثنویاں اس زمانے کی لکھنوی معاشرت کی بعض جہتوں کی بہترین ترجمان ہیں۔ یہ گویا تمثال دار آئینے ہیں۔ اس تہذیبی روداد کے پس منظر میں اودھ کی سیاسی تاریخ کے بعض طاقت ور اثرات کا بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے''۔

خاں صاحب کے نزدیک مثنویاتِ شوق کی جو تہذیبی اور تاریخی اہمیت ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے دیباچے کا آغاز ہی مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک مضمون کے اس نسبتاً طویل اقتباس سے کیا ہے جس میں خاصی تفصیل کے ساتھ عہدِ واجد علی شاہ کی تہذیبی اور ثقافتی 'رنگ رلیوں' اور بے اعتدالیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعد ازیں فاضل مرتّب نے عبدالحلیم شرر (گذشتہ لکھنؤ) اور نجم الغنی خاں (تاریخ اودھ) وغیرہ کی تحریروں سے بطور ثبوت متعدد اقتباسات نقل کرنے کے ساتھ ساتھ خود مرزا شوق کے بھی کئی اشعار نقل کیے ہیں۔ پہلے مولانا دریابادی کے منقولہ اقتباس سے چند جملے ملاحظہ ہوں:

''لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ جانِ عالم کا لکھنؤ، ہر لب پر گُل کا اُفسانہ، ہر زبان پر بُلبل کا ترانہ، ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینے میں جوشِ تمنا، ہر روز میلوں ٹھیلوں کا ہجوم، ہر شب گانے بجانے کی دھوم ...... ہر طرف رندی و سرمستی کا جوش و خروش، ہر گوشہ بساط، دامانِ باغبان و کفِ گل فروش۔ بڑے بڑے متین و ثقہ، گوّیوں اور سازندوں کی دھاڑیوں کا بہروپ بھرے ہوئے ...... بھاری بھاری جبّے اور عمامے پیشوازوں کی گردش پر نثار......''

بعد ازیں خاں صاحب نے عبدالحلیم شرر کی کتاب 'گذشتہ لکھنؤ' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ شجاع الدولہ کا سارا رجحان بازاری عورتوں اور طوائفوں کی طرف تھا اور یہ شوق اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب نواب اضلاع کا دورہ کرتے تو ڈیرے دار طوائفوں کے خیمے پورے ٹھاٹ باٹ سے ان کے ساتھ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ جب حکمراں کا یہ عالم

ہو تو امرا اور رؤسا کا ہی نہیں، پورے معاشرے کا اسی رنگ میں رنگ جانا ایک فطری بات تھی۔ بقول رشید حسن خاں:

> ''یہیں سے (یعنی شجاع الدولہ کے زمانے سے) عیش طلبی کی اس روایت کا آغاز ہوتا ہے جس نے بعد کے حکمرانوں کے زمانے میں، خاص کر نصیرالدین حیدر کے زمانے میں بہت فروغ پایا اور مزید ترقی پا کر واجد علی شاہ کے عہد میں کسی کو کسی اور کام کا رکھا ہی نہیں تھا''۔

اس سے قطع نظر کہ مولانا دریابادی نے نثر میں شاعری کی ہے، مجھے یہ نہیں معلوم کہ مولانائے مرحوم و مغفور اور مومولوی شرر وغیرہ کے ماخذات کیا ہیں نیز انھوں نے شجاع الدولہ، نصیرالدین حیدر اور واجد علی شاہ کے بارے میں جو اطلاعات فراہم کی ہیں وہ تحقیق اور تاریخ کی کسوٹی پر کہاں تک کھری اُتر سکتی ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ یہ اکابرین ہگنس (Higgins) اور نائٹن (Knighton) جیسے انگریزوں کی ان تشہیری تحریروں سے متاثر ہو گئے جن کا مقصد نوابینِ اودھ خصوصاً واجد علی شاہ کو بدنام کرنا تھا تاکہ لارڈ ڈلہوزی نے جس طرح جبراً پہلے انھیں معزول کیا اور پھر قید کر کے مٹیا برج بھجوا دیا اس کا جواز مہیا کیا جا سکے۔ ہندوستانی محققین اور ماہرین تاریخ نے تصویر کا جو رُخ پیش کیا وہ کچھ اور ہی کہتا ہے۔

ابھی چند ماہ قبل ہی امریش مصرا کی کتاب Lucknow: Fire of Grace منظر عام پر آئی ہے۔ بقول مصرا شجاع الدولہ کے زمانے میں امرا کا جو نیا طبقہ ابھرا اس کا بنیادی کردار 'دیہی' تھا۔ دوسرے لفظوں میں ملک کی تاریخ میں زراعت پیشہ افراد کو پہلی بار یہ موقع ملا کہ وہ خاندانی نوابوں اور جاگیرداروں کے کاندھے سے کاندھا رگڑ سکیں۔ بقول مصرا شجاع الدولہ کی فوج پیشہ ور جنگجو سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اسی طرح آصف الدولہ کی اقتصادی پالیسیوں کی بدولت اودھ کی معیشت نے غیر معمولی ترقی کی۔ جگہ جگہ مصنوعات کے چھوٹے بڑے کارخانے کھل گئے۔ بنی بہادر، الماس علی خاں، ٹکیئت رائے، تفضل حسین خاں، خواجہ فریدالدین اور ابوطالب وغیرہ نے جن میں سے کچھ بیرونی زبانوں سے بھی واقف تھے، اودھ کی تجارتی حدود کو دور دراز علاقوں تک پھیلا دیا۔ نصیرالدین حیدر یقیناً عورت اور شراب کے رسیا تھے لیکن انھوں نے بھی نواب حکیم مہدی کے توسط سے بہت سی اصلاحات کیں۔ جانب دار مورخین نے واجد علی شاہ کو سب سے زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دن رات عیش وعشرت اور رقص و سرور میں

مست رہتے تھے۔ واضح رہے کہ واجد علی شاہ نے صرف نو سال حکومت کی۔ وہ بیس سال کی عمر میں تخت نشیں ہوئے اور ۲۹ سال کی عمر میں معزول کردیے گئے۔ اس مختصر سے عرصے میں انھوں نے شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ کی سرپرستی بھی کی اور ریاست کے نظم ونسق کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش بھی۔ ذکی کاکوروی، مرتب واجد علی شاہ، مولفہ سیّد محمد تقی احمد نے ڈاکٹر بھٹناگر کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے شراب کو کبھی منہ نہیں لگایا۔ دراصل جان عالم جن کا ایک لقب 'شاہ عادل' بھی تھا، نہایت ہی بیدار مغز اور منصف مزاج قسم کے بادشاہ تھے۔

خاں صاحب نے مرزا شوق کے ایک شعر کو جو انھوں نے بہارِ عشق کی ہیروئن کی زبان سے کہلوایا ہے، مثنوی کے زمانۂ تصنیف سے بحث کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

نہ سمجھنا زمانہ اور ہے یہ　　شاہ واجد علی کا دور ہے یہ

اس شعر میں واجد علی شاہ کی منصف مزاجی اور انصاف پسندی کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال کافی ہوگی۔

یکم جنوری ۱۸۵۱ء کو بادشاہ کے دربار میں ایک عرض داشت پیش کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ ایک ہندو کلوار کو میر محمد باقر کے حکم سے قتل کردیا گیا تھا لیکن چوں کہ میر باقر نواب نشاط محل کے قریبی عزیز تھے اس لیے متعلقہ حکام نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ ابھی بادشاہ علی نقی خاں (وزیر اعلا) اور داروغۂ شہر سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کر ہی رہے تھے کہ ایک پیامبر نے نواب نشاط محل کا نجی پیغام لاکر دیا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ بادشاہ 'محض ایک ہندو' کے قتل کو اتنی اہمیت نہ دیں۔ بادشاہ اس پر سخت برہم ہوئے اور جان کے بدلے جان کی سزا سنائی۔ انھوں نے داروغۂ شہر کو یہ حکم بھی دیا کہ آئندہ کسی بھی شخص کے ساتھ محض اس لیے نرمی نہ دکھائی جائے کہ اس کا ان سے یا ان کی کسی بیگم سے کوئی تعلق ہے۔

اگرچہ مقتول کے وارثوں کو مناسب خوں بہا دینے اور ان سے تحریری اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد میر باقر کی جان تو بچ گئی لیکن بادشاہ نے پھر بھی ان پر کافی جرمانہ عائد کیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ واجد علی شاہ نے امورِ سلطنت کو نہ صرف اپنی بیگمات بلکہ دوسرے رشتہ داروں کی دسترس سے بھی دور رکھا تھا۔ اگر فوج تہور خاں اور ہادی خاں کی

ماتحتی میں تھی تو محکمۂ مال مہاراجہ دھیرج بال کرشنا کی زیرِ نگرانی تھا۔ شاہی خزانے کے انچارج راجا کندن لال تھے۔

بادشاہ اپنے خزانے کا زیادہ تر حصہ فوجوں کی تربیت پر خرچ کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغل حکومت آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ اودھ کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت سے انگریز خوف زدہ ہو چلے تھے، اسی لیے جنزل اوٹرم اور جنرل سلمن وغیرہ نے بار بار پہلے تو واجد علی شاہ کو سمجھایا کہ وہ فوجوں پر پیسہ نہ خرچ کریں اور پھر گورنر جنرل کے کان بھر کے انھیں معزول کرادیا۔

اس حقیقت کو تو خود ہم عصر برطانوی مورخین مثلاً L.E.Runtz Rees وغیرہ نے تسلیم کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران انگریز فوجوں کو سب سے زیادہ شدید مزاحمت کا سامنا لکھنؤ میں ہی کرنا پڑا تھا۔ لکھنؤ وہ واحد علاقہ تھا جہاں عورتوں تک نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ برطانوی ریذیڈنسی کا پورے ۱۴۰ دنوں تک کا محاصرہ تو ہندوستان کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ رشید حسن خاں نے اسی سلسلے میں بحث کرتے ہوئے ایک جگہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''سماجی حالات اچانک نہ بنا کرتے ہیں اور نہ اچانک بدلا کرتے ہیں''۔

پھر ان حالات اور مندرجہ بالا پس منظر میں ہم یہ کیسے تسلیم کرلیں کہ واجد علی شاہ کی عیش پرستی نے ''کسی کو کسی کام کا رکھا ہی نہیں تھا''۔

یہ بھی یاد رہے کہ واجد علی شاہ کے عہد میں درگاہ حضرت عباس جیسے مذہبی، تفریحی مراکز کی اہمیت تقریباً ختم ہوگئی تھی اور 'قیصر باغ' لکھنؤ کا نیا ثقافتی مرکز بن گیا تھا جس کی تعریف میں منشی امیر مینائی اور منیر لکھنوی جیسے بہت سے شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں عیش پرستی، بدچلنی اور آوارگی کا ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا جیسا کہ شوق کی مثنویوں میں دکھائی دیتا ہے۔ مثنوی 'فریبِ عشق' سے یہ پانچ شعر ملاحظہ ہوں:

آئیں نوچندی میں یہ زنہار — گر حقیقت میں ہوئیں عصمت دار
رنڈیاں گو کہ ساری آفت ہیں — بیگمیں اور بھی قیامت ہیں
زہر ان میں بھرا ہے سر تا سر — نہیں کاٹے کا ان کے ہے منتر
کھلتا ہر اک پہ ان کا حال نہیں — کون ان میں ہے جو چھنال نہیں
ڈھونڈتی پھرتی خود حسین ہیں یہ — ہم سے دونی تماش بین ہیں یہ

ان میں سے دوسرا، چوتھا اور پانچواں شعر خاں صاحب نے بھی اس زمانے کی معاشرت کے ثبوت میں نقل کیا ہے۔ بقول خاں صاحب ان اشعار میں شوق نے ''ایک ایسی تلخ حقیقت کو بیان کیا تھا جس سے لوگ بے خبر نہیں لیکن اس کو بیان کرنے کی جرأت باقی نہیں رہ گئی تھی یا یہ کہ وہ معاشرے کا ایسا حصہ بن چکی تھی کہ اجنبیت اور اعتراض کی گنجائش گویا ختم ہو چکی تھی۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے خاں صاحب لکھتے ہیں:

> ''شوق کی شاعری جیسی بھی ہے وہ سچی ہے کہ معاشرت کی آئینہ داری کرتی ہے۔ جیسا وہ معاشرہ تھا اس کی شاعری کو بھی ویسا ہی ہونا چاہیے تھا اور یہ ویسی ہی ہے ...... شوق کی مثنویاں اپنے زمانے کی معاشرت کی آئینہ دار ہیں۔ اس زمانے میں لذت کوشی اور عیش اندوزی معاشرے کا جز بن چکی تھی۔ گفتگوئے صاحبات محل کے پس منظر میں اس معاشرت کے وہ سارے انداز جھلکتے نظر آتے ہیں جو تہذیب کا چمکدار حصہ تھے اور یہ ان مثنویوں کا بڑا روشن پہلو ہے اور یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ شاعر کا اصل مقصد تو صرف خواتین کی زبان و بیان کی بہار دکھانا تھا مگر شاعرانہ صداقت کے نتیجے میں سماجی حقیقت نگاری کے مرقعے تیار ہو گئے''۔

میرا مودبانہ معروضہ یہ ہے کہ ان مثنویوں کو شاعری سمجھ کر پڑھا اور ان سے محظوظ تو یقیناً ہوا جا سکتا ہے لیکن انھیں سماجی حقیقت نگاری کے مرقعے قرار دینا خود شوق کے ساتھ زیادتی کے مصداق ہے۔ یہاں ایک اور نکتے کی طرف بھی توجہ چاہوں گا۔ شوق نے اس زمانے کی بیگمات کی بدچلنی اور کھلی آوارگی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے خود ان کی مثنویوں کی ہیروئنیں عملی طور پر اس کی نفی کرتی نظر آتی ہیں۔ پہلے فریبِ عشق کی مثال ملاحظہ ہو۔ فریبِ عشق کا مرد کردار ابتدا سے ہی اپنی عیش پرستی اور جنسی فتوحات کا بکھان کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دریں اثنا وہ نوچندی کے میلے میں آنے والی ایک لڑکی پر 'عاشق' ہو جاتا ہے۔ وہ لڑکی کی ماما کو بہلا پھسلا کر اس بات پر راضی کر لیتا ہے کہ وہ اپنی بیگم کو کسی بھی طرح اس کے خیمے میں لے آئے۔ آخر کار ایسا ہی ہوتا ہے۔ مرد سے تعارف کے بعد لڑکی برملا یوں گویا ہوتی ہے:

یہ تو سمجھی کہ خوش بیاں ہیں آپ — رکھتے کیا نام کیا نشاں ہیں آپ
نام جس وقت میں نے بتلایا — قہقہہ مار کر یہ فرمایا

اے لو میں بھی کہوں سبب کیا ہے　　ارے تو ہی نواب مرزا ہے
ایکی مرشد ہو تم، قصور معاف　　سن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف

مجھے خاں صاحب کے اس خیال سے مکمل اتفاق ہے کہ اگر چہ شوق کی عرضیت نواب مرزا تھی لیکن اسے شوق کی داستانِ حیات نہیں سمجھا جاتا۔ یہ بیان کا محض ایک انداز ہے۔ مطلب یہ کہ مثنوی کے راوی خود مرزا شوق نہیں بلکہ کوئی اور مرد ہے۔ بعدازیں ہیروئن نے بارہ پندرہ اشعار میں عاشق صاحب کے جو 'اوصافِ حمیدہ' گنوائے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ موصوف شہر کے نامی گرامی اوباش ہیں اور ان کا پیشہ ہی نت نئی لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر دادِ عیش دینا ہے۔ پھر موصوف 'رنڈی' بمعنی عورت ذات کی سادہ لوحی اور اپنی شاطرانہ بوالہوسی کا ذکر کرتے ہوئے اطلاع دیتے ہیں:

فرق اتنا تھا اس میں اور ہم میں　　رنڈی آخر تھی آگئی دم میں
نہ رہی درمیاں میں جب تکرار　　ہوگیا وصل بعد قول و قرار
کچھ دنوں تک مزے اڑائے خوب　　لطف اس شوخ سے اٹھائے خوب
بھر گیا دل جب ان کی صحبت سے　　ہوگئی نفرت ان کی صورت سے
نہ مزا میں نے ان سے جب پایا　　اور معشوق سے دل الجھایا

ان اشعار سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ مرد ایک پیشہ ور بوالہواس اور بدخصلت انسان ہے۔ اب ذرا لڑکی کی حالت بھی ملاحظہ فرمائیے:

دی کسی نے جو اس کی ان کو خبر　　اپنے جامے سے ہوگئی باہر
رشک سے پیچ و تاب کھانے لگی　　دل ہی دل میں الم اٹھانے لگی
نہ کسی سے یہ غم کیا اظہار　　صدمۂ رشک سے چڑھ آیا بخار
جی سے اپنے گزر گئی آخر　　بعد چندے کے مرگئی آخر

حاصلِ کلام یہ کہ مرد لاکھ بدنام اور اوباش سہی، لڑکی جب ایک بار اسے دل دے بیٹھتی ہے اور منزلِ وصل سے گزر جاتی ہے تو پھر وہ کسی اور مرد کی طرف نہیں دیکھتی۔ مرد کی بے وفائی کے غم میں اندر ہی اندر گھلنا اور پھر لب پر حرفِ شکوہ لائے بغیر چپ چاپ جان دے دینا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ لڑکی، مرد راوی کی طرح ہرجائی نہیں بلکہ وفادار تھی۔ ظاہر ہے کہ تماش بین اور چھنال عورتیں عادتاً ایک کے بعد دوسرے مرد کو پھنساتی ہیں اور اس طرح اپنی نفسانی اور حیوانی خواہشات کی تکمیل کرتی رہتی ہیں۔ آخری بات یہ کہ 'فریبِ عشق' کی

لڑکی تو آخر میں حقیقی معنی میں ہیروئن بن جاتی ہے جب کہ مرد صاحب پرلے درجے کے بدمعاش اور وِلن ثابت ہوتے ہیں۔

'بہارِ عشق' کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ مثنوی کا مرد راوی لڑکی کو دیکھتے ہی نہ صرف ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے بلکہ قریب المرگ ہوجاتا ہے۔ گھر میں رونا پیٹنا مچ جاتا ہے۔ مثنوی کے آغاز میں عاشق کی اس کیفیت کے تعلق سے اعزہ اور اقربا کے بے حد غمگین ردِ عمل اور ان کی سراسیمگی کو بڑی تفصیل کے ساتھ اور خاصے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں جب عاشق صاحب ہوش میں آتے ہیں اور اپنے قریبی دوستوں سے سارا ماجرا بیان کرتے ہیں تو وہ لوگ لڑکی سے ہزار منتیں کرکے اسے عاشق کے گھر آنے پر راضی کرلیتے ہیں تاکہ ایک انسانی جان ضائع ہونے سے بچ جائے۔ اگرچہ 'بہارِ عشق' ایک طربیہ مثنوی ہے اور اس کا خاتمہ مرد اور عورت کی شادی پر ہوتا ہے لیکن دونوں کے درمیان ہونے والی پہلی ملاقات بہر حال توجہ کی متقاضی ہے۔

شوق نے تقریباً چالیس اشعار میں اس ملاقات اور پھر وصل کی مختلف کیفیات کا بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خاں صاحب نے اس کے لیے 'وصل بالجبر' کی ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے۔ مولانا حالی سمیت کئی اصحابِ علم نے ان اشعار پر فحش ہونے کا الزام لگایا ہے۔ فاضل محقق اور مرتب نے نہ صرف اخلاقیات کے نام پر واویلا کرنے والوں سے اختلاف کیا ہے بلکہ فارسی اور اردو کی کئی مثنویوں سے 'بہارِ عشق' کا موازنہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ متعلقہ اشعار فحش نہیں ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں ان سے مکمل اتفاق ہے، ویسے فحش نگاری سردست میرا موضوع نہیں ہے۔

میں نے 'فریبِ عشق' کے پس منظر میں اوپر جو چند معروضے پیش کیے ہیں انھی کو آگے بڑھاتے ہوئے مثنوی کے مرد کردار اور اس کی ہیروئن کے جنسی رویّوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مرزا شوق نے 'وصل بالجبر' یعنی سلیس اردو میں زنا بالجبر کا جو مفصل نقشہ کھینچا ہے اس کا آخری منظر ملاحظہ ہو:

درد سے جب نہ رہ سکی خاموش ہوگئی چیخ مار کر بے ہوش
ہاتھ اور پاؤں سارے اینٹھ گئے نہ رہی تاب، دانت بیٹھ گئے
مارے صدمے کے نیم جان ہوئی سب پلنگڑی لہولہان ہوئی

ظاہر ہے کہ مرزا شوق سے تہذیبِ عشق کے اس معیار کی توقع نہیں کی جاسکتی جس کا مظاہرہ

میر تقی میرؔ کے متعدد اشعار مثلاً:

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے　　عشق بن یہ ادب نہیں آتا

میں کیا گیا ہے۔ لیکن 'بہارِ عشق' کا عاشق جو لڑکی کے فراق میں نیم جاں بلکہ تقریباً مردہ ہو چکا تھا پہلی ہی ملاقات میں جس طرح اس پر بھوکے گدھ کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے اسے بدذوقی اور بوالہوسی کی بدترین مثال کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ڈاکٹر گیان چند جین اور دیگر ماہرین کا خیال ہے کہ مثنوی نگاری کے باب میں شوق سب سے زیادہ مومن خاں مومنؔ سے متاثر تھے۔ یقیناً ہوں گے لیکن بیانِ وصل کے تعلق سے شوقؔ جس طرح شوخ نگاری اور بے باکی کی سرحدوں کو پار کرکے بے لگام ہو جاتے ہیں، مومنؔ اس کا اثبات نہیں کرتے۔ مومن نے مثنوی پنجم میں اپنے موقف کا بڑا واضح اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مفتیانِ عشق لکھتے ہیں تمام　　بوالہوس شوہر بھی ہو تو ہے حرام

مختصر یہ کہ ایک طرف تو 'بہارِ عشق' کے منقولہ بالا اشعار اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ 'فریبِ عشق' کے مرد کردار کی طرح 'بہارِ عشق' کا عاشق بھی پرلے درجے کا بوالہوس ہے اور دوسری طرف تینوں اشعار خصوصاً:

مارے صدمے کے نیم جان ہوئی　　سب پلنگڑی لہو لہان ہوئی

سے واضح ہو جاتا ہے کہ 'فریبِ عشق' کی ہیروئن کی طرح 'بہارِ عشق' کی ہیروئن بھی چھنال اور آوارہ نہیں بلکہ پاکیزہ تھی اور جنسی اختلاط کا اس کا یہ پہلا موقع تھا۔ جہاں تک 'زہرِ عشق' کی ہیروئن کا سوال ہے وہ بیچاری تو محبوب کی جدائی کی تاب نہ لاکر زہر کھا کر جان دے دیتی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ان تینوں ہیرئنوں کے مدنظر شوقؔ کے اس بیان کو ہرگز قبول نہیں کیا جاسکتا کہ نوچندی کے میلے میں جانے والی سبھی بیگمات یا خواتین عادتاً بدکردار، بدچلن، بے عصمت اور چھنال ہوا کرتی تھیں۔ اس رویے کو زیادہ سے زیادہ مرزا شوق کا جنسی پرورژن کہا جاسکتا ہے۔

یہاں ایک سوال اور اٹھتا ہے۔ کیا ان مثنویوں کے مرکزی مرد کردار خود مرزا شوق ہیں۔ اتفاق سے شوق کے بارے میں بیشتر مباحث کی طرح اس بحث کا آغاز بھی مولانا حالی سے ہی ہوتا ہے۔ مولانا کے الفاظ ہیں:

''میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنویاں سب سے زیادہ لحاظ

کے قابل ہیں۔ ان میں سے تین مثنویوں میں اس نے اپنی بوالہوسی اور کام جوئی کی سرگذشت بیان کی ہے۔ یا یوں کہو کہ اپنے اوپر افترا باندھا ہے''۔

عطاء اللہ پالوی اور مجنوں گورکھپوری دونوں نے حالی سے طاقت اخذ کی ہے اور مرزا شوق کو ہی فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق کا ہیرو قرار دیا ہے۔ رشید حسن خاں نے اس طرزِ فکر سے بجا طور سے اختلاف کرتے ہوئے ایک بڑا باریک نکتہ پیدا کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حالی نے یہ لکھ کر کہ ''اپنے اوپر افترا باندھا ہے''۔ اپنے جملے کے پہلے حصے یعنی ''یعنی مثنویوں میں اس نے اپنی بوالہوسی اور کام جوئی کی سرگذشت بیان کی ہے'' کی صراحت کو ختم کر دیا ہے اور یہ کہنے کی واضح کوشش کی ہے کہ مرزا شوق نے بلاوجہ ہی اور اپنی ناسمجھی کی بنا پر خود کو ان مثنویوں کا ہیرو بنا کر پیش کیا ہے۔

خاں صاحب نے قابلِ قبول دلائل کی مدد سے پالوی کے اس دعوے کو بھی رد کر دیا ہے کہ شوق کا بنیادی مقصد ہم عصر معاشرے کی اصلاح تھا اور ''اس لحاظ سے جب شوق نے اپنے شہر کی بداخلاقیوں کو طشت از بام کرنا چاہا تو سب سے پہلے اپنی ذاتی روداد پیش کی اور باتوں ہی باتوں میں سارا راز کھول کر رکھ دیا''۔ پالوی صاحب نے ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'' کے مصداق جس قیاس آرائی سے کام لیا ہے وہ یوں بھی خاں صاحب کے عمومی طریقِ کار سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ بطور اصول قیاسات یا کسی واقعے کی شہرت کو صداقت کی مترادف نہیں سمجھتے۔ پھر اس سلسلے میں تو ان کے سامنے خود شوق کا وہ بیان موجود ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ان کا حقیقی مقصد ان مثنویوں کے توسط سے:

''صاحباتِ محل اور نوچندی میں شرکت کرنے والوں کے محاورات یعنی ان کی بول چال اور طرزِ گفتگو کو بیان کرنا تھا''۔

بقول رشید حسن خاں ''یہ نہ آپ بیتی ہے نہ کوئی حقیقی واقعہ۔ یہ محض ایک قصہ ہے جس میں اس زمانے کے ایسے واقعات کا عکس اتر آیا ہے گویا یہ اس زمانے کی جگ بیتی ہے''۔

اس اقتباس کے پہلے جملے سے اختلاف کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے لیکن 'جگ بیتی' ایک وسیع المفہوم دائرے والی اصطلاح ہے جس کا اطلاق زندگی کے تمام شعبوں پر ہوتا ہے، اگر ہم اس بات کو مان بھی لیں کہ جگ بیتی چوں کہ آپ بیتی کی متضاد اصطلاح ہے اور چھوٹے موٹے انفرادی واقعات کو بھی جگ بیتی کہا جاسکتا ہے تو بھی 'بہارِ عشق' وغیرہ پر

جگ بیتی کا لیبل چسپاں کرنا مناسب نظر نہیں آتا۔ جس طرح سے شوق نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ ان کا مقصد معاشرے کی اصلاح کرنا تھا بالکل اسی طرح انھوں نے اپنی مثنویوں کے ذریعے لکھنوی معاشرے کی عکاسی یا آئینہ داری کا بھی کوئی دعوا نہیں کیا۔ معاملہ گھوم پھر کر صاحباتِ محل کی زبان اور ان کے محاوروں کو نظم کرنے والے مقصد پر ہی اٹک کر رہ جاتا ہے۔

اس سلسلے میں بھی شوق کے یہاں اچھا خاصا جھول نظر آتا ہے۔ ان مثنویوں کی بیگمات جس زبان میں گفتگو کرتی ہیں بالکل وہی زبان نوکرانیاں استعمال کرتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بسا اوقات مرد بھی اسی انداز اور اسی لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:

جھوٹے کی جان پر ستم ٹوٹے　　شاہ عباس کا علم ٹوٹے

چھٹ ترے غیر کو جو کرتا ہو پیار　　ارے اس پر پڑے خدا کی مار

'بہارِ عشق' کے مرد راوی کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں۔ خاتون کرداروں کی زبان کے سلسلے میں بھی شوق ہر جگہ یکساں طور پر کامیاب نہیں ہیں۔ خاں صاحب کی یہ تنقید کہ اکثر مقامات پر شوق بیگمات کے منہ میں خود اپنی زبان رکھ دیتے ہیں، کھری اور سچی بھی ہے اور لسانی نزاکتوں سے ان کی گہری واقفیت کا ثبوت بھی۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے مرزا شوق کی زبان کو کوثر سے دُھلی ہوئی زبان قرار دیا ہے۔ خاں صاحب نے بھی شوق کی زبان کی بڑی تعریف کی ہے لیکن انھوں نے جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے شوق کے یہاں پائے جانے والے لسانی اسقام و نقائص کی طرف اشارہ کرنے میں بھی کوتاہی نہیں برتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ایک اور تفصیلی نیز دقیق بحث مثنویاتِ شوق کی تعداد کے بارے میں بھی ہے۔ رشید حسن خاں کو ایسے نیم تعلیم یافتہ اور کچا ذہن رکھنے والے تذکرہ نویسوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں جنھوں نے سوچے سمجھے بغیر فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق کے ساتھ ساتھ خنجرِ عشق، سوزِ عشق، قہرِ عشق اور لذتِ عشق کو بھی شوق کے کھاتے میں ڈال دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ خاں صاحب کا سخت گیر تحقیقی و تنقیدی مزاج مولانا حالؔی اور مجنوںؔ گورکھپوری جیسے زعمائے ادب کو معاف نہیں کرسکتا جنھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ لذتِ عشق کو شوق کی تصنیف قرار دیا ہے۔ سعادت خاں ناصر، پنڈت کیفی اور سرراس مسعود سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ البتہ عطاء اللہ پالوی اور ڈاکٹر گیان چند جین کافی تحقیق و جستجو کے بعد

مثنویاتِ شوق کی صحیح تعداد مقرر کرنے میں یقیناً کامیاب ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس غلط فہمی کا سلسلہ کب سے اور کہاں سے شروع ہوا۔ رشید حسن خاں کی فراہم کردہ تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ مثنویاتِ شوق کا ایک مجموعہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ مرزا شوق کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور اس میں 'لذتِ عشق' بھی شامل تھی۔ بقول خاں صاحب:

''غالباً غلط فہمی کا آغاز یہیں سے ہوا۔ نول کشوری مطبوعات سے اہلِ علم بطورِ عموم استفادہ کیا کرتے تھے۔ غالباً اسی مجموعے کی بنیاد پر مولانا حالی نے 'لذتِ عشق' کو بھی بلا تکلف شوق کی مثنوی سمجھ لیا''۔

خاں صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے۔ مولانا حالی محقق نہیں تھے۔ 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں دیگر اصنافِ سخن پر عمومی تبصرہ کرتے وقت انھوں نے اختصار کے ساتھ صنفِ مثنوی پر بھی لکھا ہے اور اسی ضمن میں شوق کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے سامنے مثنویاتِ شوق کا نول کشوری اڈیشن ہی رہا ہوگا۔ اس طرح حالی کا 'لذتِ عشق' کو شوق کی ہی تصنیف مان لینا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ ہاں پنڈت کیفی اور مجنوں گورکھپوری جیسے عالموں کا لکیر کا فقیر بنے رہنا ضرور حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اب جب کہ یہ حقیقت 'بہ تحقیق' پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ 'لذتِ عشق' مرزا شوق کی نہیں، ان کے بھانجے آغا حسن نظم کی تصنیف ہے، میرے ذہن میں کچھ سوالات آ رہے ہیں جو آج بھی تحقیق طلب ہیں۔ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے ان سوالات کو خاں صاحب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ یوں بھی کارِ مغاں کبھی تمام نہیں ہوتا۔

(۱) مطبع نول کشور جیسے ذمے دار، باوقار اور مستند ادارے سے اتنی بڑی غلطی کیسے اور کیوں سرزد ہوئی کہ اس نے مرزا شوق کے مجموعے میں ایک جونیر شاعر (نظم لکھنوی) کی مثنوی 'لذتِ عشق' کو بھی شامل کر لیا؟

(۲) یہ مجموعہ شوق کی زندگی میں ہی شائع ہوا تھا۔ کیا مطبع ہذا نے اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اشاعت سے قبل مسودہ شوق کو دکھایا جاتا؟

(۳) اگر مسودہ انھیں دکھا دیا گیا تھا تو شوق ایسی بددیانتی کے مرتکب کیسے ہوئے کہ اپنے بھانجے کی تصنیف کو ڈکار لیے بغیر ہضم کر گئے۔

(۴) اگر مطبع نول کشور نے اشاعت سے قبل شوق کو مجموعے کا مسودہ دکھانا ضروری نہیں

سمجھا تھا تو کیا مرزا صاحب نے شائع شدہ مجموعہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور اگر دیکھا تو ان کا ردِ عمل کیا تھا۔

(۵) جیسا کہ خاں صاحب نے لکھا ہے مثنوی 'لذتِ عشق' کا وہ نسخہ جو مطبع فیضی سے شائع ہوا تھا ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ دوسرے نقادوں/محققوں نے بھی اس کے بارے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا۔ شاہ عبدالسلام نے اپنے مرتب کردہ کلیاتِ شوق میں اور ڈاکٹر حیدر نے اپنے تحقیقی مقالے میں صرف اس کے سرورق کا عکس چھاپ دیا ہے جو یوں ہے:

''تصنیفِ شاعر تیز زباں، طوطیِ ہندوستاں آغا حسن تخلص بہ نظم ہمشیر زادۂ حکیم تصدق حسین خاں صاحب دام اقبالہٗ''۔

اس تحریر میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ نظم جیسے 'گمنام شاعر'' کو تو 'طوطیِ ہندوستاں' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے جب کہ مرزا شوق لکھنوی جیسے مشہور و معروف شاعر کو محض حکیم تصدق حسین خاں پر ٹال دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مرزا شوق لکھنؤ میں حکیم کی حیثیت سے کہیں زیادہ شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نظم مرزا شوق کے نہیں کسی اور حکیم تصدق حسین خاں کے بھانجے رہے ہوں!

'مثنویاتِ شوق' کی تعداد کی طرح ان کے ماخذ بھی شروع سے ہی اہلِ علم کی توجہ اور بحث کا مرکز رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی قدیم ترین رائے مولانا حالی ہی کی ہے۔ مولانا نے 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں لکھا ہے کہ شوق نے خواجہ میر اثر کی مثنوی 'خواب و خیال' کو بنیاد بنا کر اپنی مثنویوں کی عمارت کھڑی کی ہے۔ لیکن رشید حسن خاں نے خود حالی کی تحریر سے ثابت کر دیا ہے کہ مولانا نے خواب و خیال، پڑھی ہی نہیں تھی۔ انھیں پالوی اور ڈاکٹر جین کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ شوق نے سب سے زیادہ فائدہ مومن کی مثنویوں سے اٹھایا ہے۔ وہ ڈاکٹر جین کے اس نقطۂ نظر سے بھی متفق ہیں کہ:

''شوق نے اپنی مثنویوں کا موضوع خود ہی اختراع کیا۔ محض وصل کے بیان میں اس نے دوسرے شعرا کے کلام کو پیشِ نظر رکھا''۔

البتہ حالی کی رائے کی طرح وہ مولوی عبدالحق اور مجنوں گورکھپوری کی بھی اس رائے کو معتبر نہیں سمجھتے کہ شوق کے پیشِ نظر محض مثنوی 'خواب و خیال' تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے پہلے مجنوں صاحب کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

''یہ تو مسلّم ہے کہ مرزا شوق نے 'بہارِ عشق'، 'خواب و خیال' کو پڑھ کر لکھی تھی کیوں کہ دونوں مثنویوں میں سراپا اور اختلاط کے اشعار بے طرح مشابہ ہیں...... میرا خیال ہے کہ مرزا شوق کی ہر مثنوی میں ...... 'خواب و خیال' کے کچھ عناصر موجود ہیں''۔

اور پھر اس اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بہارِ عشق میں تو سراپا موجود ہی نہیں، ہاں خواب و خیال میں سراپا ہے اور بقول مولوی عبدالحق سراپا میں کوئی عضو نہیں چھوڑا اور اس دھن میں وہ حد سے آگے نکل گئے ہیں''۔

یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا واقعی 'بہارِ عشق' میں سرے سے ہی سراپا موجود نہیں ہے؟ خاں صاحب ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ بقول ان کے 'بہارِ عشق' میں ہیروئن کی تعریف میں جو اٹھارہ شعر ہیں وہ عمومی انداز کے ہیں جب کہ ''سراپا بالکل دوسری چیز ہے جس میں محبوب کے مختلف اعضا و اجزائے بدن کی تعریف میں اشعار لکھے جاتے ہیں۔ ایک ایک عضوِ بدن کی صراحت کے ساتھ''۔ خاں صاحب کا اصرار ہے کہ:

''جب 'بہارِ عشق' میں سراپا موجود ہی نہیں تو یہ کہنا کہ 'خواب و خیال' اور 'بہارِ عشق' کے سراپا کے اشعار بے طرح مشابہ ہیں، کوئی معنی نہیں رکھتا''۔

رشید حسن خاں کے تحقیقی مباحث اور نتائج اتنے مدلل ہوتے ہیں کہ ان سے اختلاف کرنا آسان نہیں ہوتا لیکن مجھے اختلاف کی تھوڑی سی گنجائش نظر آ رہی ہے۔ خاں صاحب نے 'بہارِ عشق' میں محبوب کی عمومی تعریف والے جن اٹھارہ اشعار کا ذکر کیا ہے ان میں سے پہلا شعر یہ ہے:

سر سے پا تک تھی نور کی صورت　　بام روشن تھا طور کی صورت

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں 'سر سے پا تک' والا فقرہ اس بات کی چغلی کھا رہا ہے کہ شاعر کا رجحان محبوب کے سراپا کے بیان کی طرف ہے۔ بعد ازیں شوق نے دیگر اشعار میں محبوب کے قد، رخسار، چہرہ، آنکھیں، دہن، دانت، ہونٹ، سینہ (چھاتیاں)، گردن، کمر، شانے، ناک اور چوٹی وغیرہ کا بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہیں تلمیح و تشبیہ سے مدد لی ہے تو کہیں بالکل صاف، کھرے اور براہِ راست بیانیہ سے کام لیا ہے۔ تلمیح و تشبیہ کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

حسنِ یوسف بھی اس کے آگے ماند	چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند

اس کے بعد اب ذرا یہ شعر پڑھیے:

سینے پر دونوں چھاتیاں انمول	اونچی، چکنی، کڑی، کراری، گول

اور سوچیے کہ چھاتیوں کے بیان میں بھلا اس سے زیادہ صراحت اور کیا کی جاسکتی ہے۔ اب اگر سراپا نگاری کے باب میں میر اثر کی طرح مرزا شوق کا قلم اندام نہانی تک نہیں پہنچ سکا جسے بابائے اردو نے حد سے آگے نکل جانا قرار دیا ہے تو اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ شوق کو جزئیات نگاری میں وہ ملکہ حاصل نہیں تھا جو اثر کو تھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ 'بہارِ عشق' کا عاشق محبوبہ کو دیکھتے ہی جسمانی طور پر اس حد تک بدحواس اور مضطرب ہو چکا تھا کہ اسے کچھ اور دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس کے سر پر تو محض 'کرنے' کا جنون سوار تھا۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اندامِ نہانی کے ذکر کو کسی بھی طرح فحش قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ نسوانی جسم کا نہ صرف سب سے زیادہ لذت بخش عضو ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک خاص معنی میں تقدس کا تصور بھی وابستہ ہے۔ بقول رفیع لکھنوی:

''یہ وہ محراب ہے جس سے پیمبر جھک کے نکلے ہیں''۔

اسی سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ سراپا نگاری میں مومن خاں مومن بھی میر اثر سے آگے نہیں جاسکے۔ وہ اپنی ایک مثنوی میں محبوب کا سراپا بیان کرتے ہوئے یہاں تک تو پہنچے کہ:

سنبلستاں تر خم گیسو سے ناف	نافۂ مشکیں ہجوم مو سے ناف

آگے جی کہتے ہوئے شرمائے ہے	اپنی باتوں سے خجالت آئے ہے

میر اثر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ ان کی سراپا نگاری پر لذت کوشی کا شائبہ تک نہیں ہوتا جب کہ مومن اور ان سے زیادہ شوق کے یہاں معاملہ لذت کوشی سے گزر کر بوالہوسی تک پہنچ جاتا ہے۔

'مثنویاتِ شوق' سے متعلق ایک اور اہم اور متنازعہ پہلو اس سے رشید حسن خاں نے تفصیلی بحث کی ہے اور جس پر ہر زاویے سے روشنی ڈالی ہے، وہ ہے مثنویوں پر پابندی عائد کیے جانے کا مسئلہ۔ اس بحث کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''شوق کی تینوں مثنویوں (فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق) پر یا ان سے کسی ایک پر حکومت نے کبھی پابندی لگائی تھی، اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ مشہور یہی ہے کہ پابندی لگی تھی۔ لیکن تحقیق کی نظر میں

شہرت، صداقت کی مترادف نہیں ہوتی۔ اسی طرح مجہول الاحوال راویوں سے منسوب روایتوں پر اور محض قیاس پر مبنی کسی دعوے کو بطورِ واقعہ قابلِ قبول نہیں قرار دیا جا سکتا''۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ 'مثنویاتِ شوق' پر پابندی کا مسئلہ ہی متنازعہ نہیں بلکہ پابندی کے اسباب بھی متنازعہ رہے ہیں۔ مولانا حالی کے نزدیک پابندی کا سبب ان مثنویوں کا مخربِ اخلاق اور فحش ہونا تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے 'شعر الہند' میں اور پنڈت دتاتریہ کیفی نے 'خم خانۂ جاوید' میں مولانا حالی کے مفروضے کو ہی اپنے الفاظ میں بیان کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ سر رضا علی نے 'اعمال نامہ' میں یہ اشارہ کیا ہے کہ چوں کہ 'زہرِ عشق' کے سامنے 'سحر البیان' کا چراغ گل ہوتا نظر آ رہا تھا اس لیے اہلِ لکھنؤ مرزا شوق کے دشمن ہو گئے اور انگریز حکومت کے کان بھر کر اس پر پابندی لگوا دی۔ امیر احمد علوی وضاحت اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شوق کی مثنویوں کو ایسی مقبولیت عام نصیب ہوئی کہ اگلے سخنوروں کے چراغ ٹمٹمانے لگے اور میر حسن کی 'سحر البیان' فراموش ہو گئی۔ حاسدوں نے ان نظموں کی 'لغزشِ مستانہ' کو پستی اخلاق سے تعبیر کیا۔ سفارشیں اٹھوا کر برسوں ممنوع الاشاعت رکھا''۔

خاں صاحب نے اگرچہ اپنے محتاط مزاج کی مناسبت سے اس مسئلے پر کوئی قطعی فیصلہ صادر نہیں کیا لیکن ان کا یہ قیاس بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مقنّنہ اور عدلیہ سے برسوں تک وابستہ رہنے کے باوجود سر رضا علی نے دوسرے کئی معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی کوئی تحقیق نہیں کی اور علوی کے خیال کو ہی دُہرا دیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے منع اشاعت کی ایک بالکل نئی وجہ بتائی ہے جس کا تعلق صرف 'زہرِ عشق' سے ہے۔ مولانا کے مطابق جب لکھنؤ میں 'زہرِ عشق' کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا تو ''تماشا گاہ ایک بزمِ عزا بن گئی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کی آوازیں تو ہر طرف سے آ رہی تھیں، بعضوں کو غش آ گئے اور ایک آدھ نے شاید خودکشی کی بھی ٹھان لی۔ اس پر تماشے کا دکھانا قانوناً ممنوع قرار دیا گیا اور کتاب کی اشاعت بھی عرصے تک بند رہی''۔

رشید حسن خاں نے اس مسئلے کو ہر زاویے سے دیکھا، پرکھا اور اس سے بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منع اشاعت کے پورے معاملے پر ابہام کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

مولانا حالی اوران کے بعد آنے والے سبھی ناقدین و محققین نے منع اشاعت کی بات تو کہی ہے لیکن نہ تو اپنے ماخذ کا حوالہ دیا ہے اور نہ ہی ان کی تحریروں سے یہ پتا چلتا ہے کہ پابندی تینوں مثنویوں پر لگی تھی یا کسی ایک پر۔ مزید یہ کہ پابندی محض کسی ایک شہر یا صوبے تک محدود تھی یا اطلاق پورے ملک پر ہوتا تھا۔

میں نے خاں صاحب کی پوری اور عالمانہ بحث کا مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ 'زہرِ عشق' پر پابندی ضرور عائد ہوئی تھی اور خواہ بقول ان کے اس مثنوی میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہو۔ خاں صاحب نے اس سلسلے میں نظامی بدایونی کے اس دیباچے سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جو ۱۹۱۹ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہونے والے 'زہرِ عشق' کے پاکٹ اڈیشن میں شامل تھا۔ اقتباس یہ ہے:

> ''یہ مثنوی مرزا شوق کی دوسری مثنویوں کی طرح نایاب ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے ممنوع الاشاعت ہونے کی شہرت نے سالہا سال تک صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں کسی صاحب مطبع کو اس کے چھاپنے کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ اس کی ممانعت طبع کے مسئلے کو حل کرنے کے بعد ہم نے خاص اہتمام کے ساتھ...... اس کی اشاعت کی جرأت کی ہے''۔

نظامی نے ممانعت اشاعت کو فسخ کرنے والے اس سرکاری آرڈر کا حوالہ بھی دیا ہے جسے ۲۲ر جولائی ۱۹۱۹ء کو جوڈیشیل (کریمنل) ڈیپارٹمنٹ نے جاری کیا تھا۔ خاں صاحب نے نظامی کے بیان پر کافی سنجیدگی سے غور کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اس سلسلے میں بڑی چھان بین کی ہے۔ انھوں نے متعلقہ آرڈر کے حصول کے لیے یو پی آرکائیوز سے بھی رابطہ قائم کیا لیکن وہاں سے جواب ملا کہ ان کے پاس ایسی کوئی فائل نہیں ہے۔ ساری بحث کے بعد اس سلسلے میں خاں صاحب جس نتیجے پر پہنچے ہیں اس کا لب لباب یہ ہے:

> ''میں نہیں کہہ سکتا کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔ کیا اس آرڈر کے نمبر غلط ہیں، نا تمام ہیں، یا ایسا کوئی آرڈر تھا ہی نہیں یا یہ کہ تلاش میں کوتاہی برتی گئی یا ایسی ہی کوئی اور وجہ ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اصل سوال جو بار بار میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ واقعتاً کبھی پابندی لگی تھی؟''

مجھے خاں صاحب کے اس ارشاد سے اتفاق ہے کہ 'زہرِ عشق' میں کوئی ایسی بات نہیں

جو قانون کی نظر میں پابندی کی بنیاد بن سکے۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قانون اپنی ایک روایتی تعریف کی رو سے اندھا ہوتا ہے۔ پھر اس زمانے میں تو انگریز افسروں کا زبانی حکم بھی قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ کسی بھی جوڈیشیل مجسٹریٹ نے کچھ لوگوں کے کہنے پر پابندی لگادی ہو۔ یہ لوگ مرزا شوق کے حاسد بھی ہوسکتے تھے اور وہ بھی جو مولانا دریابادی کی نقل کردہ روایت کے مطابق اس مجمع میں شامل تھے جس نے 'زہرِ عشق' پر مبنی ڈرامے کی نمائش کے دوران ہال کو عزاخانہ بنادیکھا تھا اور ایک نوخیز کلی خودکشی پر آمادہ ہوگئی تھی۔

منع اشاعت کے سلسلے میں نظامی بدایونی کا بیان اوپر نقل کیا جاچکا ہے۔ انھوں نے اپنے پیش لفظ میں متعلقہ آرڈر کی منسوخی کی بابت اپنی ذاتی جدوجہد کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر پابندی کو ختم کرنے والے آرڈر کا تاریخ اور نمبر کے ساتھ حوالہ بھی دیا ہے۔ 'زہرِ عشق' کی تاریخ تصنیف کے سلسلے میں ذاکر بدایونی کے قطعے والی تفصیلی بحث کے دوران خود خاں صاحب یہ تسلیم کرچکے ہیں کہ نظامی ایک ذمے دار، معتبر اور صاحبِ کردار شخص تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص سے کسی غلط آرڈر کا حوالہ دینے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر پابندیِ اشاعت کا آرڈر جاری ہی نہ ہوا ہوتا تو منسوخی کا آرڈر کیسے جاری کیا جاسکتا تھا۔ مزید یہ کہ ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ میں ایک سے ایک بڑا عالم اور ادیب موجود تھا۔ اگر مثنوی پر پابندی اور پھر منسوخی کے احکام جعلی ہوتے یا نظامی نے غلط بیانی سے کام لیا ہوتا تو یہ لوگ خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔

جہاں تک یو پی آرکائیوز سے رابطہ قائم کرنے اور چھان بین کرنے کا سوال ہے، رشید حسن خاں کی کوششیں یقیناً لائقِ تعریف و ستائش ہیں۔ انھوں نے معاملے کی تہ تک پہنچنے اور حقیقتِ حال دریافت کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ آرکائیوز میں متعلقہ فائل کا نہ مل سکنا قطعاً کوئی حیرت انگیز واقعہ نہیں ہے، ہاں اگر فائل مل جاتی تو یقیناً یہ ایک حیرت انگیز واقعہ بلکہ حادثہ ہوتا۔ سرکاری دفتروں کا عالم تو یہ ہے کہ کل کا کاغذ آج نہیں ملتا۔ اتنی پرانی فائل کون ڈھونڈتا اور کیسے ملتی۔ یہاں ایک تکنیکی پہلو کی طرف اشارہ کردینا بھی مناسب ہوگا۔ اگرچہ یو پی آرکائیوز کے بارے میں میں کوئی حتمی دعوا نہیں کرسکتا لیکن عام طور سے آرکائیوز میں صرف مستقل اہمیت والی فائلیں ہی ہمیشہ کے لیے یا بہت طویل عرصے تک کے لیے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ دوسری فائلوں کی عمریں مقرر

کردی جاتی ہیں۔ کچھ کو بیس سال بعد، کچھ کو تیس سال بعد اور کچھ کو چالیس سال بعد تلف کردیا جاتا ہے۔ بہت سی فائلوں کا قلع قمع تو سرکاری بابو ہی کردیتے ہیں اور متعلقہ دفاتر سے آرکائیوز تک سفر کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ایسی صورت میں یوپی آرکائیوز کا وہ جواب جو خاں صاحب کے پاس محفوظ ہے اس سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیے۔

قانون کی نظروں میں مبنی بر قرائن شہادتوں (Circumstantial evidences) کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے 'مثنویاتِ شوق' کے توسط سے جو شہادتیں آئی ہیں یعنی مولانا حالی سے لے کر نظامی بدایونی تک نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ کم از کم 'زہرِ عشق' پر غلط یا صحیح لیکن پابندی ضرور عائد ہوئی تھی۔

رشید حسن خاں نے آخر میں 'مثنویاتِ شوق' کی مختلف اشاعتوں، زبان و بیان کی نزاکتوں اور اشعار میں کمی بیشی جیسے ذیلی موضوعات سے جو بحث کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سچ پوچھیے تو انھوں نے تحقیق تدوین کا حق ادا کردیا ہے۔ علاوہ ازیں 'گلزارِ نسیم' کی طرح 'مثنویاتِ شوق' کے ساتھ بھی انھوں نے جو تشریحی ضمیمے شامل کیے ہیں ان سے کتاب کی قدر و قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ چاروں ضمیمے نہ صرف اساتذہ اور طلبہ بلکہ عام قارئین کے لیے بھی معلومات کے بیش بہا خزانوں کا حکم رکھتے ہیں۔ ایسے بے شمار الفاظ، تراکیب، اسما، اصطلاحات اور تلمیحات ہیں جن سے ہم جیسے قاری روز دوچار ہوتے رہتے ہیں لیکن جن کے حقیقی تلازمات ہماری دسترس سے دور ہی رہتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہر اردو داں جانتا ہے کہ ذوالفقار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مخصوص تلوار کا نام تھا لیکن بیشتر لوگ اس کی تاریخی اور عقائدی اہمیت سے واقف نہیں ہیں۔ اس حد تک کہ عموماً لغت نگاروں نے بھی اس کی تشریح پر کوئی توجہ نہیں دی۔ خاں صاحب نے حسبِ عادت اس سلسلے میں بھی کافی تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے۔ انھوں نے دائرۂ معارف اسلامیہ (لاہور) کے حوالے سے بتایا ہے کہ ذوالفقار اس ''مشہور تلوار کا نام ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوۂ بدر میں بطورِ مالِ غنیمت ملی تھی''۔ اس تلوار کا پہلا مالک العاص بن منبہ نامی ایک مشرک تھا جو جنگ میں مارا گیا۔ بعد ازیں سرورِ کائنات نے مولائے کائنات کو وہ تلوار بطورِ تحفہ عنایت فرمائی۔

لیکن شیعی عقائد کے مطابق ذوالفقار کی اہمیت اور اس کا مرتبہ کچھ اور ہی ہے۔ خاں

صاحب نے ڈاکٹر نیر مسعود کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ تلوار شیر خدا کے لیے آسمان سے جبرئیلؑ کے ہمراہ اُتاری گئی تھی۔ اسی طرح عام خیال یہ ہے کہ ذوالفقار دو زبانوں والی تلوار تھی۔ اسی لیے شعرا خصوصاً مرثیہ نگاروں نے اس کے لیے 'شمشیر دو زباں'، 'دوسر' یا 'دو پیکر' جیسی تراکیب استعمال کی ہیں لیکن خاں صاحب کی تحقیق کے مطابق ذوالفقار دو زبانوں والی تلوار نہیں تھی۔

رشید حسن خاں نے ایسے ہی بہت سے دوسرے مسائل سے بڑی ہی دلچسپ اور تفصیلی بحث کی ہے۔ ان سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف ایک اور ایسی مثال پر اکتفا کروں گا جو میری طرح بہتیرے قارئین کے لیے بھی انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔ 'زہرِ عشق' کا یہ شعر:

کون حیدر کا مرتبہ سمجھا   کوئی بندہ کوئی خدا سمجھا

بظاہر منقبت کا ایک عام سا شعر ہے۔ خاں صاحب نے اس کی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ''کوئی خدا سمجھا'' والے ٹکڑے کے پیچھے ایک پوری تاریخ ہے۔ اس ٹکڑے کا اشارہ فرقۂ نعیری کی طرف ہے جو دائرۂ معارف اسلامی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق شیعوں کا ایک غالی فرقہ ہے اور جس کے پیرو ''حضرت علیؓ کی ربوبیت کے قائل ہیں، جو بادلوں میں سکونت پذیر ہیں۔ ''فرقۂ نعیری کے پیرو بادل کو دیکھ کر حضرت علیؓ پر سلام بھیجتے ہیں ...... نعیری شراب کو نور سمجھ کر حلال جانتے ہیں، اسی لیے انگور کی بیل کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں ...... فرانسیسی انتداب (۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۵ء) نے نعیریوں کا نام بدل کر 'علویون' رکھ دیا، ان کو علاحدہ قومیت قرار دیا اور ان کو بہت سی مراعات سے نوازا اور فوج میں ان کو زیادہ تعداد میں بھرتی کیا ...... آج کل شام میں جو سوشلسٹ بعث پارٹی برسرِ اقتدار ہے اس کے بیشتر ارکان علوی ہیں ......''

اس موقعے پر میرے ذہن میں ایک اور چھوٹا سا سوال اُبھر رہا ہے جس پر رشید حسن خاں ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ وہ سوال یہ ہے کہ ہم عصر اردو ادب کے مشہور و معروف علوی حضرات کیا فرقۂ نعیری سے ہی تعلق رکھتے ہیں یا پھر وہ کسی اور طرح کے علوی سیّد ہیں۔

آخر میں صرف اتنا اور عرض کرنا ہے کہ رشید حسن خاں کا مرتّب کردۂ نسخہ 'مثنویاتِ شوق' ہر لحاظ سے مکمل نسخہ ہے۔ اس کے سامنے دوسرے تمام نسخے ہیچ نظر آتے ہیں۔

○○○

شمس بدایونی

رشید حسن خاں کی یاد میں

۲۶رفروری ۲۰۰۶ء بروز اتوار، صبح کے سات بجے تھے، میں سفر کے لیے تیار ہوکر پورٹیکو کے قریب پہنچ چکا تھا معاً فون کی گھنٹی بجی۔ میں واپس ہوا، ریسیور اٹھایا، اُدھر سے آواز آئی ''میں، حنیف نقوی ـــ رشید حسن خاں صاحب کا رات انتقال ہوگیا۔ آپ ان کی تدفین میں شریک ہوسکتے ہیں''۔ میں کسی اہم وجہ سے اپنے سفر کو ملتوی نہیں کرسکا اور تدفین میں شرکت سے معذور رہا، مگر اس دن ایک اضمحلال کی کیفیت طاری رہی۔ اُن سے ملاقاتیں، فون پر کی گئیں باتیں ایک ایک کرکے یاد آتی رہیں۔ اُن کی اعتماد و یقین سے بھرپور آواز، کاٹ دار جملے، بے تکلف لہجہ، کچھ خاص تکیہ کلام۔ ہاں بھائی، ارے بھئی، دیکھیے، یہ جو ہیں نا، ہاں بس۔ اُن کے لہجے اور بیان کا طنطنہ سماعت پر بار بار دستک دیتا رہا۔ میں کبھی محظوظ ہوتا رہا اور کبھی ملول۔ اب یہ آواز سننے کو کہاں ملے گی؟ کون اس طرح دوٹوک انداز میں پکارے گا؟

(۱) ''ہیلو۔ ارے بھئی! آپ کہاں ہیں؟ ایک ماہ ہوگیا آپ کا کوئی فون نہیں آیا۔ دیکھیے شمس صاحب، کم از کم مہینے میں ایک بار ضرور فون کیجیے یا پھر ـــ تعلق منقطع کرلیجیے''۔

(۲) ''ہیلو۔ جی، میں شمس بول رہا ہوں۔ ہاں بھئی شمس صاحب کیسے ہیں آپ؟ آپ کے بچے کیسے ہیں؟ کیسی ہے ہماری بہو؟ اور ہمارے لطیف صاحب ٹھیک ہیں؟ کاروبار کیسا چل رہا ہے آپ کا؟ کیا لکھ رہے ہیں آج کل آپ؟ دیکھیے شمس صاحب، میں برابر سُن اور پڑھ رہا ہوں کہ آپ لگاتار سمیناروں میں شرکت کررہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے آپ کو جم کر سنجیدگی کے ساتھ کسی موضوع پر تین چار سال کام کرنا چاہیے۔ بس اگر

آپ یہ نہیں کریں گے تو خود کو ضائع کر دیں گے۔ ارے بھائی، میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں آپ سے کچھ بہتر توقعات رکھتا ہوں۔ باقی آپ کی مرضی۔"

(۳) ہیلو۔ کہیے شمس صاحب، کیسے ہیں آپ جی، میں ایک مضمون نواب محمد یار خاں امیرؔ پر لکھنا چاہتا ہوں۔ مواد اکٹھا کر لیا ہے۔ رُکیے شمس صاحب! کیا آپ نے ناظمؔ رامپوری کا یہ شعر سنا ہے؟

غلطی غیر کی گفتار کی دیکھی ناظم
جب میں جاتا ہوں تو کہتا ہے نواب آتے ہیں

سمجھ گئے نا؟ جی، میں سمجھ گیا۔ صحیح تلفظ 'نوّاب' ہے۔ ہاں اب بتایئے۔ کیا امیر کے حالات و کلام یکجا کرنا ٹھیک ہوگا؟ ...... سنیے شمس صاحب، امیرؔ ادب میں صرف اپنے ایک شعر:

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

کی وجہ سے مشہور ہیں اور مشہور رہیں گے، بس۔ اس سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں۔ آپ ان پر اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟ دیکھیے، موضوع کی ترجیح کو ذہن میں ضرور رکھا کیجیے۔ قاضی عبدالودود نے رضاؔ عظیم آبادی پر تحقیق کی۔ بلاشبہ اعلا درجے کا کام کیا۔ رضا بے چارے کو کیا ملا؟ وہ آج بھی غیر معروف اور غیر اہم شاعر ہے۔ آپ کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اپنا وقت ایسے ویسے کاموں میں برباد نہ کیجیے۔ صرف ڈھنگ کے کام کیجیے۔ جیسے آپ پہلے بھی کر چکے ہیں"۔

(۴) ہاں شمس صاحب، وہ جو فلاں صاحب ہیں نا، وہ تو فرقۂ ملامتیہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں معائب کے کیڑے بری طرح بلبلا رہے ہیں اور آپ لکھتے ہیں کہ وہ عالم و فاضل ہیں۔ بھائی یہ سب کیا ہے؟ کیا آپ بھی اوروں کی طرح دنیا ساز بن گئے؟ دیکھیے شمس صاحب ایک بات سمجھ لیجیے۔ تحقیق شرک کو گوارا نہیں کرتی۔ آپ اگر کسی کو ناراض نہیں کر سکتے تو قلم رکھ دیجیے۔ دنیا میں بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ آپ تحقیق ہی کریں"۔

• دن بھر میں ان کی آواز میں قید رہا۔ وہ مجھے مخاطب کرتے رہے اور میں ایک نیاز مند کی طرح سنتا رہا۔ رات کو جب گھر واپس لوٹا تو گیارہ بجے شب ان کے بیٹے خورشید حسن

خاں کو میں نے فون کیا۔ تب معلوم ہوا کہ ۲۵ اور ۲۶ رفروری کی درمیانی شب ۲ بجکر ۴۰ منٹ پر ان کو دل کا دورہ پڑا اور روح پرواز کرگئی۔ ۲۶ رفروری کی شام پانچ بجے باروزئی، پشاوری قبرستان شاہجہانپور میں ان کی تدفین ہوئی۔

رشید حسن خاں صاحب سے میرا تعلق کب قائم ہوا صحیح طور پر یاد نہیں۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ ۱۹۸۸ء میں جب میری کتاب 'اردو لغت کا شرعی محاسبہ' شائع ہوئی، اس پر انھوں نے 'غالب نامہ' دہلی (جنوری ۱۹۸۹ء) میں تبصرہ لکھا تھا۔ اُس وقت تک میرے اور ان کے بیچ شناسائی کا رشتہ قائم نہیں ہوا تھا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے میری طلب و خواہش کے بغیر محض موضوع کے بدیع و نادر ہونے کے سبب تبصرہ لکھا اور خوب لکھا۔

میرا علمی مقالہ 'نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات' جب ۱۹۹۵ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا تو اس کی ایک کاپی خاں صاحب کو بھی ارسال کی گئی۔ خاں صاحب نے ۹ رجون کو مجھے ایک طویل خط لکھ کر مقالے کی بھرپور داد دی اور تبصرہ کرنے کا وعدہ فرمایا۔ میرے دل میں خاں صاحب کے علم و فضل، احتساب و سخت گیری کا جو رعب و دبدبہ تھا اس خط کو پڑھ کر وہ احساس ان سے نیازمندی اور ان کی محبت میں تبدیل ہوگیا۔ اُس وقت وہ دہلی میں تھے۔ اسی خط میں انھوں نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ آج کل وہ 'مثنویاتِ شوق' مرتب کررہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں 'مثنوی زہرِ عشق' کے نسخۂ نظامی (یعنی نظامی پریس بدایوں سے شائع شدہ) کی تلاش تھی جس کا طبعِ ثانی شمس الرحمٰن فاروقی سے مل گیا لیکن طبع اول ۱۹۱۹ء نہیں مل سکا۔ اس خط میں انھوں نے لکھا:

> ''آپ کے نظامی صاحب (نظامی بدایونی) نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے آج کل۔ 'زہرِ عشق' کا نسخۂ نظامی میرے پاس نہیں تھا، بارے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بھیج دیا۔ اور ایک نسخہ بدایوں سے آگیا۔ اس میں مرحوم نے تنسیخ ممانعت کے آرڈر کا نمبر بھی لکھا ہے۔ مگر حسبِ معمول ادھوری بات لکھی ہے اور اندازِ بیان بڑا مبہم ہے۔ کچھ بھی واضح نہیں ہوتا۔ میں نے الٰہ آباد آرکائیوز میں اس نمبر کے آرڈر کو نکلوانا چاہا معلوم ہوا کہ وہاں ۱۸۵۷ء تک کے کاغذات ہیں۔ بعد کے کاغذ لکھنؤ میں ہیں۔ اب لکھنؤ آرکائیوز کے لیے دو حضرات کو لکھا ہے۔ دیکھیے کیا رہتا ہے۔ مرحوم اگر ذرا سی وضاحت کردیتے تو اس قدر پریشانی نہ

ہوتی۔ قطعۂ تاریخ کا بھی احوال یہی ہے۔ شوق کی عمر اس وقت ۷۷ برس کی تھی اور ذاکر ۲۷ برس کے تھے۔ اس کو معاصرت اور مصاحبت کیسے کہیں گے؟ پھر حوالہ حسب معمول ادھورا بلکہ مجہول۔ اب اس کی تصدیق کے لیے سرگرداں ہوں۔ ہاں آپ یہ پتا لگا سکتے ہیں کہ ذاکر مرحوم لکھنؤ میں کس زمانے میں تھے اور کیا کرتے تھے؟ ہے کوئی صورت؟''

(خط مکتوبہ ۹رجون ۱۹۹۵ء)

اسی سلسلے کی بعض باتیں اور بھی تھیں جو بعد کے کئی خطوط میں زیرِ بحث آئیں۔ مثلاً ایک خط میں انھوں نے مجھے لکھا:

''کتاب میں (مراد 'نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات') ص ۱۴۷ پر ذاکر بدایونی کا قطعۂ تاریخ مشمولہ زہر عشق درج کیا گیا ہے۔ اس میں تین باتیں ایسی ہیں جن سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

آخری مصرعے کے آخر میں 'کذا' ہے۔ یہ کیوں آیا ہے؟ اس کا تعلق پورے مصرعے سے ہے یا کسی خاص لفظ سے؟

'آیی' لکھا گیا ہے، مگر اصل نسخے (زہرِ عشق طبع ۱۹۲۰ء) میں 'آئی' ہے۔ اسے کیوں بدلا گیا۔ جب کہ بقول اساتذۂ فنِ تاریخ، 'آئی' کے ۲۱ عدد ہوتے ہیں۔ اور وہی یہاں مراد لیے گئے ہیں۔

چوتھے مصرعے میں 'رہنمائی' ہے۔ مگر اصل نسخے میں اس جگہ 'رونمائی' ہے۔ اسے کیوں بدلا گیا؟

میں نے ازراہِ احتیاط (نہ کہ ازراہِ اعتراض) یہ باتیں پوچھی ہیں کہ شاید طبع اول (۱۹۱۹ء) میں اسی طرح ہو۔ وہ اشاعت یعنی طبع اول مجھے نہیں ملی۔ دوسری اشاعت (۱۹۲۰ء) میرے سامنے ہے''۔

(خط مکتوبہ ۷رفروری ۱۹۹۶ء)

خط کے مذکورہ اقتباسات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ متن کے اجزا کو کتنی باریک بینی سے دیکھا کرتے تھے اور اس کے اختلافات کو آخری حد تک حل کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

رشید حسن خاں جن دنوں مثنویاتِ شوق مدون کر رہے تھے، انھوں نے اس کے طویل مقدمے کے بعض حصے مختلف مضامین کی صورت میں ہمعصر رسائل میں شائع کرادیے۔ جولائی ۱۹۹۶ء کے 'آجکل' (دہلی) میں ان کا ایک مضمون 'مثنویاتِ شوق منعِ اشاعت' شائع ہوا جس میں انھوں نے ان مثنویات یا ان میں سے کسی ایک مثنوی کی اشاعت پر حکومت کے ذریعے لگائی گئی پابندی کی روایت کو بعض دلائل کی بنیاد پر قطعی طور پر رد کردیا اور نظامی بدایونی (ف ۱۹۴۷ء) کے نسخۂ ممانعتِ اشاعت کے آرڈر اور اس کے نمبر و تاریخ کے اندراج کو بھی فرضی قرار دیا۔ اس مضمون پر کاظم علی خاں (لکھنؤ) اور بعض دوسرے قلم کاروں نے 'آجکل' میں خطوط لکھ کر خاں صاحب کے نتائج و خیال سے اختلاف کیا۔ راقم الحروف بھی خاں صاحب کے نتائج سے متفق نہیں تھا۔ راقم نے اس سلسلے میں خاں صاحب کو خط لکھ کر اپنے اختلاف سے آگاہ کیا جس کے جواب میں انھوں نے لکھا:

''نظامی کا آرڈر نمبر ہو یا مولانا حالی، سیّد ضامن علی اور ایسے ہی دوسرے بزرگوں کی روایتیں، جب تک ان کا قابلِ قبول ثبوت نہ ملے یہ قابلِ استدلال نہیں ہوسکتیں۔ ہمارے بزرگ بہت زود یقین اور خوش گمان تھے۔ اس لیے ہمیں ان کی تحریروں سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے مگر آدابِ تحقیق کے تحت۔ آپ کے اندازِ نگارش سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ مولانا نظامی ہیرو بن گئے ہیں۔ دیکھیے ہیرو ورشپ درست اندازِ فکر نہیں۔ نسخۂ نظامی میں ۵ شعر الحاقی ہیں تو کیا انھیں مان لیا جائے گا؟ اس طرح مت سوچا کیجیے۔ 'ایوانِ اردو' کے حالیہ شمارے میں جو تحریریں شائع ہوئی ہیں اس میں الحاقی اشعار کا کچھ بیان آگیا ہے۔ مجھے قاضی عبدالودود صاحب کا یہ قول ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ مُردوں کا حق ہم پر زندوں سے زیادہ نہیں۔ راوی مرحوم ہو یا زندہ ایک ہی طریق کار اختیار کیا جائے گا۔ قبول روایت میں''۔

(خط مکتوبہ ۱۳/جولائی ۱۹۹۶ء)

خاں صاحب کا جواب موصول ہونے کے بعد میں نے مدیرِ 'آجکل' کو ایک خط لکھا جس میں خاں صاحب سے اس بحث کو مزید صاف کرنے کی گزارش کی۔ خط کا متعلقہ حصہ حسبِ ذیل ہے:

''رشید صاحب کو جتنا عرصہ لکھتے ہوگیا، شاید میری عمر بھی اس کی برابری نہ کرسکے۔ ان کو مجھ سے جو غایت درجہ محبت ہے اس کا تقاضا تھا کہ میں بہ سروچشم ان کی بات کو درست مان لوں۔ اب کاظم علی خاں صاحب نے جو کچھ لکھا ہے میں سمجھتا ہوں یہی بات اور نہ معلوم کتنے ذہنوں میں آئی ہوں گی۔ تازہ شمارے (اکتوبر) میں جناب عالم گیر (سدھارتھ نگر) نے اپنے مکتوب میں چند اور سوالات قائم کردیے ہیں۔

میری جناب رشید حسن خاں سے گزارش ہے کہ ان کی بحث اور اس بحث کا نتیجہ یقیناً درست ہوسکتا ہے لیکن اس بحث کو ابھی مزید صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً نظامی کے حوالے سے جو اجازت نامہ معِ آرڈر نمبر کے زیرِ گفتگو ہے اس کی تردید کے لیے واضح گفتگو ضروری ہے''۔

(آجکل، دہلی، دسمبر ۱۹۹۶ء)

خاں صاحب نے اس بحث کو اسی طرح اپنے مقدمے میں شائع کردیا۔ میں نے نظامی بدایونی کے پوتے جناب مونس نظامی سے کئی بار خط لکھ کر گزارش کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنا موقف پیش کریں مگر وہ خاموش رہے۔ سالِ گزشتہ انھوں نے مجھے بتایا کہ آرڈر نمبر کی کاپی انھیں پرانے کاغذات میں مل گئی ہے اور اس کے وجود سے انھوں نے رشید حسن خاں کو بھی مطلع کردیا ہے۔ آگے کیا ہوا مجھے معلوم نہیں۔

اسی سلسلے کا ایک مضمون 'ایوانِ اردو' دہلی (اپریل ۱۹۹۸ء) میں بہ عنوان 'مثنویات شوق - لکھنوی معاشرے کے آئینے میں' شائع ہوا تھا جو بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ خاں صاحب نے اس مضمون میں عبدالحلیم شرر کی 'گزشتہ لکھنؤ' اور حکیم نجم الغنی خاں کی 'تاریخ اودھ' کے حوالے سے لکھنؤ کی پُرتعیش زندگی کا ایک خاص انداز میں تذکرہ کیا تھا اور لکھنوی معاشرے میں طوائف کے کردار کو جزوِ زندگی دکھایا تھا۔ معاشرے کے سوادِ اعظم پر اربابِ نشاط کے تسلط کو شوقؔ کے اشعار کا پس منظر قرار دیتے ہوئے شوقؔ کی مثنویات کو لکھنوی معاشرے کا آئینہ دار بتایا تھا۔ بعض حلقوں نے اس مضمون کو اہالیانِ لکھنؤ کی تذلیل سمجھا۔ چناں چہ پروفیسر نیر مسعود نے اس کا جواب ایک مراسلے نما مضمون 'بہ نام رشید حسن خاں' کے عنوان سے دیا جو 'ایوانِ اردو' (دہلی) کی جولائی ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں شامل ہوا۔ یہ

بہت سخت جواب تھا جس میں ظاہری آداب واخلاق کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ میں اس مضمون کو پڑھ کر لرز گیا اور کئی مرتبہ میرے لبوں پر یہ مصرعہ آ گیا:

مشکل بڑی پڑے گی برابر کی چوٹ ہے

لیکن خاں صاحب نے خاموشی اختیار کرلی۔ دونوں قلم کار ذی علم وذی احترام۔ میں نے مدیر 'ایوانِ اردو' کو ایک خط لکھا جو ستمبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ خط حسبِ ذیل ہے:

''ایوانِ اردو' کے تازہ شمارے میں پروفیسر نیر مسعود صاحب کا مراسلہ نما مضمون نظر سے گزرا۔ نیر صاحب اور رشید حسن خاں صاحب دونوں میرے کرم فرما ہیں اور دونوں بزرگوں کا ان کی علمی خدمات اور ایک خاص ذہنی معیار کے سبب میرے دل میں بڑا احترام ہے، لیکن اُن کے مضمون کے تیور دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ ایک معاصر دوسرے معاصر کے لیے کیسے رطب اللسان ہوتا ہے اس کا نمونہ نیر صاحب کا تبصرہ 'فسانۂ عجائب' مرتبہ رشید حسن خاں مشمولہ 'کتاب نما' (دہلی) میں دیکھا تھا اور ایک معاصر اپنے معاصر کے لیے کیسے دل آزار بن جاتا ہے اس کا یہ دوسرا نمونہ ہے۔ ایک ہی قلم سے بہت مختصر سے وقت کے اندر دو متضاد تحریروں نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ بڑے لوگوں سے بڑے اخلاق کے مظاہرے کی توقع کی جاتی ہے۔ میری مودبانہ گزارش ہے کہ نیر صاحب نے اگر اپنے خیالات پیش کرنے میں عجلت اور جذباتیت سے کام لیا ہے تو جناب رشید حسن خاں ایسا نہ کریں۔ اگر اس علم وفضل کے لوگ ایک دوسرے کے لیے ادب واحترام کی تمام حدیں توڑ دیں گے تو ہم جیسے ادب کے طالب علم کس کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے''۔

اسی شمارے میں پروفیسر عبدالحق (دہلی) اور لطیف صدیقی (لکھنؤ) کے مضامین شائع ہوئے جس میں انھوں نے نیر صاحب کی تحریر کو جذباتی، غیر سنجیدہ اور غیر علمی اسلوب کا حامل بتایا۔ دونوں مضمون نگاروں نے یہ تاثر بھی دیا کہ دراصل خاں صاحب کو یوپی اردو اکیڈمی کے مولانا آزاد ایوارڈ ملنے سے لکھنؤ کے بعض حلقے رنجیدہ ہیں اور شاید یہ مضمون اسی رنجیدگی کے آنسوؤں سے لکھا گیا ہے۔ خیال رہے ۱۹۹۷ء کا آزاد ایوارڈ خاں صاحب کو دیا گیا تھا جو ایک لاکھ روپے اور ایک توصیفی سند پر مشتمل تھا۔

اس سلسلے میں خاں صاحب نے مجھے جو خط لکھا اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ انھوں نے لکھا:

''میں ۲۷ر ستمبر (۱۹۹۸ء) کو دو ماہ کے بعد واپس آسکا۔ یہاں آپ کا خط محفوظ تھا۔ مطبوعہ خط پہلے ہی پڑھ چکا تھا، اس کا شکریہ۔ متعدد لوگوں نے مجھ سے میر صاحب (مراد پروفیسر نیر مسعود) کے لب و لہجے کی شکایت کی۔ انھوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ میرا کچھ نہیں بگڑا۔ علمی مسائل تبرّائی زبان میں زیرِ گفتگو نہیں آسکتے۔ آپ محمد شاہ رنگیلے کی خرابیوں کو بیان کیجیے کوئی دہلی والا برا نہیں مانے گا۔ یہ نہیں سمجھے گا کہ دہلی کی تہذیب کو بُرا کہا جارہا ہے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کے کسی مسخرے حکمراں (نصیرالدین حیدر یا واجد علی شاہ) کی واقعی خرابیوں پر کچھ کہیے، سمجھا جائے گا کہ پورے لکھنؤ، لکھنوی تہذیب اور شیعہ کمیونٹی پر حملہ کیا گیا ہے۔ یہ وہی اقلیت کی نفسیات ہے جس میں لسانی یا مذہبی اقلیتیں اکثر مبتلا رہتی ہیں۔

بہ ہر طور اس کے بعد سے بھی مجھ سے اُن سے (مراد نیر مسعود) مراسلت حسبِ سابق برقرار ہے۔ اِدھر پرسشِ احوال کے دو خط یکے بعد دیگرے آئے ہیں۔ مشیر لکھنوی کی ہر سیہ گوئی مشہور ہے۔ میرے بھائی نے نثری ہرسیہ لکھا ہے۔ خیر، یہ ان کا معاملہ ہے، وہ جانیں۔ 'ایوانِ اردو' میں لطیف صدیقی کی تحریر آپ نے پڑھی ہوگی اُن کا خط بھی میرے پاس آیا تھا۔ میں نے مزید کچھ لکھنے سے منع کردیا۔ غیر علمی باتیں جس قدر کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ مرحوم سیّد مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا نجم الغنی خاں کو 'نجم الغبی' کہا کرتے تھے۔ یوں کہ انھوں نے پوست کندہ حالات لکھے ہیں 'تاریخِ اودھ' میں۔

ہاں! 'کتاب نما' کے حالیہ شمارے میں جین صاحب کا تبصرہ مثنویاتِ شوق پر پڑھا؟ اصلاً یہ سارا معاملہ اُس مولانا آزاد ایوارڈ کا تھا۔ اکبر حیدری نے کراچی کے 'طلوعِ افکار' میں بھی کچھ گل افشانی فرمائی ہے۔ انعام کا اعلان ہوتے ہی یہی تحریر انھوں نے 'قومی آواز' میں چھپوائی تھی۔ لب لباب یہ تھا کہ بڑے غیر مستحق شخص کو اب کے یہ انعام دیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ

بھی لکھا ہے کہ وہ روزانہ نیر مسعود صاحب کے یہاں جاتے ہیں۔ خیر حیدری صاحب کو میں غیر مکلّف مانتا ہوں بہ لحاظِ تحقیق۔ یوں وہ کیا اور ان کی بات کیا''۔

(خط مکتوبہ ۴؍اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اسی سلسلے میں ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''میں نے اس ایوارڈ کے ملنے کے جواب میں انٹرویو میں (مطبوعہ 'انقلاب' بمبئی، ۱۳؍اکتوبر ۱۹۹۸ء) جو کچھ کہا (سچی بات) اس پر بھی اب اہلِ لکھنؤ خوش نہیں، نہ ہوں، برپشم قلندر۔ وہاں سے دو خط آئے ذاتی''۔

(خط مکتوبہ ۲۸؍اکتوبر ۱۹۹۸ء)

جولائی ۱۹۹۷ء میں انھوں نے میرے علمی مقالے 'نظامی بدایونی ......' پر تبصرہ لکھ کر مجھے بھیجا، اس نوٹ کے ساتھ کہ آپ 'جہاں چاہیں' اور 'جس طرح چاہیں' چھپوا سکتے ہیں۔ جہاں چاہیں کا مفہوم واضح تھا لیکن 'جس طرح' کا مفہوم میں نے یہی سمجھا کہ تبصرے کے ناپسندیدہ حصے کو حذف کیا جاسکتا ہے۔ میں نے تبصرہ من وعن 'ایوانِ اردو' (دہلی) کو بھیج دیا جو نومبر ۱۹۹۷ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ خاں صاحب نے ملاحظہ فرمایا۔ فون پر بات ہوئی، کہنے لگے لگتا ہے تبصرہ آپ کو پسند آیا۔ میں نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے لوگ غلطیوں اور تسامحات کی نشاندہی پر ناراض ہوجاتے ہیں۔ آپ نے اسے من وعن شائع کر کے علمی اخلاق کا ثبوت دیا۔ آپ سے یہی توقع تھی۔ خاں صاحب نے اس تبصرے میں صرف دو مقامات کی گرفت کی تھی، باقی حصہ سراسر توصیفی تھا۔ انھوں نے تبصرے میں لکھا:

''پچھلے بیس پچیس برسوں میں دانش گاہوں سے جن مقالات پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے ان میں جو چند مقالے تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابلِ ذکر قرار دیے جائیں گے ان میں یہ مقالہ بھی شامل ہوگا اور شامل ہونا چاہیے''۔

سطورِ بالا میں جو کچھ مذکور ہوا اس کا تعلق یا تو فون پر کی گئی گفتگو سے ہے یا نصف ملاقات یعنی خط کتابت سے۔ ان سے بالمشافہ ملاقاتیں کم ہوئیں۔ باوجود اس ذہنی قربت، ہم خیالی اور محبت کے ملاقات کے مواقع بہت کم حاصل ہوئے۔ ایک خط میں اس بات کو انھوں نے کس خوب صورت پیرائے میں لکھا ہے:

''بریلی آنا نہیں ہو پاتا، یوں کہ بہت قریب ہے۔ قربت کے یہ کرشمے اکثر دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ آدمی اپنے سے قریب بھی اسی لیے نہیں ہو پاتا کہ وہ اپنے سے دور نہیں ہوتا۔ اسی لیے تصوف میں عرفانِ ذات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ بہر صورت کبھی تو توفیق ہوگی''۔

(خط مکتوبہ ۱۴/اگست ۱۹۹۶ء)

''بمبئی شاید دو چار ماہ میں پھر جانا ہوگا۔ اچھا ہے اس درمیان آپ لوگوں سے دو چار بار ملاقات ہو جائے۔ معلوم نہیں پھر کب اور کہاں ملاقات ہو؟''

(خط مکتوبہ ۲۸/اکتوبر ۱۹۹۸ء)

خاں صاحب پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۹۵ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی میں سہ روزہ سمینار (۲۲ تا ۲۴/دسمبر) کے دوران ہوئی۔ اس ملاقات میں انھوں نے محبت و شفقت کے جتنے جام تھے سبھی لنڈھا دیے۔ انھوں نے سمینار میں مجھے خود سے علاحدہ نہیں ہونے دیا۔ دوپہر کا کھانا بھی ساتھ ہی کھایا۔ میں مرغ و بریانی کے مزے لے رہا تھا، انھوں نے محض سبزیوں کے سلاد پر قناعت کرلی تھی۔ سمینار کے مختلف اجلاسوں میں بھی وہ مجھے اپنے پاس بیٹھنے کی تاکید کرتے رہے۔ گفتگو کے دوران وہ میری ذہنی سطح، مطالعے اور مشاہدے، مزاج و نفسیات کو ماہرانہ انداز میں جانچتے اور آنکتے رہے۔ انھوں نے متعدد علمی موضوعات پر گفتگو کی۔ اُس وقت وہ دہلی یونیورسٹی کے گوائر ہال میں رہتے تھے۔ سمینار کے اجلاسوں میں وہ شریک ہوتے اور شام کو واپس چلے جاتے۔

۲/فروری ۱۹۹۶ء کو وہ تمام اسباب لے کر دہلی سے شاہجہانپور آگئے اور یہیں انھوں نے اپنے گھر پر لکھنے پڑھنے کی بساط بچھا دی۔ اس دوران انھوں نے بہت کام کیا۔ اُن سے مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔

میں ۷/اکتوبر ۱۹۹۷ء کو ملاقات کے لیے شاہجہانپور ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا، بہت خوش ہوئے اور بڑی تواضع کی۔ چلتے وقت تین کتابیں نذر کیں:

(۱) مثنوی زہر عشق جدید تحقیق و تبصرہ کی روشنی میں از عشرت رحمانی، عکسی کاپی

(۲) مقالاتِ صدیقی، جلد اول، از عبدالستار صدیقی، مطبوعہ یوپی اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء

(۳) انجوم الفرقان فی اطرافِ القرآن (بہ زبان فرنچ) از گستووس فلیجل، مطبوعہ ۱۸۹۸ء

موخرالذکر قرآن کریم کے الفاظ کا اشاریہ ہے۔

خاں صاحب کا گھر سادہ سا بنا ہوا تھا۔ جس کمرے میں، مَیں بیٹھا تھا، اس کی نوعیت ڈرائنگ روم کم ریڈنگ روم کی سی تھی۔ چاروں طرف الماریوں میں کتابیں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ سینٹر ٹیبل کے پاس ہی کسی چھوٹی ٹیبل یا اسٹول پر ادبی رسائل سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ کمرے میں ایک طرف ریڈنگ ٹیبل تھی جو ضخیم لغات کی جلدوں سے لدی ہوئی تھی۔ اسی ٹیبل پر پین اسٹینڈ میں بہت سے پین اور داہنی طرف ایک ٹیپ ریکارڈر اور بہت سے کیسٹ رکھے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر کمرہ کتابی ماحول پیش کر رہا تھا۔ میں نے بڑی حیرت اور استعجاب سے پوچھا۔ جناب! ٹیبل پر ٹیپ ریکارڈر کا موجود ہونا آپ کا اس سے غیر معمولی شغف ظاہر کرتا ہے۔ کہنے لگے ہاں بھئی، لکھتے پڑھتے وقت میں ہلکی میوزک یا غزلیں سننے کا عادی ہوں۔ اس سے تکان نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ میوزک آپ کے مطالعے یا تحریر میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ کہنے لگے بالکل نہیں۔ یہ پرانی عادت ہے۔

ایک مرتبہ پھر ۱۹۹۷ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سمینار میں ملاقات ہوئی۔ اس مرتبہ وہ شاہجہانپور سے دہلی تشریف لائے تھے۔ ایک اجلاس میں ان کی صدارت اور میری نظامت تھی۔ اجلاس کے اختتام کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا 'آپ نے نظامت اچھی کی، الفاظ کی ادائیگی بھی ٹھیک تھی مگر ایک لفظ کا تلفظ وہ نہیں ہے جو آپ نے ادا کیا۔ بھائی صحتِ تلفظ کا بھی خیال رکھیے'۔

جولائی ۱۹۹۸ء میں رضا لائبریری رامپور کے سمینار میں بھرپور ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں یہ طے پایا کہ ہر ماہ ایک نشست بریلی میں رکھی جائے اور خاں صاحب اس میں بطورِ خاص شریک ہوں۔ چناں چہ وہ میری دعوت پر ۸/نومبر ۱۹۹۸ء کو بریلی تشریف لائے اور میرے غریب خانے پر دن گزار کر شام کو شاہجہانپور واپس ہوگئے۔ اس موقع پر وہ میرے لیے اپنی تین تصانیف بھی لائے تھے۔ میں نے ان کی دہنی ضیافت کے علاوہ ذہنی ضیافت کے لیے مقامی ادیبوں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، ڈاکٹر مصطفیٰ حسین نظامی، محمد عرفان، سیّد آفتاب علی، قنبر سعید اور چند اردو دوستوں ڈاکٹر اطہر جمال، فاروق احمد وغیرہ کو مدعو کیا تھا۔ بہت اچھی اور کامیاب نشست رہی۔ تقریباً دو گھنٹے کی اس نشست میں املا، تلفظ اور زبان کے بہت سے مسائل زیرِ گفتگو آئے۔ رشید صاحب کی گل افشانیِ گفتار دیکھنے کی تھی۔

دہنی ضیافت اور گل افشانیِ گفتار کا ذکر آیا تو ان کے دو خطوں کے یہ مختصر اقتباس بھی

ملاحظہ کیجیے:

''محض اطلاعاً یہ لکھ رہا ہوں کہ حنیف نقوی صاحب یہاں جو آئے تھے تو بدایوں سے پیڑوں کا ڈبا ساتھ لے کر آئے تھے۔ بریلی آنے کی ایک شرط یہ ضرور ہوگی کہ پہلی بار (صرف پہلی بار) یہی ڈبا ملنا چاہیے۔ یہ محض اس لیے کہ شگونِ آغاز اچھا ہو۔ آپ بریلوی ہونے کے ناتے اصرار کریں گے تو اس پر اعلیٰ حضرت کی فاتحہ بھی ہو جائے گی۔ مقصد یہ ہے کہ آپ خوش رہیں''۔ (خط مکتوبہ ۲۸/اکتوبر ۱۹۹۸ء)

''انڈا، مکھن، گوشت؛ بس ان سے پرہیز ہے اور کچھ نہیں''۔

(خط مکتوبہ ۲/نومبر ۱۹۹۸ء)

اُن سے جب سے تعلق قائم ہوا تب سے انھوں نے اپنی ہر نئی کتاب دستخط کر کے مجھے ضرور بھیجی اور میری حقیر رائے جاننے کے بھی خواہش مند رہے۔ میں نے ان کی دو کتابوں 'مثنویاتِ شوق' اور 'زٹل نامہ' پر تبصرے لکھے جو بالترتیب 'ہماری زبان' دہلی (اگست سے اکتوبر ۱۹۹۸ء کے درمیان) اور 'شاعر' بمبئی (نومبر ۲۰۰۴ء) میں شائع ہوئے۔ اول الذکر تبصرے کو انھوں نے پسند فرمایا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ لیکن دوسرے تبصرے کو پڑھ کر وہ کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے اور کچھ دن فون پر 'ہاں ٹھیک ہوں' تک گفتگو محدود رہی۔ پھر وہ گفتگو بھی بند ہو گئی۔ اس تبصرے میں میرے درج کردہ تسامحات ان کی رنجیدگی کا باعث نہیں تھے بلکہ رنجیدگی کا باعث میری وہ عبارت تھی جس میں میں نے لکھا تھا کہ رشید صاحب نے طویل بیماری کے سبب یہ کام عجلت میں کیا ہے اور ان کے دوسرے تدوینی کاموں سے یہ فروتر ہے۔ آخر آٹھ نو ماہ بعد ان کا فون آیا۔

شمس صاحب، میں رشید حسن خاں بول رہا ہوں۔ آپ تو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ سچ سچ بتایئے آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں؟ میں نے کہا قبلہ میں آپ سے ناراض ہونے کی جسارت کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ تو میرے بزرگ ہیں، محسن ہیں۔ کہنے لگے دیکھیے منافقانہ باتیں نہ کیجیے۔ سچ سچ بتایئے آپ اب فون کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا جانے بھی دیجیے۔

میری ان کی کوئی لڑائی ہے
اب چلا جاؤں اب صفائی ہے

کہنے لگے، خیر جانے دیا۔ لیکن رابطہ ضرور رکھیے۔ میرے دل میں آپ کی بڑی قدر ہے۔ دل کے معاملات تھوڑے بہت آپ بھی جانتے ہی ہوں گے؟ آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟

(۲)

رشید حسن خاں کی حیات، شخصیت اور تحقیقی وتنقیدی کام ہر طرح کے پیشہ ورانہ تصور سے خالی تھا۔ انھوں نے تحقیق کے جو پیمانے بنائے تھے، ان پر سود وزیاں سے بالاتر ہوکر تحقیقی کام نہایت تحمل اور صبر وضبط کے ساتھ کرتے رہے۔ انھوں نے جو کام بھی کیا ہے وہ ہماری تاریخ ادب کا زریں باب ہے۔ سطورِ ذیل میں ان کی حیات وخدمات کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

اضلاعِ روہیل کھنڈ میں شاہجہانپور، بریلی اور رام پور میں پٹھانوں کے خیل (گروہ) کثرت سے آباد ہوئے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں روہیلوں کے عروج اور ان کی ریاست کے قیام کے زمانے میں افغانستان اور صوبہ سرحد سے کافی تعداد میں پٹھان ان علاقوں میں وارد ہوئے اور یہیں بس گئے۔ رشید حسن خاں بھی بقول ان کے بیٹے خورشید حسن خاں نسباً یوسف زئی تھے اور اپنے طور وطریق میں مکمل پٹھان تھے۔ وہ پٹھانوں کی فطرت سے بخوبی آشنا تھے، جس کا ذکر بھی نہایت دل چسپی سے کرتے تھے۔ انھوں نے رضا لائبریری رامپور میں منعقد سمینار (۲۵ تا ۲۸ر جولائی ۱۹۹۸ء) بہ عنوان 'روہیل کھنڈ کی تاریخ ثقافت اور ادب' میں شاہجہانپور میں آباد پٹھانوں پر ایک مضمون پڑھا تھا جو بعد میں کسی رسالے میں شائع ہوا، اس کی اشاعت کے بعد شاہجہانپور ہی کے کسی خاں صاحب نے اس کا جواب 'کتاب نما' دہلی میں لکھا تھا۔ اس وقت یہ شمارے پیش نظر نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس مضمون میں خاں صاحب نے اپنے خاندان کے بارے میں بھی کچھ تفصیلات ضرور دی ہوں گی۔

خاں صاحب کے والد کا نام امیر حسن خاں تھا، جو محکمۂ پولیس میں داروغہ تھے۔ انگریزوں اور انگریزی تعلیم کو بُرا سمجھتے تھے۔ انھوں نے تحریک عدم تعاون کے زمانے میں نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

رشید حسن خاں کی تاریخِ پیدائش ازروئے تعلیمی اسناد ۱۰ر جنوری ۱۹۳۰ء لکھی جاتی رہی ہے۔ (رشید حسن خاں، اطہر فاروقی، دہلی ۲۰۰۲ء، ص ۹) جو غلط معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ **۱۹۳۹ء میں انھوں نے شاہجہانپور کی آرڈی ننس فیکٹری میں مزدور کی حیثیت سے ملازمت کا**

آغاز کیا تھا۔ ظاہر ہے ۹ سال کی عمر میں تو فیکٹری میں ان کو ملازم نہیں رکھا گیا ہوگا۔

خاں صاحب یکم اگست ۱۹۹۸ء کو بمبئی علاج کے لیے گئے تھے، اسی زمانے میں روزنامہ 'انقلاب' بمبئی کے لیے ڈاکٹر صاحب علی نے ان سے انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو (مطبوعہ ۱۳/۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۸ء) میں خاں صاحب کے تعارف میں ادارے کی طرف سے جو نوٹ دیا گیا تھا اس میں خاں صاحب کی تاریخِ پیدائش دسمبر ۱۹۲۵ء درج کی گئی تھی۔ اخبار کا تراشہ خاں صاحب نے خود مجھے بھیجا تھا اور اس میں کتابت کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کی تھی۔ اگر یہ تاریخ غلط ہوتی تو خاں صاحب یا تو اسے قلم زد کرتے یا اس سے مطلع کرتے۔ علاوہ ازیں 'شاعر' بمبئی کے ہمعصر اردو ادب نمبر جلد۱، ۹۸-۱۹۸۷ء میں خاں صاحب کا ایک مضمون شامل ہے۔ اس نمبر کے لیے افتخار امام صدیقی نے مضمون کے ساتھ ساتھ مضمون نگاروں سے ان کے سوانحی کوائف بھی طلب کیے تھے جو اُس نمبر میں سوانحی لغت کے تحت شامل کیے گئے۔ رشید حسن خاں اور بعض دوسرے قلم کاروں کے کوائف تاخیر سے موصول ہوئے، انھیں ضمیمہ کے طور پر اس سوانحی لغت میں شامل کیا گیا۔ خاں صاحب کے کوائف اس نمبر کے صفحہ ۱۱۹۴ پر درج ہیں جس میں تاریخِ پیدائش اس طور مرقوم ہے: پیدائش: ۱۰/جنوری ۱۹۳۰ء (اصلاً ۲۵/دسمبر ۱۹۲۵ء)۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ ان کی صحیح تاریخ پیدائش ۲۵/دسمبر ۱۹۲۵ء ہے۔ اس سالِ پیدائش سے ان کی ملازمت کے آغاز کا سنہ بھی درست قرار پاجاتا ہے۔ یعنی وہ بوقتِ ملازمت چودہ سال کے تھے۔

خاں صاحب کی تعلیم کو بھی باضابطہ نہیں کہا جاسکتا۔ اولاً ان کا داخلہ شاہجہانپور کے عربی مدرسے بحرالعلوم میں کرایا گیا تھا، لیکن وہ درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کرسکے اور معاشی حالات اچھے نہ ہونے کے سبب ملازمت پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے پرائیویٹ طور پر اردو عربی، فارسی کے امتحاناتِ پاس کیے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل اور الٰہ آباد بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کیا۔ وہ کثرتِ مطالعہ سے اپنے علم میں برابر اضافہ کرتے رہے۔ باضابطہ یونیورسٹی ایجوکیشن سے محروم رہے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ آرڈی ننس فیکٹری سے برطرف کردیے گئے۔ ملازمت سے برطرف کیے جانے کا سبب خاں صاحب کا مزدور یونین بنانے میں حصہ لینا اور اس یونین میں جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ قبول کرنا تھا۔ اس فیکٹری میں تیس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔

اُس وقت وہ شادی شدہ تھے۔ ۱۹۴۴ء میں ان کی شادی خاندان ہی کے ایک فرد

منظور علی خاں کی بیٹی نفیس بیگم سے ہوئی تھی، جن کے بطن سے ایک بیٹی پیدا ہو کر آٹھ نو ماہ بعد فوت ہو گئی تھی۔ بے روز گاری، اولاد کا پہلا غم، لیکن وہ ہمت نہیں ہارے۔ انھوں نے کچھ دن مدرسہ فیض عام شاہجہانپور میں عربی اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔ یہ ملازمت مدرسے کی فضا سے ذہنی و عملی مناسبت نہ ہونے کے سبب قائم نہ رہ سکی۔ کچھ مدت انگریزوں کو کھانے کی اشیا سپلائی کرنے کے لیے اشیائے خوردنی کی دکان کھولی، مگر اس میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر ترکِ وطن کیا۔ اہلیہ کو میکے بھیجا اور خود بریلی آ گئے اور ایک مقامی ہفتہ وار اخبار 'ندرت' کے دفتر میں ملازمت کر لی۔

ہفتہ وار 'ندرت' (بریلی) کے مالک و مدیر سیّد ابراہیم حسن رسؔا بریلوی (ف ۱۹۸۷ء) تلمیذ دلؔ شاہجہانپوری تھے، جنھوں نے ۱۹۴۸ء میں ہفتہ وار 'ندرت' کا اجرا کیا تھا۔ 'ندرت' کا دفتر رسؔا کے رہائشی مکان واقع محلہ شاہ آباد بریلی میں تھا۔ ملازمت کی نوعیت کا پتا نہیں چلا۔ بزرگ ادیب ڈاکٹر سیّد لطیف حسین ادیب (پ ۱۰/جون ۱۹۳۱ء) جو اُن دنوں شاہ آباد محلے میں رہتے تھے، نے بتایا کہ خاں صاحب کا قیام رسؔا کے رہائشی مکان ہی میں تھا۔ خاں صاحب کے ساتھ شاہجہانپور کے ایک اور شخص حباب ترمذی بھی کبھی کبھی نظر آتے تھے۔ مولوی رئیس الدین وکیل کی کوٹھی واقع محلہ شاہ آباد میں شہر کے متعدد شعرا مثلاً عبداللطیف راز (ف ۱۹۹۳ء)، انور چغتائی (ف ۲۰۰۵ء)، ابراہیم حسن رسا (ف ۱۹۸۷ء)، سیّد عابد حسین کلیم وغیرہ جمع ہوتے تھے۔ ان شعری نشستوں اور مشاعرہ نما بڑی ادبی محفلوں میں رشید حسن خاں بھی شرکت کرتے تھے۔ یہ ۱۹۵۰ء کے بعد یا قریب کا زمانہ رہا ہوگا۔ راقم الحروف نے رشید حسن خاں کے بیٹے جناب خورشید حسن خاں سے اس ملازمت کی تفصیل جاننی چاہی تو انھوں نے فون پر بتایا:

> ''میری والدہ بتاتی تھیں کہ یہ تمھاری ولادت (۱۶/اپریل ۱۹۵۳ء) سے پہلے کی بات ہے جب تمھارے والد بریلی میں ملازمت کرتے تھے۔ تقریباً ساڑھے تین سال وہ بریلی میں ملازم رہے، اس کے بعد شاہجہانپور آ گئے''۔

سیّد ابراہیم حسن رسؔا مدیر 'ندرت' کے بھائی سیّد عابد حسن کلیم (پ ۱۹۲۵ء) خان صاحب کے ہم عمر ہیں اور ابھی حیات ہیں، انھیں آنکھوں سے بہت کم سوجھتا ہے۔ ان سے خاں صاحب کی ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے دہے میں لگاتار خط و کتابت رہی۔ ۱۹۶۲ء

سے ۱۹٦۵ء کے درمیان کے بعض خطوط جو فوری طور پر وہ تلاش کر سکے، انھوں نے راقم الحروف کو عنایت کیے۔ ان کی تعداد گیارہ ہے۔ ان خطوط کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ دہلی میں ملازمت کے دوران بھی خاں صاحب کلیم صاحب سے ملنے کے لیے بریلی آتے تھے۔ یہ خطوط دوستانہ و مخلصانہ روابط پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کلیم صاحب نے خاں صاحبؒ کے بریلی میں قیام کے سلسلے میں بتایا:

''رشید حسن خاں میرے بھائی سیّد زاہد حسن کے ساتھ آرڈی نینس فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے۔ دونوں میں باہمی اتحاد و اُنس تھا۔ خاں صاحب عملاً بائیں بازو کے ٹریڈ یونینسٹ تھے، ملازمت سے برطرف ہو جانے کے بعد زاہد حسن کے ذریعے بریلی آکر روپوش ہو گئے، جہاں میرے اہلِ خانہ نے ان کی تقریباً ڈیڑھ دو برس کفالت کی۔ وہ اپنا وقت ہم اہلِ خانہ اور اہلِ محلّہ کی مصروفیتوں میں ہاتھ بٹا کر اور شریک ہو کر گزارتے۔ خاں صاحب محلے کی ایک آٹا چکی پر بھی بیٹھتے تھے اور اس کا حساب لکھ دیا کرتے تھے۔ محلے کے بچوں کو بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ یہ سارے کام وہ بغیر اجرت کرتے تھے۔ خاں صاحبؒ نے یہ وقت انتہائی تنگ دستی، تکلیف مگر استقلال اور خودداری کے ساتھ گزارا۔ ڈیڑھ دو برس بعد ان کی شاہجہانپور واپسی ہوئی۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی کوشش سے انھیں دہلی یونیورسٹی میں سروس مل گئی۔ اس کے بعد ان کے خوشگوار دن لوٹ آئے''۔

مذکورہ بالا روایتیں زبانی ہیں جن میں قیامِ بریلی کی نوعیت اور زمانۂ قیام کی مدت میں واضح اختلاف ہے۔ جب تک ان کی سند نہ ملے حتمی طور پر اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں یہ درست ہے کہ ۱۹۵۰ء کے آس پاس وہ بریلی میں قیام پذیر رہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے فون پر چکّی پر کام کرنے والی بات کی تصدیق کی اور بتایا کہ پاکستان میں دیے گئے کسی انٹرویو میں خاں صاحب نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کی ملازمت کے سلسلے میں ڈاکٹر قمر رئیس کی سعی و کوشش کی بھی تصدیق ہو گئی۔ خود ڈاکٹر قمر رئیس نے اس سلسلے کی تفصیل اپنے مضمون میں دی ہے جو 'اردو دنیا' دہلی کے 'گوشۂ رشید حسن خاں' میں شامل ہے۔

بریلی سے واپس شاہجہانپور آکر ایک مرتبہ پھر مدرسہ فیض عام میں مدرسی کے فرائض انجام دیے۔ کچھ مدت بعد اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول شاہجہانپور میں فارسی و عربی کے

استاد کی جگہ خالی ہوئی، اس جگہ پر خاں صاحب کا انتخاب کرلیا گیا۔ ۱۹۵۹ء کے وسط تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اگست ۱۹۵۹ء میں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر ان کا تقرر ہوا۔ یہ تقرر عارضی تھا۔ ۱۹۶۴ء میں اسے کل وقتی منظوری حاصل ہوگئی۔ تقریباً تیس سال دہلی میں ملازمت کرنے کے بعد ۳۱؍دسمبر ۱۹۸۹ء کو وہ اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک مدت تک وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکے کہ انھیں دہلی میں رہنا چاہیے یا واپس اپنے وطن لوٹ جانا چاہیے۔ آخر ۲؍فروری ۱۹۹۶ء کو وہ دہلی سے مستقل طور پر شاہجہانپور آگئے (مکتوب بنام راقم) اور لکھنے پڑھنے کے مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ چند سال پیشتر ان کو ذیابیطس کا مرض لاحق ہوگیا تھا جس کے زیر اثر انجائنا کا شکار ہوئے۔ ادبی کام اس حال میں بھی جاری رکھا۔ سمیناروں میں شرکت بند کردی تھی۔ متقاعد زندگی گزار رہے تھے۔ ۲۹؍مارچ ۲۰۰۳ء کو ان کی اہلیہ نے وفات پائی۔ اس صدمے کا انھوں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ بالآخر ۲۶؍فروری ۲۰۰۶ء کو ان کا بھی وقتِ موعود آپہنچا۔ پس ماندگان میں انھوں نے دو بیٹے خورشید حسن خاں و خالد حسن خاں اور ایک بیٹی نادرہ بیگم زوجہ مقصود حسن خاں یادگار چھوڑیں۔ خاں صاحب کے دونوں بیٹے اردو ٹیچر ہیں۔

خاں صاحب نے ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ۳۲ کتابیں تالیف کیں۔ ۱۳ کتابیں مکتبہ جامعہ دہلی کے لیے ترتیب دیں جن میں سے چند دستیاب نہیں ہوسکیں۔ مطبوعہ کتب کے اسما مع سنین و مقامِ اشاعت حسبِ ذیل ہیں:

باغ و بہار (دہلی ۱۹۶۴ء)، مقدمہ شعر و شاعری (دہلی ۱۹۶۹ء)، انتخاب نظیر اکبرآبادی (دہلی ۱۹۷۰ء)، انتخاب شبلی (دہلی ۱۹۷۱ء)، انتخاب مراثی انیس و دبیر (دہلی ۱۹۷۱ء)، دیوانِ خواجہ میر درد (دہلی ۱۹۷۱ء)، انتخاب سودا (دہلی ۱۹۷۲ء)، انتخاب ناسخ (دہلی ۱۹۷۲ء)، اردو املا (دہلی ۱۹۷۴ء، مختلف سنوں میں دو اڈیشن اور شائع ہوئے)، اردو کیسے لکھیں (دہلی ۱۹۷۵ء)، زبان اور قواعد (دہلی ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۳ء)، ادبی تحقیق: مسائل و تجزیہ (دہلی ۱۹۷۸ء، لکھنؤ سنہ نامعلوم، لاہور ۱۹۸۹ء)، تلاش و تعبیر (دہلی ۱۹۸۸ء)، فسانۂ عجائب (دہلی ۱۹۹۰ء، لاہور ۱۹۹۰ء، دہلی ۱۹۹۶ء)، باغ و بہار (دہلی ۱۹۹۲ء، لاہور ۱۹۹۲ء)، تفہیم (دہلی ۱۹۹۳ء)، انشاء

اور تلفظ (دہلی ۱۹۹۴ء)، عبارت کیسے لکھیں (دہلی ۱۹۹۴ء)، انشائے غالب (دہلی ۱۹۹۴ء، کراچی ۲۰۰۱ء)، مثنوی گلزارِ نسیم (دہلی ۱۹۹۵ء)، انتخاب کلام ناسخ (کراچی ۱۹۹۶ء)، مثنویاتِ شوق (دہلی ۱۹۹۸ء، کراچی ۱۹۹۸ء)، تدوین تحقیق، روایت (دہلی ۱۹۹۹ء)، املائے غالب (دہلی ۲۰۰۰ء)، مثنوی سحرالبیان (دہلی ۲۰۰۰ء)، مصطلحاتِ ٹھگی (دہلی ۲۰۰۲ء)، زٹل نامہ (دہلی ۲۰۰۳ء)، کلاسیکی ادب کی فرہنگ ج/۱ (دہلی ۲۰۰۳ء)۔

ان کا آخری تدوینی کام 'لفظیاتِ غالب' ہے جسے انھوں نے 'گنجینۂ معنی کا طلسم' نام دیا ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ تقریباً ۱۵۰۰ صفحات پر، غالبؔ کے اردو کلام میں مستعمل الفاظ کے نوعیتِ استعمال پر بحث کی گئی ہے۔ جلد اول جس کی کتابت ہوچکی ہے، جلد ہی انجمن ترقی اردو (ہند) شائع کرے گی۔

تین کتابیں 'غرائب اللغات'، 'امراؤ جان ادا' اور 'قصائد سودا' کی تدوین بھی ان کے پیش نظر تھی۔ اس سلسلے کا مواد وہ برابر اکٹھا کر رہے تھے لیکن ان پر کام کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔ اقبال اکیڈمی (لاہور) کے ایما پر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے اشتراک سے اقبال کے جملہ کلام کی تدوین کا پروگرام بھی زیرِ غور تھا۔ اس سلسلے میں اقبال کے مجموعۂ کلام 'زبورِ عجم' کا خطی نسخہ بقلم اقبال کا عکس بھی انھوں نے حاصل کرلیا تھا۔ بعض اور خطی اور مطبوعہ نسخے ان کو مطلوب تھے جن کے بارے میں رفیع الدین ہاشمی سے مستقل رابطہ تھا۔

خاں صاحب کے پسندیدہ موضوع ادبی تحقیق اور تدوین رہے ہیں۔ لیکن ادب میں ان کا اختصاص ادبی تحقیق اور تدوینِ متن کے ساتھ ساتھ املا، لغت، زبان و قواعد کے مسائل اور عروض بھی رہے ہیں۔ ان کی جملہ تصانیف ان موضوعات میں سے کسی نہ کسی کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔

خاں صاحب نے ہندو پاک کی مختلف جامعات میں اصولِ تحقیق و تدوین اور مشرقی شعریات پر تقریباً دو درجن لکچر دیے۔ املا پر متعدد ورکشاپ کنڈکٹ کیں۔ شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی اور شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی میں بہ حیثیت وزیٹنگ فیلو متعینہ مدت میں لکچر دیے۔

خاں صاحب کو ملک اور بیرونِ ملک کے تقریباً ایک درجن انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ مثلاً دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ، ۱۹۷۷ء، غالب ایوارڈ ۱۹۷۹ء، نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی) ۱۹۸۹ء، محمد طفیل ادبی ایوارڈ (لاہور) ۱۹۹۰ء، کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ

۱۹۹۱ء، ابوالکلام آزاد ایوارڈ ۱۹۹۷ء۔

ڈاکٹر خلیق انجم رشید حسن خاں صاحب کے بہت پرانے ساتھی تھے۔ خلیق انجم صاحب رشید حسن خاں صاحب سے تقریباً پچیس تیس سال قریب رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خاں صاحب دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ملازم تھے اور جب خاں صاحب ۱۹۹۶ء میں شاہجہانپور واپس چلے گئے تو ان دونوں کے تعلقات خطوط کے ذریعے بدستور قائم رہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کوشش کی کہ رشید حسن خاں صاحب کی 'باغ و بہار' اور اس کے بعد کی تمام کتابیں انجمن ہی سے شائع ہوں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن کی ادبی کمیٹی سے یہ بھی منظور کرالیا کہ خاں صاحب کی کسی بھی کتاب کے مسودے کو اشاعت کی منظوری حاصل کرنے کے لیے کمیٹی کے سامنے نہ رکھا جائے اور نہ ہی ان کی کتاب رائے کے لیے کسی ایکسپرٹ کو بھیجی جائے بلکہ مسودہ حاصل ہوتے ہی بغیر کسی تاخیر کے طباعت کے لیے دے دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ خاں صاحب کی ایک کتاب ابھی تیار بھی نہیں ہوتی تھی کہ ڈاکٹر خلیق انجم اس سے اگلی کتاب تجویز کر دیا کرتے تھے۔ چوں کہ رشید حسن خاں ڈاکٹر خلیق انجم کی ادبی اور انتظامی صلاحیتوں کے معترف تھے اس لیے ان کو انکار کرتے نہ بنتی۔ ڈاکٹر انجم نے انجمن کی ادبی کمیٹی سے یہی بڑا فیصلہ کرایا تھا کہ مسودہ وصول ہوتے ہی طباعت کے لیے بھیج دیا جائے۔ انجمن کی تاریخ کا یہ سب سے انوکھا فیصلہ تھا جو ہر لحاظ سے مفید مطلب ثابت ہوا۔

ایک مصنف کی کتاب اگر اشاعت سے محروم رہے یا اس کی اشاعت میں توقف یا التوا پیدا ہو جائے تو اس کے آئندہ کے تصنیفی منصوبے متاثر ہو جاتے ہیں۔ خاں صاحب اس معنی میں خوش نصیب مصنف تھے کہ ان کی ہر نئی کتاب تصنیف و تکمیل کے دوران ہی اشاعت کے مراحل طے کرنے لگتی تھی۔ خاں صاحب کو اشاعت کے مراحل سے بے نیاز کرنے اور ان کے خاص اختیار کردہ املا، توقیف نگاری، اعراب نگاری کو برقرار رکھنے کی انجمن نے جو مثال قائم کی اس کے لیے وہ تمام اردو برادری کے شکریے کی مستحق ہے۔

دو مصرعوں پر میں اپنی بات کو ختم کرتا ہوں:

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

⊙⊙⊙

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

'زٹل نامہ' کی ایک اور رویت

رشید حسن خاں ایک ممتاز محقق اور زبان شناس ہونے کے ساتھ ساتھ تدوینِ متن میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے ایک مرتبہ کسی مکتوب میں مجھے لکھا تھا کہ رشید حسن خاں تدوین و تصحیحِ متن کے دوران اپنے کام کو حرفِ آخر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے نزدیک کوشش تو فنِ تحقیق کی پہلی اور بنیادی منزل ہے۔ رشید حسن خاں نے جو متن اب تک متعارف کرائے اور شائع کیے ہیں ان میں تو وہ یقین اور حتم کے مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ زیرِ نظر تحریر میں خاں صاحب کے اسلوبِ تحقیق و تدوین کو زیرِ بحث لانا میرا مقصود نہیں۔ میں تو خاں صاحب کی تحقیقی بصیرت، لگن اور شبانہ روز محنت کا دل و جان سے قائل ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی ریاضت اور کنج کاوی میں ضرورت سے زیادہ خوداعتمادی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کے تحقیقی فیصلوں میں وہ توازن برقرار نہیں رہتا جو فنِ تحقیق و تدوین ان سے تقاضا کرتا ہے۔ بہرحال خاں صاحب کے تحقیقی اور تدوینی کارناموں کی عظمت اب دنیائے علم و ادب میں ہر طرف پھیل چکی ہے اور ان کے نیازمندوں اور معتقدین میں خود میں بھی شامل ہوں۔

رشید حسن خاں نے دنیائے تحقیق کو اب تک جو اہم متون دیے ہیں ان میں 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب'، 'گلزارِ نسیم' اور 'مثنویاتِ شوق' کے متون اہلِ تحقیق سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اس وقت ان کا مرتب کردہ 'زٹل نامہ' میرے سامنے ہے جو خاں صاحب کی اعلا تحقیقی صلاحیت اور زبان و ادب پر غیر معمولی دسترس کا شاہکار ہے۔ میں اس وقت جناب رشید حسن خاں کے ان تحقیقی اور تدوینی اصولوں پر بات نہیں کرنا چاہتا جو انھوں نے اس انتہائی مشکل اور ذمہ دارانہ کام کے سلسلے میں اپنائے ہیں، میں تو اس بات پر ان کا

شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی جرأت اور پامردی کی بدولت ایک پراگندہ، متنازع اور ادبی لحاظ سے بظاہر غیر اہم متن پوری متانت، سنجیدگی اور علمی دیانت کے ساتھ قارئین کو میسر ہوا ہے۔ 'زٹل نامہ' کا متن رشید حسن خاں کے مرتب کردہ دوسرے متون سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اسے خاں صاحب نے سخت محنت اور جاں کاہی کے باوجود نہ تو حرفِ آخر تسلیم کیا اور نہ ہی حرفِ آخر بنانے کی کوشش کی ہے۔ چناں چہ فرہنگوں اور دیگر ضروری اور غیر ضروری تفصیلات کی جو دنیا 'باغ و بہار'، 'گلزارِ نسیم' اور 'فسانۂ عجائب' سے وابستہ نظر آتی ہے، 'زٹل نامہ' اس سے کافی حد تک محروم ہے۔

جعفر زٹلی اردو زبان کے اولین معماروں میں تھے جنھوں نے اردو کے شعری اور نثری ادب کو اظہار و ابلاغ کے وہ سانچے دیے جن سے اس دور کا معاشرہ محروم تھا۔ وہ اردو میں مزاحمتی ادب کے بانی ہیں اور انھوں نے اس زمانے میں ملوکیت کے استعمار گرانہ رویّوں کے خلاف آواز اٹھائی جب لکھنے والوں کی اس کے تصوّر سے روح کانپتی تھی۔ انھوں نے سچ بولنے کو معیارِ تخلیق قرار دیا اور حرف و خیال کو سچ بولنے کی ترغیب دی۔ جعفر نے اپنا قلمی نام اس لیے زٹلی رکھا کہ وہ گپ باز اور یاوہ گو کہلا کر اپنے لیے بعض ایسی باتیں کہنے کا جواز پیدا کرنا چاہتے تھے جنھیں اس عہد کا اشرافی اور وضع دار معاشرہ ثقہ اور سنجیدہ شخصیات کے شایان نہیں سمجھتا تھا۔ رشید حسن خاں قابلِ تحسین و ستائش محقق ہیں جنھوں نے ایک مجذوب کی بڑ کو علمی اور ادبی وقار کے ساتھ ان قارئین کو منتقل کیا جو نجس اور ناپاک ہونے کے ڈر سے ایسے ادب کے قریب نہیں جا سکتے تھے۔

محمد جعفر زٹلی ۱۶ر محرم ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۲ر فروری ۱۷۱۳ء کو مغل بادشاہ فرخ سیر کے بارے میں ایک شعر کہنے پر جس میں اسے 'تسمہ کش' یعنی جلاّد کہا گیا تھا، موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جعفر کی وفات کے بعد عرصۂ دراز تک ان کا کلام محض ہنسنے ہنسانے اور تفننِ طبع کی غرض سے سینہ بہ سینہ سفر کرتا رہا اور اس کی نشر و اشاعت یا تحفظ کو سوقیانہ عمل سمجھ کر کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ رشید حسن حاں کی اطلاع کے مطابق جعفر زٹلی کے 'زٹل نامہ' کا سب سے قدیم قلمی نسخہ ۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۱ء یعنی ان کی وفات سے اسّی اکیاسی برس یعنی پون صدی بعد کا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ باقی تمام قلمی نسخے اس کے بعد ضبطِ تحریر میں آئے۔ رشید حسن خاں کے علم میں 'زٹل نامہ' کے دس قلمی نسخے ہیں جن میں سے آخری نسخہ ۱۲۸۰ھ کا کتابت شدہ ہے۔ خاں

صاحب کے مطابق ان دس قلمی نسخوں کی تفصیل یہ ہے:

۱- خطی نسخہ مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، سالِ کتابت ۱۲۰۶ھ (۹۲-۱۷۹۱ء)

۲- خطی نسخہ مخزونہ ذخیرہ شپرنگر، برلن، سالِ کتابت ۱۲۱۰ھ (۹۶-۱۷۹۵ء)

۳- خطی نسخہ مخزونہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، سالِ کتابت ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۷ء)

۴- نسخہ مخزونہ انڈیا آفس لائبریری لندن، سالِ کتابت ذیقعدہ ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۴ء)

۵- نسخہ مخزونہ انڈیا آفس لائبریری لندن، سالِ کتابت ۱۸۲۳ء

۶- نسخہ مخزونہ رضا لائبریری رام پور، کتابت بہ عہد نواب احمد علی خاں متوفی ۱۲۵۶ھ (۱۸۰۴ء)

۷- ایضاً ۲، ترقیمہ ندارد

۸- نسخہ مخزونہ کتاب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد، سالِ کتابت ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸ء)

۹- نسخہ جناب فیروز بخت (کناڈا) ناقص الآخر

۱۰- نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ، سالِ کتابت ۱۲۸۰ھ

'زٹل نامہ' کی تدوین کے دوران مرتب نے ان دس قلمی نسخوں کے علاوہ اس کتاب کے درج ذیل چار مطبوعہ نسخوں سے بھی استفادہ کیا ہے:

۱- مطبوعہ مطبع علوی علی بخش خاں (لکھنؤ) ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء)

۲- مطبوعہ مطبع حیدری بمبئی، سالِ طبع ۱۲۸۴ھ (۶۸-۱۸۶۷ء)

۳- مطبوعہ مطبع محمدی (دہلی) سالِ طبع ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء)

۴- مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد (علی گڑھ) سالِ طبع ۱۹۷۹ء

رشید حسن خاں نے ان تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا تعارف بہت تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ۱۸۵۵ء میں کلامِ جعفر کی پہلی اشاعت سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انیسویں صدی میں معاشرتی اور تہذیبی تصادم اور شکست و ریخت نے فارسی زبان کے جبر اور مجبوری سے جہاں اہلِ قلم کو خود مختاری اور بغاوت کا احساس کرایا وہاں نظیر اکبر آبادی کی طرح جعفر زٹلی کے کلام کو بھی ادبی قدر و قیمت کے مطابق پذیرائی حاصل ہوئی ورنہ اس سے پہلے نظیر اور جعفر دونوں کے کلام پر سوقیانہ اور خلافِ وضع شاعری کا ٹھپہ لگا ہوا تھا۔ رشید حسن خاں نے 'زٹل نامہ' کی آخری تدوین کو اطمینان بخش قرار نہیں دیا چناں چہ خاں صاحب، ڈاکٹر نعیم

احمد (مرحوم) کے کام پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے 'زٹل نامہ' کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم (ڈاکٹر نعیم احمد) کو تدوین کے طریقۂ کار سے کم واقفیت تھی اور ادبی تحقیق کے تقاضوں سے بڑی حد تک بے خبر تھے''۔

رشید حسن خاں کے مرتبہ 'زٹل نامہ' پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں، اسے کسی دوسری نشست پر موقوف کرتے ہوئے زیرِ نظر تحریر کے مقصد کی طرف آتا ہوں۔

میرے کتب خانے میں ایک قلمی نسخے کا عکس ہے۔ اصل نسخہ کسی زمانے میں اردو کے ممتاز محقق خلیل الرحمٰن داؤدی مرحوم کی ملکیت تھا جسے انھوں نے اسلام آباد میں کسی نجی کتب خانے کے مالک کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ اس مخطوطے پر داؤدی صاحب کے قلم سے لکھا ہے:

''لطائف مذاقیہ مع ظرائف جعفر زٹلی''۔

خلیل الرحمٰن داؤدی کی عادت تھی کہ وہ اپنے ہر ملکیتی مخطوطے کے آغاز میں اضافی اوراق شامل کر کے ان پر مخطوطے کے تفصیلی کوائف لکھا کرتے تھے۔ یہ مخطوطہ چوں کہ آغاز میں مصنف کے اعتبار سے ناشناختہ اور بے تاریخ تھا اس لیے اس پر داؤدی صاحب کی کوئی تحریر موجود نہیں۔ مخطوطے کے آغاز میں افیونیوں کے مزاحیہ لطیفے ہیں جن کی اردو نثر زبان اور اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے فورٹ ولیم کے زمانے لیکن اس کے باہر کی نثر کی یاد تازہ کرتی ہے۔ مخطوطے کا خط شکستہ مائل ہے اور انیسویں صدی کے آغاز سے تعلق رکھتا ہے۔ آغاز اس طرح ہے:

''یا فتاح
رب یسّر وتمم بالخیر
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
حمد وسپاس بے قیاس بے نہایت وثنائے بے غایت اس جناب......
الوہیت کو کہ جس کا ظہور پُر نور ہر جا جلوہ گر ہے......''

یہ مخطوطہ کل تیرہ اوراق پر مشتمل ہے جن میں سے پہلے گیارہ اوراق پر افیونیوں کے مسجع اور مقفّیٰ نثر میں لطیفے ہیں۔ مخطوطے کے تمام اوراق آسیب دیدہ اور دیمک خوردہ تھے جس سے بعض الفاظ عکس برداری میں نہیں آسکے اور مشکل سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس مخطوطے کے

ورق ۱۲اور ۱۳ پر جعفر زٹلی سے منسوب نظم ونثر کے چار متون ہیں جن کے عنوان یہ ہیں:

۱- جوں نامہ ۲- تمسک بے تک میر جعفر زٹلی کا

۳- نظم از میر جعفر زٹلی: رباعی ۴- قطعہ/ رباعی

یہ چاروں متون 'زٹل نامہ' مرتبہ رشید حسن خاں میں موجود ہیں لیکن میرے پیش نظر مخطوطے اور رشید حسن خاں کے مرتبہ متون کی روایت میں کافی اختلاف ہے جس بنا پر میں زیرِ نظر مخطوطے میں شامل متون کو زٹل نامہ کی ایک اور روایت یعنی ایک مزید روایت کا نام دے رہا ہوں۔ ذیل میں ان چاروں متون کو مخطوطے کی روایت کے مطابق نقل کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی 'زٹل نامہ' مرتبہ رشید حسن خاں کے ساتھ مقابلہ کر کے ان کے اختلافات کی نشان دہی کی جاتی ہے:

۱- جوں نامہ

'زٹل نامہ' مرتبہ رشید حسن خاں میں یہ نظم صفحہ ۱۸۳ پر موجود ہے اور اس کا عنوان 'سپش نامہ' ہے۔ حاشیے میں صراحت کی گئی ہے کہ 'زٹل نامہ' کے کئی نسخوں میں اس کا عنوان 'جواں نامہ' بھی ہے، رشید حسن خاں کے ہاں یہ نظم ۱۱۶ اشعار پر مشتمل ہے جب کہ ہمارے مخطوطے میں اس کے اشعار کی تعداد صرف سات ہے اور متن درج ذیل ہے:

حضور جہاں شاہ گیتی پناہ ز بیداد جوانوں[۱] زٹل داد خواہ
جوئیں پڑ گئیں در قبا و ازار پھروں کھیلتا میں جونوں کے شکار[۲]
جوئیں[۳] مارتے مارتے شب گزشت ولے ایک جوں از میاں[۴] کم نہ گشت
ہزاروں[۵] جوئیں اور اکیلا منم دونوں ہاتھ سے تا کجا می زنم
بڑا پہلوان است افراسیاب مگر جنگ جوئں کی دارد نہ تاب[۶]
ز رستم ستیزد ہر اک جوں بزور ز برزد بر آرد فغاں جملہ شور[۷]
اگر جوں کا حملہ ہو بر ملک روم[۸]
تو بولے وہاں رات دن چغد و بوم

'زٹل نامہ' مرتبہ رشید حسن خاں سے متنی اختلاف:

۱- زٹل نامہ: جوآں، جعفر زٹلی نے پنجابی تلفظ استعمال کیا ہے

۲- زٹل نامہ: بنی آن مشکل بہ دہلی دیار

۳- زٹل نامہ: جوآں

۴- زٹل نامہ: ولے یک جوآں از میاں

۵- زٹل نامہ: کروڑوں جواں......

۶- زٹل نامہ: کہ از زور جوآں خورد پیچ و تاب

۷و۸- زٹل نامہ ندارد

۲- تمسک بے تک میر جعفر زٹلی کا[1]

منکہ شیخ بولا نہ دارم چکی نہ دارم چولھا، ساکن قصبہ او جاڑ نگر ضلع غیب پور ام۔ چوں کہ[2] مبلغ بے تعداد کہ نصف آں یک خرمہرہ نمی شود از لالہ گوبر گنیش[3] قرض گرفتہ در تحت تصرف خود آوردہ ام[4] لہٰذا اقرار[5] نمی کنم و نوشت نمی دہم کہ ثانی الحال سند نباشد بوعدہ ادائیگی روزِ قیامت قرض گرفتم فقط العبد اسمہ، موہوم و تمسکہ، مرقوم۔ فی التاریخ فلاں۔ احمق ولد بیوقوف و خبط الحواس ولد سراپا ہنگاس گواہ شد۔

اختلافِ متن:

۱- زٹل نامہ: عنوان محض 'تمسک' ہے

۲- زٹل نامہ: چوں

۳- زٹل نامہ: از لالہ تہمت رام بہ دھینگا مشتی و زد و کوب و جوتم جا تا و لاٹھم لاٹھا گرفتہ تحت تصرفِ خود

۴- آوردم

۵- زٹل نامہ: اقرار کے بعد پوری عبارت مختلف ہے جو یوں ہے: ''اقرار آں کہ تا قیامت ادا نہ سازم۔ ایں چند کلمہ بہ طریق ٹالم ٹالا نوشتہ دادہ شد کہ ثانی الحال سند نباشد و عندالحاجت بکا نیاید۔ تحریر فی التاریخ سنہ جلوسی غلط''۔

۳- نظم از میر جعفر زٹلی (رباعی)

جعفر امن برہِ کوئے تو لٹو شدہ ام — مرکب جان برہت تاختہ ٹٹو شدہ ام

ٹوک ٹاکم ز فراقت ہمہ کس می سازد — فارغ از ہر دو جہاں ہچو نکھٹو شدہ ام

یہ رباعی جسے وزن کے اعتبار سے قطعہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، رشید حسن خاں کے مرتبہ

'زٹل نامہ' میں موجود نہیں اور جعفر زٹلی کے غیر مطبوعہ اور غیر مدون کلام کا درجہ رکھتا ہے۔

۴۔ قطعہ/ رباعی

اے در نبرد حسن تو گشتہ پچھاڑ چشم　　زیر مژہ نہفتہ صد آہو بہ جھاڑ چشم
جعفر بکوے دوست اگر بھیڑ بھاڑ ہے　　تو بھی گھسڑ پُسڑ کے وہاں دے گھساڑ چشم

اس قطعے کا دوسرا شعر زٹل نامہ کے صفحہ ۳۱۱ پر موجود ہے لیکن دوسرے مصرعے میں 'وہاں دے' کی بجائے جلدی ہے جو ساقط الوزن معلوم ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں نے اس شعر کو جعفر زٹلی کے مشکوک کلام میں شمار کیا ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہ دونوں شعر جعفر کی کسی غزل نما نظم کے ہوں گے جس کا صرف ایک شعر رشید حسن خاں کو زٹل نامے کے تین مطبوعہ نسخوں میں متفقہ طور پر ملا ہے۔

جعفر زٹلی کے مندرجہ بالا دونوں قطعات ان لاتعداد اشعار کی طرح ہیں جو سینہ بہ سینہ سفر کر رہے ہیں اور انھیں ابھی تک تدوین نصیب نہیں ہوئی اس لیے کہ رشید حسن خاں نے کلامِ جعفر زٹلی کے جو خصائص بیان کیے ہیں ان پر تو ان سے منسوب یہ اشعار بھی پورے اترتے ہیں:

اگر ٹنڈاں نہ باشد با اریڑی　　نہ آید آب گر صد بار گیڑی
اگر دریاے میں پانی نہ ہووے　　نہ ہلّد با ہزاراں زور بیڑی
بود آں مرد زندہ در جہنم　　کہ دارد در نکاح عورت مریڑی

درحقیقت جس شخص کے کلام کا سراغ ہی اس کی وفات کے اکیاسی برس بعد ملا ہو اس کے اصلی اور جعلی یا الحاقی کلام کے بارے میں حتمی طور پر کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ رشید حسن خاں کے کام کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اخلاقی اقدار سے محروم ایک شخص کے فحش اور غیر مہذب کلام کو جدید فنِ تدوین کے مطابق مرتب کیا۔ اس محنت اور پامردی کی داد جس قدر دی جائے کم ہے۔

○○○

فضیل جعفری

کلاسکی ادب کی فرہنگ

ہم بلا خوف تردید یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ رشید حسن خاں نہ صرف اس دور کے سب سے بڑے متنی محقق ہیں بلکہ گزشتہ ادوار میں بھی کسی لسانی محقق نے اتنے بڑے پیمانے پر اور اس نوعیت کا کام نہیں کیا جیسا کہ رشید حسن خاں نے کیا ہے۔ ان کے پیش رووں میں صرف ایک بے حد اور نہایت ہی باوقار نام نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیبؔ جس پائے کے عالم اور لسانی محقق تھے اس کا صحیح اندازہ بھی ہم جیسے لوگ نہیں لگا سکتے۔

ادبی متون کی تدوین بجائے خود کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ کام سیکڑوں لوگ خاصی فراخ دلی سے کرتے رہے ہیں۔ خاں صاحب کا انفرادی کمال اور کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ادبی متون کے اصول وضوابط ہی مرتب نہیں کیے بلکہ اس فن کو باقاعدہ لسانی سائنس کا مرتبہ عطا کردیا۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں ثبوت وشواہد اور حوالوں کے ساتھ لکھتے ہیں۔ وہ کبھی بھولے سے بھی الفاظ، اصطلاحات اور متن کے مفہوم و معانی کی ممیز منطقی اور من مانی تشریح نہیں کرتے۔

انھوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے لیے بابائے اردو مولوی عبدالحق میموریل سیریز کے تحت فسانۂ عجائب، باغ و بہار، مثنوی گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوق اور مثنوی سحرالبیان جیسے جو کلاسکی متون مرتب کیے وہ ہمارے دعوے کا زندہ وتابندہ ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی معتمدی کے طویل دور میں جو قابلِ ذکر کام کیے ہیں ان میں رشید حسن خاں کی مرتب کردہ یہ کتابیں سرِفہرست ہیں۔ ان کی پچھلی کتاب 'مصطلحاتِ ٹھگی' کی نوعیت اور اہمیت قطعاً جداگانہ ہے۔ بظاہر تو اس کی بنیاد علی اکبر الہ آبادی کی اسی نام کی وہ کتاب ہے جو انھوں نے ٹھگی کے

پہلے بڑے ماہر اور محقق کرنل سلیمان کی فرمائش پر لکھی تھی اور جو ۱۸۳۹ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ خاں صاحب نے علی اکبراللہ آبادی کی تصنیف کو صرف مرتب کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انگریزی، فارسی اور اردو میں اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں دستیاب ہیں ان سب سے تحقیقی اور ادبی استفادہ کیا ہے۔ اس طرح 'مصطلحات ٹھگی' خاں صاحب کی تالیف نہیں، ان کی اپنی تصنیف کہلائے جانے کی مستحق ہے۔

اردو والوں کو بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ یہ بات بھی یاد نہیں رہ گئی تھی کہ کسی زمانے میں ٹھگی باقاعدہ ایک پیشہ ہوا کرتی تھی۔ اس پیشے کے باقاعدہ طور طریقے تھے۔ اس کی اپنی طے شدہ اور متعین رسومات تھیں۔ سبھی ٹھگ ان رسومات کی پابندی اس سختی کے ساتھ کرتے تھے جس سختی سے عام لوگ اپنی مذہبی رسومات کی پابندی کرتے تھے۔ مسافروں کو دھوکہ دے کر قتل کرنے اور پھر ان کا مال و اسباب لوٹ لینے والے ٹھگوں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ ٹھگی میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مذہبی رسومات کی یکساں اہمیت تھی۔

خاں صاحب جس متن کی بھی تدوین کرتے ہیں اس کے آخر میں بطور اصول، متن میں شامل تمام اہم، ذومعنی اور کثیر المعانی الفاظ و اصطلاحات کی مبسوط اور مفصل فرہنگ بھی رقم کر دیتے ہیں۔ فرہنگ کی ترتیب میں ان کا مجموعی طریق کار یہ ہے کہ پہلے وہ ایک لفظ (جو کسی متن میں آیا ہے) نقل کرتے ہیں، پھر زیر، زبر، پیش اور تشدید کی مدد سے اس کا صحیح تلفظ بتاتے ہیں اور آخر میں اس کے معنی کی مختلف جہات (Shades of Meaning) کا بیان کرتے ہیں۔ مرکبات کے سلسلے میں بھی ان کا طریق کار یہی ہوتا ہے۔

ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ہم لوگ جن میں طلبہ اور اساتذہ بھی شامل ہیں اپنے کلاسیکی ادب اور زبان سے قطعاً ناآشنا ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر زیر نظر کلاسیکل ادب کی فرہنگ میں ہمیں ایک عام فہم لفظ 'بھنور' بھی نظر آیا۔ یہ بالکل سامنے کا لفظ ہے جو روزمرہ تحریر و تقریر میں بہ کثرت استعمال ہوتا ہے۔ 'بھنور' اس حد تک عام لفظ ہے کہ پہلے تو ہمارے اساتذۂ کرام اس کے معنی بتانا ہی ضروری نہیں سمجھتے لیکن اگر کوئی طالب علم معنی پوچھ بھی لے تو اس کا زیادہ سے زیادہ جواب یہ ملے گا کہ بھنور پانی میں پڑنے والے چکّر کو کہتے ہیں۔ اب خاں صاحب کی تشریح ملاحظہ ہو: ''بھنور- دریا، یا ندی کے پانی کا وہ چکّر ہے جو تیز بہاؤ پر مخالف رو کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جتنی تیز رَو ہو گی اتنا ہی بھنور گہرا (بمعنی خطرناک) اور زوردار ہو گا جس میں ہلکی کشتی کے ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے''۔ اب اگر ہمارے اساتذہ طلبہ کے سامنے

بھنور کی ایسی تشریح کردیں تو یقیناً طلبہ کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور اساتذہ کی ساکھ میں بھی۔

'بھنور' میں اگر 'الف' کا اضافہ کردیں تو بھنورا بن جاتا ہے۔ خاں صاحب نے اپنے اصولِ تدوین کے تحت بھنورا کو اس لیے اپنی فرہنگ میں شامل نہیں کیا کہ یہ واقعی ایک بے حد عام فہم لفظ ہے۔ ہاں انھوں نے اس سے ملتے جلتے دوسرے لفظ 'بھنوری' سے ضرور بحث کی ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ بہت سارے 'اہلِ علم' کے نزدیک بھنورا اور بھنوری میں وہی تعلق ہے جو مکڑا اور مکڑی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ خاں صاحب نے لکھا ہے بھنوری کا بھنور یا بھنورا سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ''بھنوری: گھوڑے کی کھال کے بالوں کا چکّر (گرہ)'' ہے۔ ''بالوں کی جڑوں میں مختلف شکلوں کا ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض کو بہت منحوس سمجھا جاتا ہے۔ بھنوریاں آٹھ شکل کی ہوتی ہیں۔ بھنور کی شکل، سیپ کی شکل، گلاب کی کلی کی شکل، گائے کی زبان کی شکل، ہرن کے نافے کی شکل، کنکھجورے کی، مکڑیوں کی شکل، سانپ کی شکل''۔ صاحبِ فرہنگ نے مزید وضاحت کی غرض سے 'مثنوی سحرالبیان' کا یہ شعر بھی نقل کردیا ہے:

نہ ساپن نہ ناگن نہ بھنوری کا ڈر
ہر اک عیب سے وہ غرض بے خطر

اب قارئین خود یہ فیصلہ کرلیں کہ ان میں سے کتنے لوگ بھنوری کے معنوی جہات سے واقفیت رکھتے ہیں۔ عام آدمی تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ گائے کی زبان، ہرن کے نافے، گلاب کی کلی اور کھڑانو میں کسی طرح کی آپسی مشابہت بھی ہوسکتی ہے۔

خاں صاحب کی یہ تشریح اردو زبان کی معنوی کشادگی اور تلازماتی وسعت کا محض ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ اسی طرح کی دو ایک مثالیں اور ملاحظہ ہوں۔ اب سے چالیس پچاس سال پہلے تک شمالی ہند خصوصاً اتر پردیش میں لفظ 'اچھوانی' کا استعمال خاصا عام تھا۔ اُس وقت ہمارے نزدیک اچھوانی کوئی ایسی مقدس دوا تھی جو گھر کی بڑی بوڑھیاں زچہ کو پلاتی تھیں۔ رشید حسن خاں نے اپنی فرہنگ میں اچھوانی کا مطلب اور ماخذ ہی نہیں بتایا بلکہ 'فرہنگِ آصفیہ' کی مدد سے اس کے تیار کرنے کا پورا نسخہ بھی بیان کردیا ہے جو یوں ہے: ''اچھوانی، اصل میں اجوانی تھا۔ ایک قسم کا شیرہ ہے۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ اجوان (اجوائن) کے شیرے کو کھانڈ ملا کر کڑکڑاتے گھی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ جب وہ پک جاتا ہے تو سونٹھ ڈال کر زچّے کو پلاتے

ہیں۔ مگر اب مسلمانوں میں عناب کا شیرہ پکا کر اچھوانی بنانے لگے ہیں''۔ میر امّن نے 'باغ و بہار' میں اس لفظ کو یوں استعمال کیا ہے:

''ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دوجی سے پورے دنوں دردِ زہ میں مرتی ہے۔ اگر جنی تو سٹھورا، اچھوانی کہاں سے پلاؤں گی''۔

عرض خدمت یہ ہے کہ اب مسلمان گھروں کی خواتین نہ اچھوانی سے واقف ہیں اور نہ ہی عناب کے شیرے سے۔ سونٹھ کا استعمال بھی گھروں سے ختم ہو چکا ہے۔ اب زچگیاں گھروں میں نہیں اسپتالوں اور نرسنگ ہومز میں ہوتی ہیں اور سارا کاروبار انگریزی دواؤں کے دم خم پر ہوتا ہے۔

'پرتو' بھی ایک عام فہم لفظ ہے لیکن ہم اسے عموماً صرف عکس کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جب کہ پرتو کا مطلب روشنی بھی ہوتا ہے جھلک بھی ہوتا ہے اور اسے ڈھنگ، آثار اور انداز کا متبادل بھی سمجھا جاتا ہے:

پرتو پہ وہ یوں چلا لپک کے
انگارے پہ جیسے کبک لپکے

رحم، سراب، سرانجام، سرگشتہ، سرو چراغاں، سواد اور کوٹ جیسے ہزاروں ایسے مجرد اور مرکّب الفاظ اس فرہنگ میں ہیں جو کثیر المعانی ہونے کے باوجود فی زمانہ محض کسی ایک مفہوم تک سمٹ کر رہ گئے ہیں۔

رشید حسن خاں نے کلاسیکی ادب کی فرہنگ (پہلی جلد) میں جن متون سے استفادہ کیا ہے ان میں ان کی اپنی مرتّب کردہ کتابوں: فسانۂ عجائب، باغ و بہار، گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوق، سحر البیان، انتخاب سودا، انتخاب نظیر اکبرآبادی کے علاوہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی اہم تصانیف: نذیر احمد کہانی - کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، اور 'دہلی کی آخری شمع' بھی شامل ہیں۔ فرہنگ کی دوسری جلد میں جعفر زٹلی، آبرو، ناجی اور شاہ حاتم کے علاوہ سودا، میر، خواجہ میر درد، قائم چاند پوری، انشا، مصحفی، جرأت اور نظیر تک اور پھر غالب، مومن، ذوق، ناسخ اور آتش سے لے کر امیر مینائی، داغ، دہلوی، جلال لکھنوی، منیر شکوہ آبادی اور محسن کاکوروی تک شامل ہوں گے۔ میر انیس اور مرزا دبیر جیسے مرثیہ نگاروں سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

خاں صاحب کے پروگرام کے مطابق تیسری جلد نثری تصانیف کے لیے وقف ہوگی۔ اس میں قدیم داستانوں میں سے صرف 'طلسم ہوش ربا' کے تمام دفتر ہوں گے۔ علاوہ ازیں محمد بخش اور رتن ناتھ سرشار وغیرہ کی تصانیف بھی شامل ہوں گی۔ چوں کہ خاں صاحب کا

مقصد الفاظ کا محض گوشوارہ تیار کرنا نہیں ہے اس لیے ایسے تمام الفاظ جو بے حد عام فہم ہیں یا جو انقلاباتِ زمانہ کے نتیجے میں کسی معنوی اور تلازماتی تبدیلی اور تغیر سے دوچار نہیں ہوئے ہیں، فرہنگ میں شامل نہیں ہوں گے۔ ہماری درخواست ہے کہ محترم رشید حسن خاں ایک چوتھی جلد بھی تیار کریں جو دورِ جدید کے اہم اور بڑے شاعروں اور نثر نگاروں کی تصانیف پر مشتمل ہو۔ اس سلسلے میں ہمارے ذہن میں فراقؔ، جوشؔ، یگانہؔ، فانیؔ اور اصغر گونڈوی کے ساتھ پریم چند، بیدی، منٹو، عزیز احمد، عصمت اور قرۃ العین حیدر کے نام آرہے ہیں۔ یہ سب بھی اب کلاسیک کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں اور ان سب نے اردو کے شعری اور نثری ادب کو نئے الفاظ، نئی تراکیب، بالکل نئی تشبیہوں اور استعاروں سے متعارف کرایا ہے۔ مثال کے طور پر فراقؔ صاحب نے 'روپ' کی رباعیوں میں ایسے صدہا نئے الفاظ کو برتا ہے جن کا استعمال ان سے پہلے کسی بھی شاعر نے نہیں کیا تھا۔

رشید حسن خاں کی مرتب کردہ فرہنگ کی پہلی (زیرِ نظر) جلد اور آئندہ شائع ہونے والی جلدوں سے طلبہ اور اساتذہ کا تو بھلا ہوگا ہی اس سے کہیں زیادہ فائدہ موجودہ عہد کے فکشن نگاروں اور شاعروں کو پہنچے گا۔ ہم برسوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اردو افسانے اور اردو شاعری کا دائرۂ الفاظ روز بروز سکڑتا اور محدود ہوتا جارہا ہے۔ وارث علوی نے اپنی کتاب 'جدید افسانہ اور اس کے مسائل' میں متعدد نئے لکھنے والوں کے افسانوں سے اقتباسات نقل کر کے بجا طور پر یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ تمام افسانوں میں بیان کی ایسی یکسانیت پائی جاتی ہے کہ پتا ہی نہیں چل پاتا کہ کس افسانے کا خالق کون ہے۔ بالکل یہی حال جدید اردو نظم، خصوصاً اردو غزل کا ہے۔ آپ مختلف ادبی رسائل میں شائع ہونے والی سیکڑوں غزلوں کو پڑھتے چلے جائیں، آپ کو محسوس ہوگا گویا ایک ہی غزل پڑھ رہے ہوں۔ پوری اردو غزل اب چار، پانچ سو، سامنے کے الفاظ تک محدود ہوگئی ہے۔ کلاسیکی ادب کی تقلید یقیناً ایک بڑی چیز ہے لیکن کلاسیکی ادب سے عدم واقفیت اس سے کہیں زیادہ بُری بات بلکہ ادبی جرم ہے۔ کلاسیکی ادب میں بطور اصول ایسے الفاظ و تراکیب کا خزانہ موجود ہوتا ہے جس سے فائدہ اٹھانا ہر اہلِ قلم کا تخلیقی فرض ہے۔ غالبؔ سے لے کر فراقؔ و فیضؔ تک کے یہاں اظہارِ بیان ہی نہیں بسا اوقات خیالات کی بھی جو ندرت ملتی ہے وہ کلاسیکی ادب کے مطالعے کا ہی فیض ہے۔ یہی حال ن. م. راشد، میراجی، مجروحؔ، سردار جعفری اور اختر الایمان کا ہے۔

❖❖❖

'فسانۂ عجائب' مرتّبہٗ رشید حسن خاں

ٹیلی ویژن پر گفتگو

کاظم علی خاں: ڈاکٹر نیّر مسعود صاحب، اس وقت جس کتاب پر ہم گفتگو کر رہے ہیں وہ رشید حسن خاں صاحب کی کتاب 'فسانۂ عجائب' ہے جو ۱۹۹۰ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی سے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے، جو انجمن کے سکریٹری ہیں، شائع کی ہے۔ اس بات پر مجھے بہت فخر بھی ہے اور مسرت بھی ہے کہ اس کتاب کے بارے میں ایک ایسے شخص سے میں ہم کلام ہوں یعنی ڈاکٹر نیر مسعود صاحب آپ، کہ آپ نے رجب علی بیگ سرور کی لائف پر اور ان کے ورکس پر اور اُن کے ادبی کارناموں پر بہت ہی اچھی اور بہت ہی Meaning ful ریسرچ اور بہت ہی Relevent چیزیں آپ نے بہت عرصہ قبل جب ان پر زیادہ توجہ بھی نہیں دی جاتی تھی، اس وقت پیش کیں۔ اس اعتبار سے کہ یہ 'فسانۂ عجائب' سرور کا شاہکار ہے اور ۱۹۹۰ء میں متعدد ایڈیشنوں کے بعد اب یہ Latest ایڈیشن ہمارے سامنے آیا ہے تو آپ اس کتاب کو، اس ایڈیشن کو، اس کی تدوین کے کام کو جو رشید حسن خاں نے کیا ہے، اس کا Level آپ کی نظر میں کیا ہے۔ اس پر کچھ گفتگو نیر مسعود صاحب آپ فرمائیں تو ہم شکرگزار ہوں گے۔

نیر مسعود: کاظم علی خاں صاحب، متن کا جہاں تک تعلق ہے میرا خیال ہے ہم سب اس پر متفق ہیں کہ اردو نثر کی کوئی کتاب ابھی تک اتنے اہتمام کے ساتھ ایڈٹ نہیں کی گئی تھی، نظم کی حد تک تو دیوانِ غالب......

کاظم علی خاں: جی ہاں، نسخۂ عرشی ہے اور پروفیسر مسعود حسن صاحب کا دیوانِ فائز......

نیر مسعود: جی، لیکن اردو نثر کی کوئی کتاب اور وہ بھی 'فسانۂ عجائب' جو بہت ہی خطرناک اور

مشکل کتاب ہے، مشکل اس طرح کہ سرور نے اس کتاب کو ایک بار لکھا، اس کے بعد پھر کسی پبلشر نے فرمائش کی کہ صاحب ہمارے لیے لکھ دیجیے، پھر تیسرے نے کہا کہ ہمارے لیے ایک نسخہ تیار کر دیجیے، سرور نے وہ بدل دیا، بار بار انھوں نے تبدیلیاں کیں۔

کاظم علی خاں: جی۔

نیر مسعود: اب ان سب تبدیلیوں کا پتا لگانا اور سب سے بڑی پرابلم یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان میں سے کس صورت کو قبول کریں اور صحیح مانیں۔ اس کا رشید حسن خاں صاحب نے یہ طریقہ اختیار کیا جو صحیح ہے کہ جس ایڈیشن میں آخری بار تبدیلیاں کی گئی ہیں، افضل المطابع کا ۱۲۸۰ھ والا ایڈیشن، اس کو انھوں نے اساسی یا بنیادی نسخہ بنایا۔ اس نسخے کے متن کو صحیح پڑھنا اور کاتب سے صحیح لکھوانا، یہ خود بہت بڑا کام تھا۔ یہ کام تو ہو ہی گیا مگر یہاں پر رشید حسن خاں نے اپنا کام ختم نہیں کیا، بلکہ اب اس کتاب میں مقدمہ، اور سات تو ضمیمے ہیں ......

کاظم علی خاں: ہاں، ڈاکٹر صاحب اس مسئلے پر بھی بات ابھی، ابتدائی منزل میں ہو جائے۔

نیر مسعود: ہاں ہاں ضرور۔

کاظم علی خاں: اس کتاب میں ویسے دیباچہ تو ہے خلیق انجم صاحب کا، پھر مقدمہ ہے۔ مقدمہ سو صفحے سے زیادہ، ایک سو بارہ چودہ صفحے کا ہے۔ تو اس مقدمے میں انھوں نے جو متن انھوں نے Introduce کرایا ہے 'فسانۂ عجائب' کا، تو یہ مقدمہ اور کتاب کا جو متن ہے اس میں کوریلیشن شپ، کس حد تک ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے کی کیفیت ہے، یہ میں چاہوں گا کہ اس کے مقدمے کے بارے میں آپ ...... ویسے تو انھوں نے مختلف چیزیں، جو مختلف ایڈیشن اس کے ہیں اور جو کام انھوں نے کیا ہے ......

نیر مسعود: ...... ہاں، اب وہ لوازم جو ہیں اس کے، تو مقدمے میں پہلے تو یہی بتانا ہوتا ہے کہ کون سا متن ہم نے اختیار کیا اور کیوں۔ کتنی بار کتاب میں تبدیلیاں ہوئیں، اس کے اہم ایڈیشن کون کون سے ہیں۔ غرض مقدمے میں پوری طرح کتاب 'فسانۂ عجائب' سے ہم کو آپ کو واقف کرایا گیا ہے۔ دوسرا حصہ مقدمے کا، وہ بھی بہت اہم ہے۔ اس میں انھوں نے بڑی احتیاط اور توازن سے کام لیا ہے،

یعنی مصنف کے حالاتِ زندگی......

کاظم علی خاں: مگر مختصر ہیں، نیر مسعود صاحب......

نیر مسعود: ہاں، مختصر ہیں۔

کاظم علی خاں: بہت مختصر ہیں اس لیے کہ آپ نے بھی کام کیا ہے اور حضرات نے بھی۔ مگر یہاں بہت مختصر ہیں۔

نیر مسعود: جی ہاں وہی میں عرض کر رہا تھا کہ مرتّبِ متن کا یہ کام نہیں ہے۔ متن کے مرتّب کا کام یہ ہے کہ متن کو صحیح کر کے پیش کرے۔ لکھنے والا کب پیدا ہوا، کہاں مرا، یہ بتانا اس کا کام نہیں ہے۔ آپ نے میرا نام لیا تو میرا تو موضوع ہی 'رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے' تھا، اس لیے اسے میں نے تفصیل سے لکھا۔ اصولی بات یہ ہے کہ جب آپ کوئی متن مرتّب کر رہے ہوں اور انشاء اللہ آپ کریں گے تو اسے یاد رکھیے گا کہ مصنف کے حالاتِ زندگی صرف وہ لکھیں جن کا تعلق آپ کے متن سے ہو۔ مثال کے طور پر سرور کے حالاتِ زندگی میں ایک بہت اہم واقعہ ان کا کان پور...

کاظم علی خاں: ......کان پور کا جانا اور......

نیر مسعود: ......اور یہ کہ انھوں نے ایک قتل کیا اور اس کے بعد خود بھاگ کے گئے یا سزا میں......

کاظم علی خاں: یا کیا صورت ہوئی، جلاوطنی تھی یا......

نیر مسعود: ......اور غالباً اسی جرم میں اُن کے استاد بھی...... جیسا کہ رشید حسن خاں کا خیال ہے تو وہاں جا کر ان کا دل بہت گھبرا گیا اور ان کا دل بہلانے کے لیے حکیم اسد علی نے کہا کہ تم یہ لکھو کتاب 'فسانۂ عجائب' تو اس چیز کا، سرور کے حالاتِ زندگی کے اس حصے کا تعلق 'فسانۂ عجائب' سے بہت گہرا ہے، اس لیے اس پر رشید حسن خاں نے ذرا تفصیل سے بات کی۔ یہ انھوں نے بڑی صحیح اور اصولی......

کاظم علی خاں: اچھا، یہ 'فسانۂ عجائب' کا بنیادی متن، اس کے اوپر ابھی پروفیسر گیان چند جین صاحب کی کتاب اور وہ بہت اہم کتاب آئی ہے 'کھوج' اس میں پورا ایک مقالہ انھوں نے لکھا ہے اور رشید صاحب کا بھی ذکر تھوڑا بہت تو اس میں آ ہی گیا ہے کہ وہ کام کر رہے ہیں اور یہ بہت اچھا کام ہوگا، اس کے چھپنے سے پہلے

یہ مقالہ لکھا گیا تھا۔ اگرچہ 'کھوج' بھی ایسی کتاب ہے جس پر گفتگو آئندہ کبھی ہونا چاہیے......

نیر مسعود: جی ہاں ضرور۔

کاظم علی خاں: تو انھوں نے بنیادی متن پر گفتگو کی ہے اور ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب نے جو نسخہ پیش کیا ہے اور نورالحسن ہاشمی صاحب کے پاس جو......

نیر مسعود: جی ہاں، نسخہ فضل رسول......

کاظم علی خاں: تو اس میں کس حد تک یعنی رشید حسن خاں صاحب نے اس کے متن میں....

نیر مسعود: کام ہی نہیں لیا اس سے۔

کاظم علی خاں: کام نہیں لیا......

نیر مسعود: نہیں لیا اور بہت صحیح کیا۔

کاظم علی خاں: اور یہ صحیح کیا ہے کہ اس سے کام نہیں لیا ہے۔

نیر مسعود: جی ہاں، اس لیے کہ یہ جو بنیادی متن......

کاظم علی خاں: لیکن انھوں نے اصل جو انحصار کیا ہے، جس متن پر...... اس میں تو ایک سے زیادہ متن ہیں...... لیکن یہ کہ مکمل اور بڑے...... یعنی...... خلاصہ شدہ، تلخیص والے جو متن کہے جاتے ہیں ان پر انھوں نے توجہ نہیں دی۔

نیر مسعود: نہیں دی۔

کاظم علی خاں: اچھا، اب اصل اڈیٹنگ کا کام جو ہے اس کے بارے میں اگر ہم آپ سے یہ دریافت کریں کہ اڈیٹنگ کی جو کیفیت اس کتاب کی ہے، یعنی مثلاً یہ کہ کتابت کس انداز سے انھوں نے کرائی ہے، اگرچہ یہ بات اپنی جگہ پر مجھے یاد آ رہی ہے کہ ابھی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے ایک تقریر اردو اکادمی میں کسی جلسے کے موقعے پر، شہنشاہ مرزا کے سلسلے میں داستانوں کے اوپر وہ گفتگو ہو رہی تھی، تو انھوں نے کہا کہ بھئی داستان میں یہ سب کام کرنا پنکچویشن مارکنگ، یہ ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ داستان کو......

نیر مسعود: وہ تو انھوں نے اس لیے کہا کہ داستان سنانے سننے والی چیز ہے جس کو......

کاظم علی خاں: Oral Tradition کہتے ہیں......

نیر مسعود: مگر یہ کتاب 'فسانۂ عجائب' تو لکھی گئی ہے۔ اگرچہ شروع میں اس کو سرور نے

بطور داستان بیان کیا لیکن فوراً بعد ہی وہ اس کو لکھنے کی فکر میں لگ گئے۔ تو اب بہت اہم کام اس کے Punctuation کا تھا۔ پرانی تحریروں میں ظاہر ہے کاما، فل اسٹاپ، پیراگراف......

کاظم علی خاں: ...... ہوتا نہیں تھا۔

نیر مسعود: یہ کچھ نہیں ہوتا تھا، تو رشید حسن خاں نے کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب رہے کہ یہ علاماتِ اوقاف جو ہیں، اس طرح لگائیں کہ متن تقریباً اپنی شرح آپ کرتا چلے یہ اس کا اصل معیار ہے اور اس کو انھوں نے ملحوظ بھی رکھا ہے۔ اب اس میں یہ ضرور ہوگا کہ کہیں آپ کو اختلاف بھی ہوگا کہ مثلاً آپ نے یوں لکھا ہے لیکن یہ کاما ہمارے نزدیک یہاں نہیں وہاں ہونا چاہیے تھا۔ وہ بہت ہی ......

کاظم علی خاں: جب فقرے میں تھوڑی بہت تبدیلی ......

نیر مسعود: اچھا اب ...... تو یہ کام تو ظاہر ہے بہت محنت کا ہے جس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس نے کام کیا ہے۔ ہمارے سامنے تو ایک کتاب رکھی ہوئی ہے کاما فل اسٹاپ کے ساتھ۔

کاظم علی خاں: جی ہاں۔

نیر مسعود: اس کے بعد گویا اصل کام ......

کاظم علی خاں: تعلیقات وحواشی ......

نیر مسعود: یوں سمجھیے کہ اصل کام ختم ہونے کے بعد اصل کام شروع ہوتا ہے کہ جب یہ کام ختم ہوگیا تو اب اس میں کتنے لفظ ہیں جن کے معنی واضح نہیں ہیں، کتنے لفظ ہیں جن کے معنی بدل گئے ہیں۔

کاظم علی خاں: بہت کوشش کی ہے انھوں نے۔

نیر مسعود: اور اس کوشش کا تو آپ کو بھی تجربہ ہوگا، مجھ کو بھی ہے ......

کاظم علی خاں: بہت بہت ......

نیر مسعود: اس لیے کہ انھوں نے اپنے تقریباً ہر جاننے والے کو کتنے کتنے خط لکھے ہیں......

کاظم علی خاں: بہت خط لکھے۔

نیر مسعود: ان معانی کے سلسلے میں انھوں نے مثلاً راجستھان کے مہاوتوں سے رابطہ قائم کیا۔

کاظم علی خاں: جی ہاں، ہاتھی ......

نیر مسعود: اس لیے کہ کتاب میں جلوس کے ہاتھیوں کا ذکر آ گیا ہے۔ شیش محل کی ڈومنیوں سے، جناب اور مفتی گنج کی بڑی بوڑھیوں سے، اینچیوں سے، جواریوں سے، غرض جن جن چیزوں سے متعلق الفاظ کتاب میں آئے ہیں جو لغات میں نہیں......

کاظم علی خاں: شطرنج اور مختلف کھیلوں اور بازیوں کے متعلق انھوں نے صباح الدین عمر صاحب سے جن کے نام یہ کتاب معنون ہے...... یہ تو ہے۔

نیر مسعود: یہ تو ایک تشریح الفاظ والا ضمیمہ ہو گیا۔

کاظم علی خاں: اس میں تو سات ضمیمے ہیں اور ان ضمیموں میں مختلف......

نیر مسعود: اچھا، اب اس میں مختلف لوگوں کے نام آئے ہیں، جگہوں کے نام آئے ہیں، مثلاً ''اندراس میں عطر کا حوض چھلکتا رہا'' تو اندراس کیا ہے، اس کا انھوں نے پتا لگایا کہ نصیرالدین حیدر کے زمانے کی عمارت تھی، اب ہے کہ نہیں ہے، مثلاً وہ غدر میں ختم ہو گئی۔ پھر تلفظ اور املا والا ضمیمہ جو ہے۔

کاظم علی خاں: وہ بھی بہت عمدہ ہے۔

نیر مسعود: یہ ان کا خاص میدان ہے، رشید حسن خاں کا، تو اس میں بھی حیرت خیز محنت کی گئی ہے۔

کاظم علی خاں: اچھا اشعار، بہ کثرت اشعار اس میں، کتاب کے متن میں سرور نے کھپا دیے ہیں۔ تو ان اشعار پر بھی انھوں نے کافی تحقیق کی ہے، مختلف دواوین اور کلیات کھنگالے ہیں، اصل دیوان دیکھے ہیں۔ یا کہیں کہیں حسرت موہانی کے انتخاب سے بھی، مجھے خیال ہے کہ انھوں نے کام لیا ہے۔

نیر مسعود: اس میں بھی......

کاظم علی خاں: شعر میں بھی بعض جگہ سرور کے یہاں تسامح ہے۔

نیر مسعود: غلط مصرعے ہیں، جان کے بھی......

کاظم علی خاں: جان کر یا کسی بھی بنا پر، تو انھوں نے اس کی تصحیح کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

نیر مسعود: مثال کے طور پر کس کا شعر ہے، یہ سرور نے کہیں لکھا، کہیں نہیں لکھا اور کہیں غلط لکھ دیا۔ یہ سب تحقیق کر کے اس کا پتا لگانا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کا ہر ضمیمہ بھی قریب قریب ایک پی ایچ ڈی تھیسس کی اہمیت رکھتا ہے۔

کاظم علی خاں: جی بالکل۔

نیر مسعود: ضمیموں کے بعد اب فرہنگیں آتی ہیں۔

کاظم علی خاں: فرہنگیں بھی، ایک فرہنگ، دو فرہنگ ...... اچھا اس میں عربی کی بھی عبارات، مثلاً آیات ہیں اور فارسی کی، اس کی اطلاعات ہیں۔ تو یہ بھی حصہ اس کا کافی زبردست ہے۔

نیر مسعود: کون لفظ کہاں مذکر بولا جاتا ہے، کہاں مونث بولا جاتا ہے۔

کاظم علی خاں: جی ہاں، تذکیروتانیث کے بھی مباحث۔

نیر مسعود: لیکن کاظم علی خاں صاحب، ایک چیز کی مجھ کو بڑی کوفت بھی ہے اور بہت ہی ناگواری کی بات بھی ہے وہ......

کاظم علی خاں: جی۔

نیر مسعود: کہ اتنے اہتمام اور اتنی محنت سے یہ چیز لکھی گئی اور جو ایڈیٹنگ کی سب سے اہم چیزوں میں ہے وہ ہے مختلف نسخوں کے اختلاف کا درج کرنا......

کاظم علی خاں: جی ہاں۔

نیر مسعود: اختلافِ نسخ کا کام......

کاظم علی خاں: نہیں، کیا تو ہے۔

نیر مسعود: وہ صرف چودہ صفحے......

کاظم علی خاں: ہاں، مختصر ہے اور بڑی باریک کتابت ہے۔

نیر مسعود: لیکن وہ حصہ صرف بیان لکھنؤ کا ہے۔ چوں کہ کتاب کے صفحات زیادہ ہوئے جارہے تھے اس لیے اکہتر صفحے چھوڑ دیے گئے۔ پچاسی صفحے کی چیز کا ایک ٹکڑا چودہ صفحے کا، صرف اس بنا پر کہ کچھ صفحے زیادہ ہوئے جا رہے ہیں۔

کاظم علی خاں: ہاں یہ تو پبلشر کی Budgetry Problem تمام مجبوریاں ہیں۔

نیر مسعود: دوسری کمی اشاریے کی رہی کہ اشاریہ بھی ان کو محدود بنانا پڑا۔ پھر وہی صفحات...

کاظم علی خاں: جی ہاں۔

کاظم علی خاں: کتاب کے سلسلے میں میرا خیال ہے ہم لوگ یہ بھی بات کرتے چلیں کہ یہ 'فسانۂ عجائب' جو لکھنؤ کا کلاسیکی ادب، نثر کا ایک شاہکار ہے، اس کے ساتھ ساتھ رشید حسن خاں، میر امّن کی 'باغ و بہار' پر بھی کام کررہے ہیں اور یہ دو کتابیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ تو یہ بھی ایک کام کررہے ہیں وہ۔

نیر مسعود: جی ہاں۔ اچھا ایک چیز کاظم علی خاں صاحب، میں سوچتا ہوں کہ جب اس پر

بات ہو رہی ہے تو کہیں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا اصل کتاب کا پڑھ دیا جائے۔ اس سے ہمارے ناظرین کو اندازہ ہو کہ یہ کتاب کس قسم کی ہے۔

کاظم علی خاں: جی ہاں، ضرور۔

نیر مسعود: اور کوئی حصہ اُن کی فرہنگ وغیرہ کے دو تین لفظوں کا کہ کس طرح ......

کاظم علی خاں: جی ہاں، جی ہاں۔

نیر مسعود: تو یہاں سے لیا جائے:

''اب پانچ چار روز سے ہمارے طالع بیدار، جاگتے جاگتے دفعتاً سو گئے۔ ایک ساحر مکار، جھاکار، بہ زور سحر اُسے محل سے اٹھا لے گیا۔ داغ فرقت دے گیا۔ ہنوز یہ جملۂ غم ناتمام تھا کہ جانِ عالم کا کام تمام ہوا۔ آہِ سرد کھینچ کر بہ حال خستہ و پریشان، مثال قالبِ بے جان زمین پر گر کے بہ حسرت و یاس پکارا۔ شعر:

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
حیف ہے اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

اب یہ مشکل زبان ہے لیکن اتنی سہولت سے جو میں پڑھ رہا ہوں، اس کا خاص سبب یہ ہے کہ......

کاظم علی خاں: پنکچویشنس۔

نیر مسعود: ہاں ان کی وجہ سے پڑھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی، ورنہ اس روانی سے...

کاظم علی خاں: ہاں، اس روانی سے واقعی پڑھنا اس کتاب کا جو نہایت ......

نیر مسعود: اچھا اب یہ تلفظ اور املا کے سلسلے میں دریغ ہی کا لفظ موجود ہے۔ ''دریغ: فارسی لغات میں اسے بہ کسرِ اوّل و دوم 'دریغ' لکھا گیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے لیکن حرکات کی صراحت نہیں کی گئی، البتہ نوراللغات میں اسے فارسی کے مطابق 'بہ کسرِ اول و دوم' ہی لکھا گیا ہے ......''

اسی طرح فرہنگ میں جتنے بھی لوازم ہیں تقریباً سب جمع کر دیے ہیں۔

کاظم علی خاں: بڑی محنت کی ہے، بڑی محنت ہے۔

(لکھنؤ دور درشن سے ۷ر جون ۱۹۹۰ء کو نشر)

❖❖❖

ڈاکٹر خلیق انجم

تلاش و تعبیر

رشید حسن خاں صاحب اردو ادب میں محقق، نقاد اور تلفظ اور املا کے ماہر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اردو میں تحقیق و تنقید دو خانوں میں اس طرح تقسیم ہیں کہ تحقیق کا کام عام طور سے وہ حضرات کرتے ہیں جن کی مشرقی علوم پر نظر ہوتی ہے اور تنقید وہ حضرات کرتے ہیں جو انگریزی پڑھ سکتے ہیں اور اردو میں انگریزی کا ترجمہ کرسکتے ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب ان چند ادیبوں میں ہیں جو اعلا درجے کے محقق ہیں اور نقاد بھی۔ ان کی تنقید کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی فکر اور خیال انگریزی کا غلط سلط ترجمہ نہیں خود اپنی سوچ کا نتیجہ ہے۔

'تلاش و تعبیر' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کا پہلا مضمون 'دوہرا کردار' ہے۔ یہ دراصل ان ادیبوں کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے جو انتہائی معمولی قیمت پر ایک سمینار کی دعوت یا کسی کمیٹی کی رکنیت یا کسی انعام کے لالچ میں اپنا قلم، اپنا ذہن، اپنے خواب اور اپنی بصیرت کو بیچنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

خاں صاحب نے اس مقالے میں کئی اہم اور بنیادی باتیں کہی ہیں۔ انھوں نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ کیا ایک نقاد، محقق اور استاد کو وہی آزادی حاصل ہے جو تخلیقی فنکار کو ہوتی ہے۔ خاں صاحب نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر "تخلیقی فنکار کا دوہرا کردار ہو تو ادب یا سماج پر زیادہ برا اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ وہ ادب میں ان خیالات اور کردار کو پیش کرتا ہے جو اس کے اپنے آئیڈیل ہوتے ہیں جب کہ تنقید اور تحقیق میں ایسا نہیں ہوتا"۔

یہ مقالہ اتنا اہم ہے کہ میری تمنا ہے کہ محققین، نقاد اور استاد اسے ضرور پڑھیں اور اپنے گریبان میں جھانکیں۔ اس مقالے کا انگریزی اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہونا ضروری ہے۔

رشید صاحب کا دوسرا مقالہ 'محمد علی جوہر: ایک جذباتی رہنما' ہے۔ انھوں نے محمد علی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کھرے انسان تھے۔ سچائی، ایمانداری، سرفروشی، جاں نثاری اور اخلاص میں بے مثل تھے، ان کی ذات ہندوستانی سیاست اور مسلم قوم دونوں کے لیے باعثِ فخر اور قابلِ رشک ہے۔ لیکن وہ بنیادی طور پر قلندر تھے۔ پکے اور اچھے سیاست داں نہیں تھے۔ یہ بیان محمد علی کے بارے میں وہی شخص دے سکتا ہے جس کی اس عہد کی سیاست اور خود مولانا محمد علی کی زندگی پر گہری نظر ہو۔

رشید حسن خاں صاحب نے محمد علی جوہر کے حوالے سے ایک بہت اہم بات کہی ہے۔ یہ پچھلی دو صدیوں کی مسلم دانشوری اور سیاست کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ خاں صاحب نے یہ کہا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں مسلم سیاست میں جذباتیت نظر آنے لگی تھی۔ میں اس سلسلے میں صرف یہ گزارش کروں گا کہ مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی مسلم سیاست میں وہ جذباتیت پیدا ہوگئی جو پورے مسلم معاشرے کے لیے سخت نقصان دہ تھی۔ یہ جذباتیت تقریباً پچھلے ڈھائی سو سال پہلے شروع ہوگئی تھی اور آج تک بدستور قائم ہے۔

رشید حسن خاں صاحب کے مضمون کا اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اقتباس طویل ہے لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ خاں صاحب نے مولانا محمد علی کے بارے میں اس اقتباس میں جو کچھ کہا ہے وہ صرف محمد علی ہی نہیں، ہندوستان کی پوری مسلم سیاست کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

> ''ہندوستان کے مسلم معاشرے میں جذباتیت کا جو بے پناہ عمل دخل ہے، اس سے اہلِ نظر اچھی طرح واقف ہوں گے، خواہ اس کے مہلک اثرات کا اس قدر اندازہ نہ ہو جتنا ہونا چاہیے۔ ذرا سر اٹھا کر اور نظر جما کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس جذباتیت کا سلسلہ ان سیاسی حالات سے براہِ راست مل جاتا ہے جو بیسویں صدی کے آغاز سے نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ جذباتیت سے معمور اندازِ فکر اور اس کا پُر شور اظہار، یہ دو اہم اجزا تھے اس طویل سلسلے کے۔ تحریکِ خلافت اس کا سب سے پہلا اور سب

سے بڑا مظہر تھی اور محمد علی جوہر اس اندازِ فکر کے اپنے زمانے میں سب سے بڑے نمائندے تھے۔

جس حق گوئی و بے باکی کو آئینِ جواں مرداں کہا گیا ہے وہ مرحوم کی فطرت کا جز تھی اور طبیعت کا جوہر۔ انگریز دشمنی میں وہ اپنے حریفوں سے بہت آگے اور اپنے حلیفوں میں بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ قوم کے درد سے ان کا دل بھرا ہوا تھا اور وطن دوستی کے جذبے سے وہ ساری عمر سرشار رہے۔ گویا ایک مخلص، سچے اور کھرے انسان میں جو اعلا صفات ہونا چاہیے وہ سب ان کی شخصیت میں شامل تھیں، اس کے باوجود وہ کامیاب سیاسی رہنما نہیں بن سکے۔ ان کی سیاسی زندگی کے عروج کا زمانہ جدوجہد سے بھرا ہوا ہے، وہ ہر طرح کی قربانیاں دیتے رہے؛ لیکن اس زمانۂ عروج میں ان کی ساری جدوجہد سے فائدہ اٹھایا دوسروں نے۔ ان کا آخری زمانہ اُن کی سیاسی زندگی کے زوال کا زمانہ تھا، ایسا زوال جو بجائے خود عبرت اور نصیحت کی داستان ہے۔ اُس سیاسی استحصال اور اس دردناک زوال کی بیشتر ذمہ داری اُن کی اُس بے اماں اور بے کراں جذباتیت پر عائد ہوتی ہے جس نے ساری عمر اُن کو سکون اور سنجیدگی کے ساتھ سیاسی منصوبہ بندی سے باز رکھا۔ اس کا ایک اندوہناک پہلو یہ بھی ہے کہ مجموعی طور پر مسلم معاشرہ آج بھی اُن کی اُس امانت اور اس وراثت کو سینے سے لگائے ہوئے ہے''۔

رشید صاحب نے بعض شاعروں کی زبان پر مضامین لکھے ہیں یا یوں کہیے کہ ان کی زبان کی غلطیاں نکالی ہیں۔ اس سلسلے کے ان کے دو مضامین 'فیض کی شاعری کے چند پہلو' اور 'جوش کی شاعری میں لفظ و معنی کا تناسب' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور بہت سے ادبی رسالوں نے انھیں نقل کیا۔ ہماری نئی نسل کے شاعروں کے لیے ان دونوں مضامین کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ خاں صاحب کا ایک اور مضمون 'زبان و بیان کے بعض پہلو' بھی بہت اہم ہے۔ اس مضمون میں کئی شاعروں کے کلام کے حوالے دے کر زبان کی ان غلطیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو شاعر کی لاپرواہی کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔

خاں صاحب نقاد ہیں، لیکن تنقید ان کا پیشہ نہیں ہے۔ اس کتاب میں شامل ان کے

خالد عبادی

تلاش و تعبیر اور رشید حسن خاں

رشید حسن خاں کو پڑھتے ہوئے میں ہمیشہ ایک خوشگوار تجربہ سے دو چار ہوا۔ میں نے انہیں جب پہلی بار پڑھا تھا مسرت سے بصیرت تک کا سفر بہ یک وقت طے ہوگیا تھا۔ ان کو پڑھتے ہوئے اکثر خیال گزرتا کیا آدمی ہے، کس سلیقہ سے اپنی بات کہتا ہے، اظہار پر کتنی دسترس حاصل ہے، تیز طرار، روشن، آمادۂ حق اور اپنے قاری کو بے مزہ نہ کرنے والا تیور ان کی نثر بلکہ تنقید پارے کا خاصہ ہے۔ انہیں ہماری کلاسیکی روایات سے پوری آگاہی حاصل تھی۔ ان کا فن پارے کو دیکھنے کا اپنا ایک پیمانہ تھا۔ انہیں غلط صحیح، درست نادرست، جائز و ناجائز، روزمرہ، محاورہ اور فصاحت و بلاغت کا گہرا شعور حاصل تھا۔

''تلاش و تعبیر'' میں جوش اور فیض پر جو مضامین شامل ہیں معرکے کے ہیں۔ جوش کی گھن گرج اور فیض کی صبا خرامی بھی انہیں مرعوب نہیں کر پاتی۔ انہیں جہاں اس کا گلہ ہے کہ یہ شاعر یہ کیوں نہ کر سکے وہیں اس کا بھی دکھ ہے کہ وہ آخر تک یہی کیوں کرتے رہے۔ واقعی ادبی حلقہ، ادبی سماج، شعری برادری اور ہمارا تنقیدی ٹولہ اپنے شعر و ادب کی غربت، کس مپرسی اور ایجاد بندہ کے ناقص اور کم عیار طرفہ تماشوں سے کتنا بے بہرہ اور نا آگاہ ہے۔ یا انہوں نے اپنے شعر و ادب کے روشن اور زندہ مطالبات سے اس طرح قطع تعلق کر لیا ہے کہ ہم تک وہ بنیادی باتیں بھی نہیں پہنچ پاتیں جو ایک شاعر کی حیثیت کے تعین میں نہ صرف ہماری مدد کرتی ہیں بلکہ اس کی کمیوں اور کوتاہیوں کو بے نقاب بھی کرتی ہیں۔

کیا صرف قادر الکلامی کسی شاعر کو شاعر بنانے کے لئے کافی ہے، کیا صرف نئی نویلی ترکیبوں اور تازہ و نومرصع استعاروں سے شعر کی کایا بدل سکتے ہیں یا حقیقی منصب شعری سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں پوری تفصیل اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے رشید حسن خان کے

یہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

جوش کو کبھی شاعر رومان، تو کبھی شاعر احتجاج اور کبھی شاعر انقلاب کے القاب سے نوازا گیا۔لیکن یہ القاب نوازی کیا جوش کو پڑھنے میں ہماری مدد کر سکی اور کیا ان سے ہم جوش کے حقیقی شعری مرتبہ کو سمجھنے اور اس کی تہہ میں جانے کے لائق ہو سکے؟ ہم نے صرف جسم کی ظاہری سج دھج دیکھی حقیقی طور پر اس کے صحت مند یا غیر صحت مند اور باوصف اس کے میدان شاعری میں اس کی حقیقی نہج اور کارکردگی کا اندازہ لگانے میں ناکام رہے۔ رشید حسن خاں کی تنقید اپنے اندر یہ مادہ رکھتی ہے کہ شاعر چاہے کسی بھی پایہ کا ہو اس کو پڑھتے ہوئے ،اس پر کلام کرتے ہوئے ہم نہ مرعوب ہوتے ہیں نہ دھوکہ کھاتے ہیں۔ زبان و بیان اور صنائع و بدائع کے لحاظ سے اس نے کون سے گل کھلائے ہیں اور کون سے ہاتھ دکھائے ہیں ان سے نہ ہم لاپروا رہتے ہیں اور نہ ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے والے رشید حسن خاں اپنی تنقید میں اس عمل سے ایک لمحہ کے لئے بھی باز نہیں آتے۔ گویا کہ یہی ان کا منصب تنقید ہے۔ وہ ایک ایسے منصف ہیں جن کی عدالت میں ایک ایسا شخص آتا ہے جو مقام و مرتبہ کے معاملے میں ان سے بلند اور عزت وشہرت کے معاملے میں ان سے زیادہ خوش نصیب ہے۔۔ پھر بھی ان کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جس سے منصف کی حق پسندی پر ایمان لاتے ہی بنتی ہے۔

جوش کے بارے میں انھوں نے ''جوش کی شاعری میں لفظ و معنی کا تناسب'' کے عنوان سے ایک سیر حاصل مضمون قلمبند کیا ہے۔ ابتداء ہی میں جوش کی قادر الکلامی، تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت ، بے پناہ قوت تخیل اور لفظوں کی رنگا رنگ کثرت کی داد دیتے ہوئے فرماتے ہیں:'' ....یہ سب برحق مگر کلام تہہ داری سے خالی نظر آتا ہے اور تاثیر سے محروم۔ شاعری کو کم رتبہ بنانے کیلئے ان کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔'' اور اس کے بعد کیا پتے کی بات کہتے ہیں۔'' طبیب کے ہاتھ میں شفا نہ ہو تو اس کے علم کا حاصل کچھ نہیں''۔ گویا جوش کے آگے الفاظ اگرچہ ہاتھ باندھ کر کھڑے نظر آتے ہیں لیکن ان سے کام کیا لینا ہے اور ان میں سے کون کس کام کیلئے موزوں ہے، وہ اس سے بے خبر ہیں۔

جوش کے یہاں معنی کی سطح کیا رہتی ہے۔اس حوالے سے یہ اقتباس دیکھیں:'' میں جب ان کی ایسی (احتجاجی، انقلابی وغیرہ) نظموں کو پڑھتا ہوں جن میں ''امتِ شکستہ دل''

اور ''گروہِ شل'' کو مخاطب کیا گیا ہے، ان کو ''نامرد قوم'' کا خطاب بخشا گیا ہے اور یہ شکوہ کیا گیا ہے کہ ''ان بزدلوں کے حسن پہ شیدا کیا ہے کیوں'' یا ''لئیموں'' کو ''داغِ جگر'' بیچنے کی اطلاع دی گئی ہے تو مجھے یہ انقلابی یا احتجاجی شاعری معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پرانا تعلقے دار یا زمیندار اپنے نادہندہ کاشتکاروں کو یا بیگار میں پکڑے گئے مزدوروں کو ڈانٹ پھٹکار رہا ہے۔'' سوچئے ہمیں اب تک ڈانٹ پھٹکار کو شاعری سمجھ کر پڑھنا اور پڑھانا پڑتا ہے۔ اس ادبی کساد بازاری میں اگر ہم ایسے قاری ایسے اساتذہ سے محروم ہیں جو اپنے اندر اقبال کو پڑھانے کی سکت نہیں رکھتے تو اس میں کس کا قصور ہے۔ (اطلاعاً عرض ہے کہ بہار کی بعض یونیورسیٹیوں کے نصاب سے اقبال کو ہٹا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا موضوع اس لئے شامل کرلیا گیا ہے کہ اقبال کو پڑھانے والے دستیاب نہیں۔)

رشید حسن خان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا بے مزہ ہونے کے بجائے محظوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کی زبان میں جو سنجیدگی، بیان میں جو صفائی، لہجے میں جو کاٹ اور طرز ادا میں جو شگفتگی ہے وہ اس زمانے میں نایاب تو نہیں، ہاں کمیاب ضرور ہے۔ وارث علوی سے ان کے اسلوب کا موازنہ کیا جائے تو ایک فرق واضح طور پر محسوس ہوگا کہ وہ فن پارے کو صرف ایک جہت سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ جبکہ وارث علوی کے یہاں رنگارنگی اور تنوع ہے۔ لیکن نک سک کی وہ درستگی جو بیان کو جامع بناتی ہے اور حرف ولفظ کی وہ اداشناسی جو نثر کی تشکیل میں ہڑبونگ سے دور رکھتی ہے، وارث علوی کے یہاں ہار اور جیت کے نمایاں اور واضح فرق کی طرح موجود ہے۔

رشید حسن خاں کو پڑھتے ہوئے یہ بات البتہ ضرور محسوس ہوتی ہے کہ وہ شاعر کو کم و بیش وہی اظہار کی نارسائی، زبان و بیان کی ناہمواری اور مصنوعی جدت طرازی کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ ہم مومن، حالی، سیماب، فانی اور جوہر کا مطالعہ اس جہت سے کریں کہ اظہار کی خوبی، زبان و بیان کی ہمواری، لہجے کی پختگی اور صنائع و بدائع کے ہنرمندانہ استعمال کا اوسط ان کے یہاں کیا ہے اور انہوں نے اس تناظر میں شعر وادب کی کیا خدمت کی ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ جوش کے یہاں بھی بڑی حد تک یہ انداز گوارا۔ مگر فیض جس نے وافر انگریزی ادب کا مطالعہ کیا تھا اور انگریزی یا عالمی اصول نقد وشعر سے واقف تھا اسے محض زبان و بیان، روزمرہ ومحاورہ اور تشبیہ واستعارے کے حوالے سے دیکھنا کچھ معقول نہیں لگتا۔ لکھتے ہیں: ''لفظ بہت سا مفہوم ذرا سا۔ جوش صاحب نے ایسی لفاظی

کی بے شمار مثالیں اپنے مجموعوں میں محفوظ کردی ہیں ۔ فیض کے یہاں اس کی بدترین مثالیں ملتی ہیں ۔ ان کی شاعری کی عمر جس قدر بڑھتی جاتی ہے ، اسی قدر لفظی نمائش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔'' اس عبارت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جن بنیادوں اور جن شرطوں پر جوش کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے فیض جیسے جدید شاعر (صرف ترقی پسندی کے لیبل کو نہ دیکھیں) کے یہاں پہنچ کر بھی ان سے دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں ۔ میں انہیں میراجی یا راشد کی طرح کا جدید نہیں کہہ رہا ہوں لیکن یہ ایک سچائی ہے کہ وہ بھی اپنے ان دو ممتاز ہم عصروں کی طرح جدید شعری سروکار اور ہم عصر فکری وفنی لزومات سے واقفیت وآگہی رکھتے تھے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ن م راشد اور میراجی نے زبان و بیان کے معاملے میں وہ بے پروائی نہیں اختیار کی جس سے '' شاعری اور معائب میں لازم وملزوم والی بات پیدا ہوجائے'' ۔ اور جو بالآخر فیض کے قاری پر صدمۂ جانکاہ بن کر نازل ہو ۔ خاص طور پر جب رشید حسن خاں جیسا صاحب نظر ہم سے یہ کہہ رہا ہو : '' وہ (فیض) الفاظ کے انتخاب میں بہت غیر محتاط ہیں ۔ تشبیہوں اور استعاروں میں مناسب اور نامناسب پر ان کی نظر نہیں رہتی ۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے یہ کوئی تازہ وارد ہے جو زبان کے نکات سے ناآشنا اور بیان کے اسرار سے نامحرم ہے'' ۔ زبان کے نکات سے ناآشنائی اور بیان کے اسرار سے نامحرمی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ '' فیض نے اپنی شاعری میں انگریزی کے لفظی ترجموں کے بہت سے پیوند لگائے ہیں اور اکثر مقامات پر وہ بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں'' ۔ ان کے کلام میں صفت **منتقلہ** (Transferred Epithat) کی بہتات نے بھی ناہمواری پیدا کرنے میں اپنا مؤثر رول نبھایا ہے ۔

فانی ۔ شہید احساس ، سیماب کی غزلیہ شاعری ، جوہر کی شاعری ، مومن کی پیچیدہ بیانی اور دیوانِ حالی جیسے مضامین پڑھ کر مذکورہ شاعروں کے کمالات کے ہم نہ صرف معترف ہوتے ہیں بلکہ ان کی تحدیدات کا بھی ہمیں بخوبی علم ہوتا ہے ۔ فانی کے بیانِ غم کا تعلق زندگی سے اتنا نہیں جتنا ان کی افتادِ طبع (دروں بینی) اور مزاج (خود بینی) سے ہے ۔ سیماب کی غزلیہ شاعری کو آگرہ اسکول کی نمائندگی کے بارِ گراں نے سخت نقصان پہنچایا ۔ ان کی شاعری ان مفروضات کو برتنے میں غارت ہوئی جن کا فرض کرنا اچھی غزلیہ شاعری کیلئے قطعی ضروری نہ تھا ۔ اسی طرح جوہر کی شاعری کو یہ کہہ کر خراج تحسین پیش کرنا کہ '' اردو شاعری کو سیاسی اور قومی مسائل کی ترجمانی کا وسیلہ جن لوگوں نے بنایا ان میں محمد علی جوہر کا

نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ گویا شاعری کے دائرے کی توسیع تھی۔'' مومن کے یہاں پیچیدہ بیانی خود حاصل شعر بن جاتی ہے جبکہ اسے معنی آفرینی بہ الفاظ دیگر بصیرت آمیز تفہیم پر منتج ہونا چاہئے۔ جبکہ مومن کے شعر اپنے قاری کو تمام تر جدوجہد کے باوجود بیرنگ لوٹا دینے کے عادی ہیں۔ اسی طرح حالی کی جدید اور قدیم غزل میں جو فرق ہے اسے جس طرح انہوں نے نشان زد کیا ہے وہ اس لحاظ سے ہماری عبرت کیلئے کافی ہے کہ شاعری کو اصلاح قوم اور اصلاح معاشرہ کے اوزار کے طور پر استعمال کرنے کا انجام کتنا مایوسانہ اور ناخوشگوار ہوتا ہے۔

''تلاش و تعبیر'' میں کچھ دوسری نوعیت کے مضامین بھی ہیں۔ جن کا ذکر یہاں پر ضروری نہیں۔ البتہ ''زبان و بیان کے چند پہلو'' آنکھیں کھولنے والا مضمون ہے۔ زبان و بیان کی سطح پر ہمارے بعض نمائندہ شاعروں نے (جن میں بیش تر ترقی پسند ہیں) کیسے کیسے غچے کھائے ہیں اور کیسے کیسے گل کھلائے ہیں، وہ دیدنی ہے۔ سردار جعفری، فیض، ساحر اور سلیمان اریب کے یہاں فنی اور لسانی سطح پر جھول کا پایا جانا کچھ عجب نہیں، لیکن حیرت تب ہوتی ہے جب انہی کے شانہ بہ شانہ مجروح، جذبی، مخدوم، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی اور خورشید الاسلام بھی زبان حال سے ''ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح'' کی تصویر بنے نظر آتے ہیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں کے یہاں ایک لمحہ کیلئے بھی جانبداری، بے جا سختی، مظاہرۂ علمی یا دیگر سطحی باتوں کا احساس نہیں ہوتا۔ اعتدال ان کے یہاں بہر حال قائم رہتا ہے۔ ''......ادب میں خیالات کی رو بدلتی رہتی ہے۔ اس سے کون چشم پوشی کرسکتا ہے لیکن خیالات کے راستے کتنے ہی بدل جائیں اور زندگی کی الجھنیں خیالات میں کتنی ہی پیچیدگیاں پیدا کردیں ان کے اظہار میں بہر طور اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ وہ زبان و فن کے لوازم سے معرا نہ ہوں''۔

یاد رہے کہ اس سے پہلے وہ کہہ چکے ہیں: ''ہمارے نئے شاعروں کے پاس اچھے خیالات کی کمی نہیں۔ ان کی قوت تخئیل نئے راستوں پر پرواز کرتی رہتی ہے لیکن جب وہ ان خیالات کو پیش کرتے ہیں اس وقت عجز بیان آنکھیں دکھاتا ہے اور ان کے خیالات غلط پیرایۂ بیان یا غیر متناسب الفاظ کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ دیتے ہیں''۔

رشید حسن خان کے مضامین Ever green نوعیت کے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر

جوش، فیض یا دیگر شاعروں کا کچھ فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اتنا تو طے ہے کہ مذکورہ صورت احوال نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ فکر وفن کی سطح پر فراڈ کرنے کے بجائے ہمارے لئے یہ مناسب ہے کہ ہم فکر وفن کے درمیان اس نقطۂ اعتدال و اتصال تک پہنچنے کی کوشش کریں جو ہمارے شعری سرمایے کا خاصہ اور شعریت کی بنیاد ہے۔

☆☆☆

لے غالباً قادرالبیانی مراد ہے جس کا کرشمہ جوش کی شاعری ہے۔ قادرالکلامی تو جملہ شعری خصوصیات سے عبارت ہوتی ہے یہ محض الفاظ پر قدرت کا نام نہیں (جاوید رحمانی)

جاوید رحمانی

رشید حسن خاں اور اردو تنقید

رشید حسن خاں اردو محققین میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق محققین کے اس قبیلے سے تھا جس میں ان سے پہلے حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود جیسی معتبر شخصیتیں شامل تھیں۔ رشید حسن خاں اگرچہ کہیں کہیں تنقید کے کوچے سے بھی ہو کر گزرے ہیں اور یہاں بھی تحقیقی مزاج کے سبب ان کا انداز عام طور پر معروضی اور غیر جذباتی نظر آتا ہے۔ ان کے بعض تنقیدی مضامین کو بھی ان کے تحقیقی تبصروں کی طرح شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کا معرکے کا مضمون 'فیض کی شاعری کے چند پہلو' ہے جس کے بارے میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی لکھتے ہیں:

> ''شاید سنہ پچپن چھپّن کی بات ہے کہ 'قومی آواز' میں فیض احمد فیضؔ پر ایک مضمون شائع ہوا جس میں ان کی شاعری پر بہت سارے اعتراضات تھے، مثلاً فیضؔ کی مشہور نظم کے دو مصرعے ہیں:
>
> کیسے سفاک حسیناؤں کے برفاب سے جسم
> گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں
>
> اعتراض یہ تھا کہ برفاب تو خود برف کا پانی ہے، وہ کیسے پگھلے گا۔ یہاں برف ہونا چاہیے تھا۔ معترض کی بات تو صحیح تھی مگر میں نے سوچا کہ یہ کون شخص ہو سکتا ہے جس کا تصور گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھلنے والے حسیناؤں کے جسم کو چھوڑ کر برف اور برفاب کی لغت میں منجمد ہو جائے''۔

یہ مضمون جب لکھا گیا اس وقت فیضؔ شہرت کی بلندیوں پر تھے اور ان پر اس قسم کی گرفت

کوئی مرد قلندر ہی کر سکتا تھا۔ رشید حسن خاں جس طرح تحقیق میں حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود جیسی شخصیتوں کے معتقد تھے ویسے ہی وہ تنقید میں شبلی اور نیاز فتح پوری کے قائل تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کی نگارشات سے بعض اصولی مباحث کا علم بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے اور نیاز کی تحریروں سے زبان اور بیان کی بہت سی باریکیاں سامنے آتی ہیں''۔ (مشرقی شعریات اور نیاز فتح پوری، تفہیم، ص ۳۹)

اس اعتبار سے رشید حسن خاں کی تحریروں پر شبلی اور نیاز کا اثر صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی ادبی تنقید بھی بیشتر زبان و بیان کے محاسن یا اس کی کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری میں زبان و بیان کی نزاکتوں کا لحاظ بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن شاعری کی کل کائنات بھی یہی نہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر چہ نیاز فتحپوری جوش کے کلام میں زبان و بیان کی کوتاہیوں کی طرف مسلسل اشارہ کرتے رہے لیکن جوش ان تمام معائب کلام کے باوجود شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر رہے۔ رشید حسن خاں کو تحقیق اور تدوین کے میدان میں جو بلند مقام حاصل رہا اس کے مقابلے میں ان کی ادبی تنقید کا دائرہ بڑا سمٹا ہوا نظر آتا ہے۔

اس اعتبار سے رشید حسن خاں کی غیر معمولی شہرت میں ان کی ادبی تنقید کا کم از کم کوئی رول نہیں ہے اس لیے کہ ان کی تنقید ہم عصر ادبی صورتِ حال کا ساتھ دینے کی متحمل نہ ہو سکی اور بہت جلد اگلے وقتوں کی چیز معلوم ہونے لگی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں رشید احمد صدیقی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''بعض لوگوں کے کلام میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہوتی لیکن اس میں خرابی یہ ہوتی ہے کہ کوئی خوبی بھی نہیں ہوتی''۔

(غلطی عیب نہیں، شمس الرحمٰن فاروقی)

حسرت موہانی نے ذوق کو غالب اور مومن سے صحیح تر شاعر بتایا ہے لیکن اسی کے ساتھ غالب اور مومن کو ذوق پر فوقیت بھی دی ہے تو اسی لیے کہ غلطیاں تو ذوق کے یہاں بے شک مومن اور غالب سے کم ہیں لیکن ذوق کے ہاں خوبیاں بھی مومن اور غالب سے کم ہی ہیں۔ یہی معاملہ ناسخ اور آتش کا ہے۔ ناسخ اگر چہ آتش سے صحیح تر شاعر ہیں لیکن شاعرانہ حیثیت سے آتش کی ناسخ پر فضیلت کا اعتراف غالب کو بھی کرنا پڑا ہے۔ اور یہی وہ

نکتہ ہے جس سے رشید حسن خاں صرفِ نظر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ فیضؔ کے یہاں بے شک زبان و بیان کی کچھ غلطیاں ہیں جو کسی بڑے شاعر کے ہاں نہیں ہوتیں لیکن ان غلطیوں سے اس کی شاعرانہ حیثیت پر حرف نہیں آتا۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

"کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

برفاب آب برف کا مقلوب ہے اور برف کے پانی جیسے جسموں کا پگھلنا بے تکی بات ہے۔ برفاب کو برف کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ فیضؔ صاحب ہی نے کہا ہے:

جب خون جگر برفاب بنا
جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

یہاں برفاب صحیح طور پر استعمال میں آیا ہے"۔

(تلاش و تعبیر، ص ۸۵)

یہاں رشید حسن خاں نے فیضؔ کے جن دو شعروں کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے اُن کا بغور مطالعہ بتاتا ہے کہ پہلا شعر دوسرے سے بہتر ہے اگرچہ پہلے میں 'برفاب' کا استعمال غلط اور دوسرے میں صحیح ہے۔ اس کے باوجود پہلے شعر میں جو حرکی پیکر تراشا گیا ہے اس کی داد نہ دینا بدذوقی ہے جب کہ دوسرا شعر برف کی طرح ٹھنڈا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف غلطی کا نہ ہونا شعر کی عمدگی کا معیار نہیں ہوسکتا۔

فیضؔ کی ایک نظم ہے 'دعا'، جس کا پہلا بند ہے:

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں

رشید حسن خاں اس بند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اٹھان اچھی ہے" حالاں کہ کلیم عاجز نے اس بند میں بھی 'رسم دعا' کی ترکیب پر اعتراض کیا ہے کہ دعا رسم نہیں ہے۔ میں اس طریقۂ تنقید کو غیر مستحسن سمجھتا ہوں۔ شعری صداقت فلسفیانہ صداقت کی محتاج نہیں۔ سودا کا

شعر ہے:

دلیل ہے ترے شب بے نقاب پھرنے کی
چھپے ہے شرم سے جا آفتاب در تہِ آب

اب کوئی کہے کہ رات میں سورج کے چھپ جانے کی علت یہ نہیں اور چوں کہ آفتاب کسی اور وجہ سے چھپتا ہے اس لیے یہ شعر بے بنیاد ہے تو ذوقِ سلیم کو جو صدمہ پہنچے گا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ بہرحال رشید حسن خاں کو اس نظم کے دوسرے بند پر اعتراض ہے:

آیئے عرض گزاریں کہ نگار ہستی
زہر امروز میں شیرینیِ فردا بھردے
وہ جنھیں تاب گراں باریِ ایام نہیں
ان کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کردے

خاں صاحب لکھتے ہیں:

''زہر میں شیرینی بھر دینا، نہایت غیر مناسب اور ناقابلِ قبول پیرایۂ گفتار ہے۔ زہر میں شیرینی نہیں بھری جاتی، یہ مہمل بات ہے''۔

(تلاش وتعبیر، ص ۷۱)

یہ اعتراض بھی میرے نزدیک بے جان ہے۔ یہاں 'زہر امروز' تلخیِ حیات کا استعارہ ہے اور 'شیرینیِ فردا' سے مراد خوش آئند مستقبل کی امید ہے اور اس پیرایۂ گفتار میں کوئی قباحت نہیں۔ یہاں قصور فیضؔ کا کم اور رشید حسن خاں کے طریقۂ استدلال کا زیادہ ہے۔ میرے خیال میں مذاقِ سلیم کو استدلال کی ترازو میں تولنے کے بجائے محسوسات کی کسوٹی پر کسنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے:

''فیضؔ کے ڈکشن اور طرزِ اظہار کے مخصوص رویّے کو روایتی سیاق وسباق سے الگ نہ کر کے دیکھنے کے سبب رشید حسن خاں نے اپنے ایک مضمون (فیضؔ کی شاعری کے چند پہلو) میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ 'پیغام بجھ گئے ہیں، نام بجھ گئے ہیں، در و بام بجھ گئے ہیں، ان بے جوڑ ٹکڑوں کے ساتھ سب کچھ بجھ گیا ہے'۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ شاعری میں استعمال ہونے والے لفظوں کو اگر ان کے استعاراتی ابعاد سے الگ کر کے خالصتاً لغوی اور محاوراتی معنوں میں دیکھا جائے تو اسی نوع کے عبرت خیز نتائج

سامنے آتے ہیں''۔

(شاعری کی تنقید، ابوالکلام قاسمی، ص ۱۷۶)

فیض کا شعر ہے:

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمن دیں، راحت جاں ٹھہری ہے

اس کے بارے میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''اکرام بہ معنی تقویٰ آیا ہے، مگر اردو میں یہ لفظ بہ معنی بزرگی، عزت، توقیر، عطا، بخشش مستعمل ہے اور یہ کہنا کہ شیخ کی تعظیم میں یا شیخ کے اعزاز میں جو شے حرام تھی، کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا''۔

(تلاش وتعبیر، ص ۸۸)

اس شعر میں اکرام بمعنی تعظیم یا احترام ہی استعمال ہوا ہے اور یہ بالکل درست ہے۔ اصل میں رشید حسن خاں الفاظ کے لغوی اور محاوراتی پہلوؤں پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں اور اکثر شاعری کی تنقید میں نثر کی منطق سے کام لیتے ہیں اور مجموعی طور پر ان کی تنقید زبان و بیان کی خوبیوں اور خامیوں کا گوشوارہ مرتب کرنے سے عبارت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فیض کی شاعری کے تعلق سے کہیں کہیں ان کا رویہ معاندانہ سا نظر آتا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے مضمون 'زبان و بیان کے بعض پہلو' سے بھی ہوتا ہے جس میں وہ فیض کا یہ شعر بھی نقل کرتے ہیں:

آجاؤ میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آجاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال

اور لکھتے ہیں:

''غم کی چھال بجائے خود غلط نہیں، لیکن اس کے لیے آنکھوں کو درخت بنانا کہاں کی خوش مذاقی ہے''!

(تلاش وتعبیر: زبان و بیان کے بعض پہلو، ص ۲۷۱)

انھیں فیض کے 'آنکھوں سے غم کی چھال' چھیلنے پر تو سخت اعتراض ہے لیکن میر انیس کے اس شعر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''استعارہ جس خوبی سے صرف ہوا ہے وہ داد سے مستغنی ہے''۔

دہشت سے فوجِ شام کی بدلی سمٹ گئی
قدرت خدا کی، دن جو بڑھا رات گھٹ گئی

تعجب ہے کہ یہاں انھیں بدلی کا سمٹنا محل نظر نہیں معلوم ہوتا۔ بدلی کا چھٹنا محاورہ ہے، بدلی کا سمٹنا نہیں۔ جب ہم میر انیس کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ نیا محاورہ وضع کر سکیں تو دوسرے شاعروں سے بھی ہمیں یہ حق چھیننا نہیں چاہیے۔ رشید حسن خاں کے بیان کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ مذکورہ شعر میں تشبیہ ہے، استعارہ نہیں، لہٰذا استعارہ کی خوبی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس شعر میں تشبیہ ہے اور رعایت کا حسن بھی، لیکن استعارہ نہیں ہے۔ یہ شعر فیضؔ کا ہوتا تو اس کے خلافِ محاورہ ہونے کا اعلان ضرور کرتے۔ فیضؔ کا مشہور شعر ہے:

یہی کنار فلک کا سیہ تریں گوشہ
یہی ہے مطلع ماہ تمام کہتے ہیں

اول تو یہاں رشید حسن خاں سے دوسرا مصرع نقل کرنے میں سہو ہوا ہے۔ وہ دوسرے مصرعے میں 'یہی ہے' کی جگہ 'اسی کو' لکھ گئے اور پھر فرماتے ہیں:

"مقصود ہے فلک کا سیہ تریں گوشہ، مگر لکھا گیا کنار فلک کا سیہ تریں گوشہ، وہی لفظ پسندی کا ذوق فضول"۔

(تلاش و تعبیر: فیض کی شاعری کے چند پہلو، ص ۶۴)

مصرعِ ثانی میں 'مطلع' کا تقاضا ہے کہ مصرعِ اولیٰ میں 'کنار' بھی آئے۔ 'فلک کا سیہ تریں گوشہ' سے 'مطلع ماہ تمام' کا تصور پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ یعنی فلک کا گوشہ سے کنارے کی تخصیص نہیں، یہ تو کہیں بھی ہوسکتا ہے، فلک کے وسط میں بھی لیکن ماہ تمام طلوع فلک کے وسط سے نہیں ہوتا بلکہ 'مطلع' تو 'کنار' چاہتا ہے۔ کنار فلک کا سیہ تریں گوشہ کہنے سے ایک تو ماہِ تمام کے نکلنے کی جگہ واضح ہوجاتی ہے، دوسرے اجتماعِ ضدین کا لطف پیدا ہوتا ہے۔

اس سرسری جائزے سے ہمارا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ رشید حسن خاں کی ادبی تنقید بندش کی چستی، بیان کی قدرت، محاورے کی صحت، جوشِ بیان اور زورِ کلام کی چھان بین سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ ہمارے زمانے میں زبان و بیان کی ان نزاکتوں اور لطافتوں کی طرف رشید حسن خاں اور شمس الرحمٰن فاروقی نے خاص طور پر توجہ کی ہے، لیکن شمس الرحمٰن فاروقی کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان سے آگے بھی دیکھ سکتے ہیں اور دیکھتے ہیں جب کہ رشید حسن

خاں ان سے آگے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کی تنقید اردو شاعری کے سرمایے میں زبان و بیان کی نزاکتوں اور لغزشوں کی تحقیق سے عبارت ہے جو اردو شاعری میں علم بیان و بدیع کے اطلاقی نمونوں کی تلاش کرتی ہے اور اس طرح گویا یہ ثابت کرتی ہے کہ رشید حسن خاں بنیادی طور پر ایک نقاد نہیں، محقق ہیں، یقیناً ایک اعلا پائے کے محقق۔ ادب اور زبان کے طالب علموں کے لیے زبان و بیان کی باریکیوں کو سمجھنے کے نقطۂ نظر سے اس تنقید کا مطالعہ کسی قدر مفید بھی ہوسکتا ہے لیکن تحسینِ شعر یا نقدِ شعر میں یہ تنقید ہماری زیادہ رہ نمائی نہیں کرتی۔

□□□



جاوید رحمانی



ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف

مرتّبین کے بارے میں

جاوید رحمانی

جاوید رحمانی کی تاریخِ پیدائش ۸/مارچ ۱۹۷۸ء ہے اور آبائی وطن بابو سلیم پور (دربھنگہ)۔ گریجویشن تک تعلیم دربھنگہ میں ہی حاصل کی، اس کے بعد جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی سے ایم اے کیا اور ایم فل بھی۔ ایم فل کا مقالہ 'غالب تنقید' کے نام سے انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا اور اس کا دوسرا اڈیشن بھی ۲۰۰۷ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی سے ہی شائع ہوا۔ وہ ۲۰۰۵ء سے ۲۰۰۷ء تک انجمن ترقی اردو (ہند) سے ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ ابھی قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی سے پروجیکٹ اسسٹنٹ کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف

آفتاب اشرف یکم اگست ۱۹۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ آبائی وطن شاہ پور، پوپری (سیتامڑھی) ہے۔ وہ شعبۂ اردو ایم ایل ایس ایم کالج دربھنگہ میں لکچرر ہیں۔ ان کی پہلی کتاب 'رباعی کی آبرو: ناوک حمزہ پوری' تھی جو ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ اور شہر دربھنگہ اور صوبہ بہار کی کئی ادبی انجمنوں کے فعال رکن ہیں۔